میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے

عمیرہ احمد

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

عمیرہ احمد کی ۹ خوبصورت تحریروں کا مجموعہ...... میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے

میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے

عمیرہ احمد

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون:042-37352332-37232336

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

انتساب!

بہترین عورتوں میں سے ایک کے نام

میری امی شمیم اختر کے نام

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فہرست

- پیش لفظ 06
- 1- میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے 07
- 2- شہر ذات 39
- 3- کوئی لمحہ خواب نہیں ہوتا 85
- 4- کوئی بات ہے تیری بات میں 125
- 5- مٹھی بھر مٹی 142
- 6- تیری یاد خار گلاب ہے 160

◆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

پیش لفظ!

پاپولر فکشن لکھنے والے میرے جیسے رائٹرز کا ایک مسئلہ Recognition ہوتی ہے۔ ہمیں اور ہماری تحریروں کو شاید لاکھوں لوگ پڑھتے اور جانتے ہوں مگر ادبی حلقوں میں کبھی ہماری تحریروں پر بات نہیں کی جاتی۔ جیسے بڑوں کی محافل میں بچوں کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

ادب اور اس سے متعلقہ لوگوں نے ہمیں اپنی صفوں سے نکال کر ہمارے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دیں۔ اس نے ہمیں عام لوگوں کے قریب کر دیا۔ مجھے یہ کہنے دیجیے کہ عام آدمی آج مجھے اور میرے جیسے رائٹرز کی تحریروں کو پڑھتا ہے اور انہی کے کرداروں کے ساتھ خود Relate کرتا ہے۔ وہ ہماری تحریروں سے سیکھتا ہے وہ ہماری تحریروں سے بدلتا ہے اس کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی مسکراہٹ پاپولر فکشن لکھنے والوں کی مرہون منت ہوتی ہے اس کی آنکھوں سے چھلکنے والی نمی کا باعث بھی یہی تحریریں ہوتی ہیں۔

پاپولر فکشن لکھنے والے رائٹرز کی تحریریں بھی اتنی ہی معیاری اور غیر معیاری ہوتی ہیں جتنی مستند ادیبوں کی تخلیقات……

مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ پچھلے 20 سالوں میں پاپولر فکشن لکھنے والوں نے اپنی تحریروں میں جو ورائٹی اور نیا پن دیا ہے۔ وہ ''ادب'' تخلیق کرنے والوں نے نہیں دیا۔ مجھے یہ بھی کہنے دیں کہ قوموں کی تاریخ کے نازک اور مشکل مراحل میں اگر ادبی تخلیقات مشعل راہ ثابت ہوتی ہیں تو 21 ویں صدی کے پاکستان میں یہ کردار ''پاپولر فکشن لکھنے والوں'' کی ''تحریریں'' ادا کریں گی ''ادیبوں'' کی ''تخلیقات'' نہیں۔

آخر میں علم و عرفان پبلشرز کا شکریہ جن کی محنت اس کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔

عمیرہ احمد

umeraahmed@yahoo.com

……

میں نے خوابوں کا شجر دیکھا ہے

ایک آگ سی میرے وجود کو جلا رہی تھی۔ میں نے کار کا دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے اس بنگلے پر نظر دوڑائی۔ وہ میرے بنگلے سے بہت بڑا تھا۔ آگ بھڑکتی ہی جا رہی تھی۔ میں گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ کال بیل بجاتے ہوئے میں نے گھر کے مالک کا نام پڑھا۔ مجھے لگا، کسی نے مجھے دھکیل کر پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا ہو۔ شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔

چند لمحے بعد گیٹ کھول کر ایک چوکیدار باہر آیا۔ اس نے مجھ سے میرے آنے کا مقصد پوچھا تھا۔ میں نے اسے جواب دینے کے بجائے دروازہ دھکیل کر اندر چلی گئی۔ وہ میرے پیچھے آیا مگر مجھے روک نہیں سکا۔ سامنے وسیع و عریض پورچ میں ایک بچہ سائیکل چلا رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں اس کا چہرہ دیکھا۔ کسی نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا۔ چہرہ شناسا تھا آج زوال کا دن تھا۔ میں لپکتی ہوئی اس کے پاس گئی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ولید حمر۔" اس نے کچھ کنفیوز ہو کر جواب دیا کسی نے پھندے کو کس دیا تھا۔

"تمہاری امی کہاں ہیں؟" میں نے رکتی ہوئی سانس کے ساتھ پوچھا۔ اس نے ہاتھ سے میری پشت کی طرف اشارہ کیا۔ میں پیچھے مڑ گئی، ایک عورت لان سے میری طرف آ رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ چہرہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ سب کچھ شناسا سا تھا۔ کسی نے میرے پیروں کے نیچے سے تختہ نکال لیا۔ میں پھندے سے جھولنے لگی تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ اس نے دوبارہ مجھ پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ میرے پاس سے گزر کر اپنے بیٹے کے پاس گئی اور اسے لے کر اندر چلی گئی۔ میں بھاگتی ہوئی گیٹ سے باہر آ گئی۔ ڈرائیور نے مجھے دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے اندر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دنیا ختم ہو گئی تھی۔ سب کچھ تباہ ہو گیا تھا اور میں...... میں زندہ تھی۔

◆

میں نے عمر حسن کو اتنا چاہا ہے کہ شاید بھی کسی اور نے اسے نہیں چاہا ہوگا۔ اس کی ماں نے بھی نہیں۔ وہ میرے لئے میرے وجود کا دوسرا حصہ تھا اور حیرت کی بات یہ ہے میں کبھی بھی اسے یہ بات نہیں بتا سکی تھی۔ وہ میری خالہ کا بیٹا تھا اور میرے چچا کا بھی۔ اس سے میرا دوہرا رشتہ تھا۔ ہم دونوں کے گھر پاس پاس تھے اور گھروں میں آنا جانا بھی بہت تھا۔ میرے ابو بزنس مین تھے، اس کے ابو واپڈا میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ مالی لحاظ سے ہم ان سے بہت بہتر تھے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ہمارا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات بہت اچھے تھے، شاید وجہ وہ دوہرا رشتہ ہو جو ہمارے والدین کے درمیان تھا بہر حال جو بھی وجہ تھی۔

ہم دونوں خاندان بہت قریب تھے۔ ہمارے گھروں کی دیواریں آپس میں ملی ہوئی تھیں اور صحن میں دروازہ بھی تھا۔ جو ہر وقت کھلا رہتا۔

ہم اسی دروازے سے ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ میری ایک بہن اور دو بھائی تھے اور عمر کی تین بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ وہ یونیورسٹی میں اکنامکس میں ماسٹرز کر رہا تھا۔ مجھے اس سے محبت کب ہوئی، میں نہیں جانتی۔ شاید کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلتا کہ اسے محبت کب ہوتی ہے۔

ہاں مگر وہ مجھے بچپن سے اچھا لگتا تھا وہ کوئی زیادہ خوبصورت نہیں تھا مگر اتنی عام صورت کا بھی نہیں تھا، لیکن اگر خوبصورتی کی بات آئے اور میں یہ کہوں کہ میں اس سے زیادہ خوبصورت تھی تو یہ غلط نہیں ہوگا اور نہ ہی آپ اسے خوش فہمی سمجھیں۔ وہ بے حد سنجیدہ تھا دھیمے لہجے میں بات کرتا۔ اسے کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ بہت مہذب تھا اور پتا نہیں یہ سب باتیں کیوں میرے دل میں گھر کرتی گئیں۔ بچپن میں، میں ان کے گھر شاید اس کی بہنوں کے ساتھ کھیلنے جاتی ہوں گی مگر بڑے ہونے کے بعد میں صرف عمر حسن کے لئے جایا کرتی تھی۔ اسے دیکھے بغیر مجھے سکون ہی نہیں ملتا تھا۔ میں دن میں بار بار ان کے گھر جاتی اور وہ بھی اس وقت جب وہ گھر پر ہوتا پھر میں بہانے بہانے اس سے بات کرتی رہتی۔ اس کی پسند کے کھانے پکاتی اور بڑے اہتمام سے ان کے ہاں لے کر جاتی۔ تعلیم میں میری زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے میں بمشکل ایف اے ہی کر سکی تھی اور اس کے بعد میں نے کالج جانا چھوڑ دیا لیکن گھریلو امور میں، میں ماہر تھی، اگرچہ ہمارے گھر میں ملازم تھے لیکن پھر بھی میں کھانا خود پکاتی اور پکانے کے اسی شوق نے مجھے کھانا پکانے میں ماہر کر دیا تھا۔

عمر کی امی میری پسندیدگی کو جانتی تھیں اور صرف وہی نہیں، میری امی بھی اس بات سے واقف تھیں اور انہوں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ خالہ کئی بار اشاروں اشاروں میں کہتی رہتی تھیں کہ وہ مجھے بہو بنا کر اپنے گھر لائیں گی اور میں اپنے لئے ان کی محبت سے واقف تھی۔ وہ میری امی سے بھی اس رشتے کے بارے میں بات کر چکی تھیں اور امی کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن عمر سے میری شادی کوئی زیادہ جلدی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ گھر میں سب سے بڑا تھا اور اس سے چھوٹی تین بہنیں تھیں اور وہ تینوں جوان تھیں خالہ کا خیال تھا کہ وہ کم از کم دو بیٹیوں کی شادی کر کے پھر عمر کی شادی کریں گی۔

عمر بی اے کے بعد سے ماسٹرز کرنے کے ساتھ ساتھ سرجیکل کے آلات ایکسپورٹ کرنے کا چھوٹا موٹا بزنس شروع کئے ہوئے تھے اور وہ بہت مصروف رہتا تھا۔ خالہ سے شادی کے بارے میں اس کے خیالات کا اکثر پتا چلتا رہا تھا۔

”وہ کہتا ہے کہ جب تک کاروبار صحیح طرح سیٹ نہیں ہو جاتا، میں شادی نہیں کروں گا۔ خوامخواہ کی ذمہ داری اٹھانے اور بڑھانے کا مجھے کوئی شوق ہے نہ ہمت۔“

میں خالہ کے سامنے اس کی سوچ کی تعریف کرتی۔ لیکن اندر ہی اندر میری اداسی بڑھتی جاتی۔ پھر بھی ان دنوں میں بہت خوش رہا کرتی تھی۔ زندگی کا ہر رستہ کسی رکاوٹ کے بغیر تھا۔ عمر مجھ سے باتیں کر لیتا تھا بلکہ کافی باتیں کر لیتا تھا مگر وہ سب باتیں عام سی ہوتی تھیں مجھے اس کی نظروں، اس کی باتوں میں وہ جذبات دکھائی نہیں دیتے تھے جو میرے دل میں اس کے لئے تھے۔ وہ بڑی عام سی باتیں کرتا تھا۔

”کباب بہت اچھے بنائے ہیں، بناتی رہا کرو۔“

”آج چائے تم بناؤ کیونکہ چائے تم سے اچھی کوئی نہیں بناتا۔“

”ٹی وی ذرا کم دیکھا کرو۔ کوئی فائدہ نہیں ہے ان بے کار چیزوں کو دیکھنے کا۔“

''تم نے پلانٹس کو بہت اچھے طریقے سے رکھا ہے۔ پورے گھر کو خوبصورت بنا دیا ہے تم نے۔''

اس کی کوئی بات بھی ایسی نہیں ہوتی تھی جیسی بشریٰ رحمان اور رضیہ بٹ کے ناولوں کے ہیرو کی ہوتی تھی۔ نہ وہ فدا ہو جانے والی نظروں سے دیکھتا تھا، نہ وہ میرا آنچل پکڑ لیتا تھا، نہ وہ میرے لئے چھتوں پر آتا تھا، نہ وہ میرے بالوں میں پھول لگاتا تھا، نہ وہ میرے لئے پھولوں کے گجرے لاتا تھا، نہ وہ میرے حسن کے قصیدے پڑھتا تھا، نہ وہ میری کلائی پکڑ کر ہاتھ میں پہنی ہوئی چوڑیاں توڑتا تھا، نہ وہ میرے لباس کے رنگوں کی تعریف کرتا تھا۔ پھر بھی میرا دل تھا کہ روز بروز اس کے عشق میں ڈوبتا گیا تھا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا میں اسے سب کچھ کہہ دوں جو میرے دل میں اس کے لئے ہے۔ ہر دفعہ میں تہیہ کر کے اس کے گھر جاتی۔ اسے دیکھتے ہی سب کچھ بھول جاتی۔ وہ حال چال پوچھتا، کوئی نصیحت کرتا، کبھی کچھ کھانے کو دے دیتا اور میں بڑی خاموشی سے اس کی وہی پرانی باتیں سن کر واپس آ جاتی۔ گھر آ کر میں جھنجلاتی۔

''کیا اسے نظر نہیں آتا کہ میری آنکھوں میں اس کے لئے کیا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ میں اس کے گھر کس کے لئے جاتی ہوں؟ وہ آخر یہ سب کیوں نہیں سمجھ لیتا یہ سب پہیلی تو نہیں ہے پھر آخر وہ یہ سب کیوں کرتا ہے۔ اتنا بے خبر، اتنا انجان کیوں بنا ہوا ہے۔ کیا مرد اتنا بے وقوف ہوتا ہے، کیا اس کا دل نہیں ہوتا؟''

میں سوچتی اور کمرے کے چکر لگاتی رہتی۔ پانی پیتی اور اپنے اندر کی آگ کو بجھاتی رہتی۔ گہرے سانس لیتی اور اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرتی رہتی۔

……✿……

عمر حسن بے وقوف نہیں تھا اور اس کا دل بھی تھا ہاں مگر یہ دل کسی اور کے پاس تھا۔ اسے میں اس لئے نظر نہیں آتی تھی کیونکہ کوئی پہلے ہی اس کی نظر میں آ چکی تھی۔ ثناء اس کی کلاس فیلو تھی۔ عمر کب سے اسے پسند کرتا تھا، یہ میں نہیں جانتی مگر وہ شروع سے ہی اس کے ساتھ پڑھتی تھی۔ دونوں کا ساتھ بہت پرانا تھا۔ ثناء کے والدین کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ وہ تین بہنیں تھیں اور وہ سب سے بڑی تھی۔ عمر نے کبھی کسی سے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے مگر جب اس نے فائنل ایئر کے پیپرز دے دیئے تو پھر اس نے اپنی امی کو ثناء کے بارے میں بتایا تھا اور ان سے کہا کہ وہ اس کا رشتہ لے کر ان کے گھر جائیں۔ خالہ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ روتی دھوتی ہوئی ہماری طرف آ گئی تھیں اور انہوں نے میری امی کو سارا قصہ سنا دیا تھا۔ میری امی کا ردِ عمل بھی خالہ جیسا ہی تھا مگر پھر وہ نارمل ہو گئی تھیں مگر مجھے تو ایسا لگا تھا جیسے میرے دل کی حرکت بند ہو گئی تھی۔

''عمر حسن کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ کسی اور سے شادی کرنا چاہتا ہے اور میں؟ میرا کیا ہوگا؟ مجھ میں کیا نہیں تھا جو اسے مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔''

مجھے لگا تھا، کسی نے میرے وجود کو گہری کھائی میں دھکیل دیا تھا۔ میری امی کو تھوڑی بہت پریشانی ہوئی مگر پھر شاید انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ انہوں نے میرا اور عمر حسن کا رشتہ طے نہیں کیا تھا صرف زبانی کلامی ہی بات ہوئی تھی ورنہ ان کی بہت بدنامی ہوتی۔ مگر انہیں کیا پتا تھا کہ تعلق دلوں میں بنتے ہیں اور عمر حسن سے میرا جو تعلق بن چکا تھا وہ اب کبھی بھی نہیں ٹوٹنا تھا۔

عمر، خالہ کو بار بار مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کی بات مان لیں اور رشتہ لے کر وہاں جائیں، اور خالہ سختی سے اپنی ضد پر قائم تھیں۔ عمر کے ابو کو

اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں تھا اگر کسی کو تھا تو صرف خالہ کو۔ لیکن جب سب گھر والوں نے انہیں مجبور کرنا شروع کر دیا تو انہوں نے یہ بہانا کرنا شروع کر دیا کہ جب تک تینوں بیٹیوں کی شادی نہیں ہو گی وہ عمر کی شادی نہیں کریں گی، نہ ہی ابھی ہیں اس کی نسبت طے کریں گی۔ میں نے ان کے گھر آنا جانا کم کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی ان کے گھر کی ہر خبر کا مجھے علم ہوتا رہتا تھا۔ جب خالہ کسی طور بھی اس کا رشتہ لے جانے پر تیار نہیں ہوئیں تو عمر حسن، ماں سے ناراض ہو گیا، اس نے ان سے بول چال ختم کر دی تھی۔ وہ ان دنوں ویسے بھی اپنا کاروبار اچھی طرح سے اسٹیبلش کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور بہت مصروف رہتا تھا لیکن ماں سے ناراض ہونے کے بعد وہ گھر میں صرف سونے کے لیے آیا کرتا۔ اس نے گھر میں کھانا، کھانا بھی بند کر دیا تھا۔

خالہ ہر روز ہمارے گھر آتیں اور کئی کئی گھنٹے اس کی شکایتیں کرتی رہتیں مگر میں جانتی تھی، یہ صرف شکایتیں نہیں تھیں وہ اس کے رویے سے بے حد پریشان تھیں۔ آخر وہ ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور پھر کماؤ بھی۔ انہوں نے اپنی تینوں بیٹیاں اسی کے سہارے بیاہنی تھیں۔ کیونکہ میرے چچا کی ریٹائرمنٹ میں بس ایک سال رہ گیا تھا۔ انہیں یہ بھی خوف تھا کہ کہیں وہ گھر چھوڑ کر ہی نہ چلا جائے اور اگر وہ ایسا کر بیٹھتا تو پھر وہ کیا کرتیں۔ روز بروز خالہ کمزور پڑتی جا رہی تھیں، ان کی ضد ختم ہو رہی تھی اور ان کی کمزوری مجھے بھی کمزور کر رہی تھی۔ یہ سوچ کر ہی میرا سانس رکنے لگتا تھا کہ کوئی اور لڑکی اس گھر میں عمر حسن کی بیوی بن کر آ جائے گی اور میں، میں کیا کروں گی۔ ان دنوں میں بہت دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ شاید میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی دعائیں نہیں کی ہوں گی جتنی میں نے ان دنوں کی تھیں مگر کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔

ایک ہفتہ بعد خالہ، ثناء کا رشتہ مانگنے چلی گئی تھیں اور ثناء کے گھر والوں نے فوری طور پر ہاں کر دی تھی۔ اس رات میں بہت روئی تھی۔ اتنا روئی تھی کہ اگلی صبح میری آنکھیں کھل نہیں پا رہی تھیں۔ مجھ پر کیا گزر رہی تھی کوئی نہیں جانتا تھا، امی اسے میری...... بیوقوفی سمجھ رہی تھیں۔

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہارے لیے رشتوں کی کیا کمی ہے اور عمر میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ تمہارے لیے تو میں اس سے کئی گنا اچھا رشتہ ڈھونڈوں گی اور یہ اچھا ہی ہوا کہ ابھی میں نے اس سے تمہارا رشتہ طے نہیں کیا تھا ورنہ تم خود سوچو اگر کہیں بعد میں یہ سب پتا چلتا تو ہم کیا کرتے۔“

انہوں نے اگلے دن میری سوجی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کہا تھا۔ میں نے بڑی خاموشی سے ان کی باتیں سنی تھیں اور اسی طرح انہیں دوسرے کان سے نکال دیا۔

”یہ محبت کو کیا سمجھتی ہوں گی۔ انہوں نے کبھی محبت کی ہوتی تو یہ جانتیں کہ کسی کو دل سے نکالنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے سوچا تھا۔

* * *

عمر کی ثناء سے صرف نسبت طے نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک ماہ کے اندر اندر وہ بیاہ کر عمر کے گھر آ گئی۔ حالانکہ خالہ نے اس پر بہت شور مچایا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ پہلے وہ کم از کم دو بیٹیوں کی شادی کریں پھر عمر کی شادی ہو مگر ثناء کے گھر والوں کو جلدی تھی اور عمر نے اپنی امی کو بس یہ کہہ کر چپ کروا دیا تھا۔

”میں جانتا ہوں، میری تین بہنیں ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں لیکن میں نے کب ان کی ذمہ داری اٹھانے سے انکار کیا ہے۔ وہ اب بھی میری ذمہ داری ہیں شادی کے بعد بھی میری ذمہ داری رہیں گی اور اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہو گی۔

جہاں تک ثنا کا تعلق ہے تو وہ کبھی بھی آپ کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرے گی۔ وہ میرے گھر کے بارے میں بھی جانتی ہے اور میری ذمہ داریوں کے بارے میں بھی لیکن اس کے والدین کو بھی ابھی دو بیٹیاں بیاہنی ہیں۔ ثناء کی شادی کریں گے تو دوسری بیٹیوں کی شادی کر سکیں گے۔ ان کی بھی مجبوری ہے۔ آپ کو اگر یہ خدشہ ہے کہ بہت پیسہ خرچ کرنا پڑے گا تو اس کے بارے میں بھی پریشان نہ ہوں۔ بہت سادگی سے شادی کر دیں۔ کسی دھوم دھام کی ضرورت نہیں ہے۔ جو روپیہ خرچ ہوگا، وہ میں خرچ کروں گا۔ آپ کو کوئی پریشانی اٹھانی نہیں پڑے گی۔"

خالہ نے بہت بہانے کرنے کی کوشش کی مگر ان کی ایک نہیں چلی تھی۔ انہیں اس کی شادی کی تاریخ طے کرنی پڑی تھی۔ چچا تمام معاملات میں عمر کا ساتھ دے رہے تھے، شاید اس لئے کیونکہ وہ ان کا کماؤ بیٹا تھا اور وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گھر میں اس کی شادی کی تیاری کوئی زیادہ جوش و خروش سے شروع نہیں کی گئی۔ اتنی جلدی اس کی شادی پر اس کی بہنیں بھی کچھ زیادہ خوش نہیں تھیں اور خالہ، وہ تو کئی بار مجھے دیکھ کر رو پڑتیں۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی لیکن مجھے ان کی محبت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ خالہ نے بری میں اس کے لئے صرف دس جوڑے تیار کروائے تھے اور سونے کا صرف ایک سیٹ تھا۔ وہ بھی عمر نے خریدا تھا۔ خالہ کے پاس اپنی شادی کا کافی زیور تھا اور پہلے وہ کئی بار مجھے اپنے زیور کی کچھ چیزیں دکھا کر کہتیں کہ یہ میں نے عمر کی دلہن کے لئے رکھا ہے مگر عمر کی شادی کے موقع پر انہوں نے اپنا کوئی بھی زیور ثنا کو نہیں دیا تھا۔

بہت سادگی سے شادی ہوئی تھی۔ مہندی وغیرہ کی کوئی رسم نہیں ہوئی تھی۔ خالہ نے شادی پر بہت قریبی عزیزوں کو بلایا تھا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی شادی پر گئی تھی۔ کیونکہ یہ میری امی کی ضد تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ مجھے کسی بات پر ماتم کرنے کے لئے گھر میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ اس طرح صرف دوسرے لوگ تماشا دیکھتے ہیں۔ میں دل پر جبر کرتے ہوئے اس کی شادی میں شریک ہوئی تھی۔

عمر حسن بے حد خوش تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی بھی اس کو اتنا خوش نہیں دیکھا۔ اس کا ہر قہقہہ میرے دل کا خون کر رہا تھا۔ اس کی بیوی خوبصورتی میں کسی طور پر بھی میرے مقابل نہیں آ سکتی تھی۔ وہ دلہن بن کر خوبصورت لگ رہی تھی اور میں اس دن دلہن نہ ہوتے ہوئے بھی بے تحاشا خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس رات شادی سے واپس آنے کے بعد میں کمرہ بند کر کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ آئینہ کہہ رہا تھا میں بے حد خوبصورت ہوں اور آج تو قیامت ہی ڈھا رہی ہوں۔

"لوگ کہتے ہیں میں خوبصورت ہوں اور لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔ پھر بھی عمر حسن! تمہیں میرا حسن نظر کیوں نہیں آیا؟ اس کی کون سی چیز مجھ سے بہتر ہے؟ آنکھیں، بال، ہونٹ، ناک، رنگت کسی چیز میں بھی تو وہ مجھ سے بہتر نہیں ہے پھر بھی تم نے اسی کو کیوں چنا؟ مجھے کیوں نہیں؟ اس نے تم پر کیا پڑھ کر پھونکا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکے۔ وہ کون سا منتر ہے جو مجھے نہیں آتا۔ میں ساری دنیا کے لئے غلط ہو سکتی ہوں مگر خدا جانتا ہے۔ تمہیں تو میں نے دل سے چاہا تھا، کم از کم تمہارے لئے میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ پھر بھی عمر حسن! آخر تم مجھے کیوں نہیں ملے؟"

اس رات میں ایک بار پھر بلک بلک کر روئی تھی۔ میں اس رات سو نہیں سکی۔ ایک آگ تھی جو میرے وجود کو جلانے لگی۔

"وہ ثناء کو کیوں لایا ہے؟ اسے اس سے محبت کیوں ہوئی ہے؟ آج وہ ہنس رہا تھا بے حد خوش تھا۔ پتا نہیں آج وہ اس سے کیا کیا وعدے کر رہا ہوگا؟ وہ سب باتیں جو میں اپنے لئے اس کے منہ سے سننا چاہتی تھی آج وہ اس سے کہہ رہا ہوگا اور اسے احساس بھی نہیں ہے کہ اس نے مجھے تباہ کر دیا

ہے۔ برباد کر دیا ہے۔"

میں جلے پیروں کی بلی کی طرح کمرے کے چکر کاٹتی رہی۔

"کاش ثناء مر جائے کاش وہ آج ہی مر جائے۔" میں جو بددعا اسے دے سکتی تھی میں نے دی تھی۔

مگر جس کی دعا میں اثر نہیں ہوتا، اس کی بددعا میں کیا اثر ہوگا۔ قیامت تو صرف وہی تھی جو مجھ پر گزر گئی تھی۔ دوسروں کے لئے تو دنیا بھی باقی تھی اور ثناء اور عمر کے لئے تو زندگی شاید اب ہی شروع ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی لیکن عمر حسن سے میری محبت میں کمی آنے کے بجائے اور شدت آ گئی تھی۔ جتنی شدت سے میں اس سے محبت کرتی تھی۔ اتنی ہی شدت سے میں ثناء سے نفرت کرتی تھی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب عمر کی شادی ہو جائے گی پھر میں کبھی خالہ کے گھر نہیں جاؤں گی۔ لیکن میں اپنے اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ میں اس کی شادی کے بعد بھی اس کے گھر پہلے ہی کی طرح جاتی رہی، بلکہ شاید پہلے سے بھی زیادہ اور خالہ پہلے سے بھی زیادہ میری خاطر مدارت کرتی تھیں۔ ثناء کے ساتھ ان کا رویہ بے حد روکھا اور خشک ہوتا تھا اور مجھے بہت اچھا لگتا تھا ان کی یہ کڑوی باتیں سن کر۔

شروع میں میرے ساتھ بھی ثناء کا رویہ بے حد گرم جوش تھا لیکن میں اس سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اگر کبھی مجھے کوئی چیز کھانے کے لئے لا کر دیتی تو میں اسے ہاتھ تک نہ لگاتی۔ وہ مجھ سے کوئی بات پوچھتی تو میں اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے خالہ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو جاتی۔

وہ میرے پاس بیٹھی رہتی اور میں ایک بار بھی اس کی طرف دیکھنا پسند نہ کرتی۔ رفتہ رفتہ اسے میری ناپسندیدگی کا احساس ہو گیا تھا اور اس نے خود ہی میرے پاس بیٹھنا ختم کر دیا۔ اب میرے جانے پر وہ پہلے کی طرح میرا حال بھی نہیں پوچھتی تھی اور میں یہی چاہتی تھی۔ اس نے عمر حسن کو مجھ سے چھینا تھا اور یہ نقصان اتنا بڑا تھا کہ میں کسی صورت بھی اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اگر عمر حسن کی زندگی میں نہ آتی تو یہ میں تھی، جسے وہ چاہتا۔ جو اس گھر میں ہوتی مگر اس نے عمر حسن پر ایسا جادو کیا تھا کہ وہ اس کا ہو گیا۔

کبھی جب میں شام کو خالہ کے گھر جاتی تو وہ سج سنور کر پھر رہی ہوتی میری آنکھیں دھواں دھواں ہونے لگتیں۔ میرا دل چاہتا، میں اس کے بال نوچوں، اس کے کپڑے پھاڑوں۔ اس کا چہرہ اپنے ناخنوں سے بگاڑ دوں۔

"اور کتنے حربے آزمائے گی تو چڑیل! اور کتنے حربے آزمائے گی۔ اس کی دل میں تو پہلے ہی بسی ہے، اب یہ چلتر کس لیے کر رہی ہے۔"

میرا دل چلاتا میری سانس تیز ہو جاتی اور میں رکے بغیر خالہ سے باتیں کرتی رہتی اور میں کیا کرتی۔

* * *

ثناء سے نفرت میں، میں اکیلی نہیں تھی۔ خالہ مجھ سے بھی زیادہ نفرت کرتی تھیں اور وہ اپنی باتوں سے اس کا اظہار بھی کرتی رہتی تھیں جو شاید میں نہیں کر سکتی تھی۔ انہوں نے شروع سے ہی ثناء سے کسی التفات کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ اپنی باتوں کے ذریعے انہوں نے اس گھر میں اس کی حیثیت سے اسے آگاہ کر دیا تھا۔ ثناء کو اس کے ماں باپ نے بہت اچھا جہیز دیا تھا ضرورت کی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو انہوں نے نہ دی ہو لیکن خالہ

نے پھر بھی جہیز پر بہت سے اعتراضات کیے تھے اور نقص نکالے تھے۔

لیکن عمر شاید پہلے ہی ثناء کو خالہ کے رویے کے بارے میں آگاہ کر چکا تھا۔ اس لیے خالہ کسی بھی طعنے اور بات پر وہ ناراض ہوتی نہ کچھ کہتی بلکہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی جاتی اور میرے اور خالہ کے غصے میں اور اضافہ ہو جاتا تھا کیونکہ ہماری خواہش ہوتی تھی کہ وہ جواب میں کچھ کہے۔ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے اور بات بڑھے لیکن وہ کبھی اس کا موقع نہیں دیتی تھی۔

”یہ پڑھی لکھی لڑکیاں بڑی میسنی اور گھنی ہوتی ہیں۔ بڑے فریب آتے ہیں انہیں۔ یہ ابھی تو آپ کے سامنے معصوموں کی طرح منہ بند کرکے پھرتی ہے مگر بعد میں ضرور عمر کو سب کچھ بتاتی ہوگی۔“

میں ہر دفعہ خالہ کے گھر جانے پر ان کے کان میں کچھ نہ کچھ ضرور انڈیل کر آتی۔ خالہ کو میری ہر بات پر یقین آ جاتا اور ثناء سے ان کی نفرت اور بڑھ جاتی۔

❁

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or

send message at
0336-5557121

شاء کی عادتیں اور مزاج بے حد عجیب تھا۔ وہ بے حد ٹھنڈے مزاج کی مالک تھی۔ وہ ایک بڑے گھر سے چھوٹے گھر میں آئی تھی لیکن پھر بھی اس میں نہ نخرا تھا نہ غرور اور نہ ہی اسے کسی بات پر شکوہ ہوتا تھا۔ وہ خاموشی سے خالہ کی باتیں سنتی اور کسی ردعمل کا اظہار نہ کرتی۔

شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد خالہ نے اسے گھر کے کاموں پر لگا دیا تھا۔ اس نے گھر کا کام کرنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ صرف ایک وقت کا کھانا پکاتی تھی، برتن اور کچن صاف کرتی تھی اور صحن اور ڈرائنگ روم کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لی تھی۔ خالہ کی لاکھ چیخ و پکار اور نندوں کے بسورے ہوئے چہروں کے باوجود اس نے پورے گھر کی ذمہ داری نہیں لی تھی۔ وہ خالہ کی باتیں سن لیتی تھی لیکن پھر بھی کام وہ صرف اتنا ہی کرتی تھی جتنا اُس نے کہا تھا۔

خالہ کو اس پر بے حد طیش آتا تھا یک ہفتہ تک وہ عمر کے کان بھی کھاتی رہیں کہ شاء گھر کے کام میں دلچسپی نہیں لیتی لیکن اس کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"امی! میں اسے نوکرانی بنا کر نہیں لایا ہوں۔ وہ اس گھر کی ایک فرد ہے۔ جتنا کام اسماء، زینب اور یاسمین کرتی ہیں، اتنا ہی کام وہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے وہ ان سے زیادہ تو نہیں کر سکتی۔ پھر آپ کو کس بات پر اعتراض ہے۔ اب اگر وہ سب لوگوں کے کپڑے نہیں دھوتی تو ٹھیک ہے۔ وہ اپنے اور میرے کپڑے دھو لیتی ہے۔ آپ کے اور ابو کے بھی دھو سکتی ہے لیکن باقی لوگ اپنی ذمہ داری خود اٹھا سکتے ہیں۔ اور مجھے تو اس سے یہ کہتے ہوئے بھی شرم آئے گی کہ وہ میری بہنوں اور بھائی کے کپڑے دھوئے۔"

وہ بڑے اطمینان سے کہہ دیتا اور خالہ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ مگر عمر پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی شاء کی طرح امی کی باتیں سنتا اور چپ رہتا۔

امی ان دنوں بڑے زور و شور سے میرے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ بعض رشتے انہیں کسی نہ کسی وجہ سے پسند نہ آتے اور جو انہیں پسند آتے، انہیں میں ٹھکرا دیتی۔ میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی کیونکہ جو جگہ میں عمر حسن کو دے چکی تھی وہ اب کسی اور کو نہیں دے سکتی تھی۔ مگر میں یہ بات ان سے نہیں کہہ سکتی تھی ہاں جو کام میں کر سکتی تھی، وہ کر رہی تھی۔

◆

خالہ نے اسماء کی شادی طے کر دی تھی۔ اس کی شادی عمر جتنی سادگی سے تو نہیں ہوئی تھی مگر زیادہ دھوم دھڑکے سے بھی نہیں ہوئی۔ خالہ نے اپنے زیورات کا ایک حصہ اسے دے دیا تھا کچھ چیزیں اس کے جہیز کے لیے خالہ نے پہلے سے تیار کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ باقی چیزوں کا انتظام عمر نے کیا تھا۔ خالہ نے بھی ضرورت کی ہر چیز اسماء کو دی تھی بلکہ بعض غیر ضروری چیزیں بھی۔ عمر نے دبی زبان سے اس پر اعتراض کیا تھا مگر خالہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ یہ سارے اخراجات ضد میں کر رہی تھیں۔

"اگر اپنی شادی کے لیے تمہارے پاس پیسہ آ سکتا ہے تو کیا بہن کے لیے نہیں آ سکتا۔ اس وقت تو بڑا کہہ رہے تھے کہ ہر ذمہ داری پوری کروں گا اب کیا بیوی کی نصیحتیں یاد آنے لگی ہیں۔"

عمر کا چہرہ ان کی بات پر سرخ ہو گیا مگر وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں تب خالہ کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی اور چچی اور زیب بھی پاس ہی تھے۔ خالہ اس کے جانے کے بعد بھی بڑبڑاتی رہیں عمر نے اس کے بعد دوبارہ کسی چیز پر اعتراض نہیں کیا تھا وہ بس خاموشی سے خالہ کے احکامات سرانجام دیتا رہا۔ خالہ نے جہیز پر کافی روپے خرچ کر دیے تھے مگر انہیں اس لیے اس کا زیادہ احساس نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے اپنے پاس سے بہت کم روپے خرچ کیے تھے۔ کچھ رقم چچا نے دی تھی جبکہ باقی ساری رقم عمر نے دی تھی۔

اسماء کی شادی کے تین ماہ بعد ہی عمر کے ایک دوست کی معرفت زیب کا رشتہ بھی طے ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کو بھی شادی کی جلدی تھی۔ ایک بار پھر خالہ نے اسماء کی شادی کی طرح زیب کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ عمر نے پہلے کی طرح خالہ کو کچھ رقم دی تھی مگر خالہ کے لیے وہ رقم بہت کم ثابت ہوئی۔ انہوں نے تین بار عمر سے اور رقم مانگ لی۔ اس نے بڑی خاموشی سے ان کا مطالبہ پورا کر دیا۔ زیب کی شادی میں، میں نے ثناء کو نئے زیورات پہنے ہوئے دیکھا تھا اور میں نے خالہ کی توجہ بھی اس طرف مبذول کروائی تھی۔

”ہاں، بیوی کو عیاشی نہیں کروائے گا تو کیا ماں بہنوں کو کروائے گا۔ بیوی کے لیے نیا سیٹ بھی بن گیا ہے۔ چوڑیاں بھی بن گئی ہیں اور اسے اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بہن کو ایک انگوٹھی ہی ڈال دیتا۔ میں نے ہی اپنا زیور اسے دیا ہے اور پھر ثناء کے پاس زیور کی کون سی کمی تھی۔ تین سیٹ اور بارہ چوڑیاں تو اسے اپنے میکے سے ملے تھے اور ایک سیٹ ہماری طرف سے دیا گیا تھا پھر بھی دیکھو اس نواب زادے کو کیسے چھپ چھپاتے بیوی کو زیور دے کر دے دیا ہے۔“

خالہ کافی ناراض تھیں اور زیب کی رخصتی کے فوراً بعد انہوں نے سب کے سامنے ہی عمر سے اس ناراضگی کا اظہار کر دیا تھا۔ ثناء خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی جبکہ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا لیکن اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔ جب خالہ کی ڈانٹ ڈپٹ اور طعنے زیادہ ہو گئے تو وہ بھی اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ خالہ کی ناراضگی میں اور اضافہ ہو گیا۔

* * *

عمر کی شادی کو ڈیڑھ سال ہو رہا تھا لیکن ابھی تک ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ان دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے انہیں اس کی زیادہ پروا ہے بھی نہیں۔ جب بھی خالہ کبھی پوتے پوتیوں کا ذکر چھیڑتیں اور ثناء کو کچھ کہتیں تو وہ تو چپ رہتی لیکن عمر اس ذکر کو بڑی لاپروائی سے ٹال دیتا۔

بعض دفعہ مجھے ثناء ایک جادوگرنی کی طرح لگتی تھی۔ اس نے پتا نہیں عمر پر کیا منتر پھونکا ہوا تھا کہ اس کی کوئی کمزوری عمر کو نظر آتی ہی نہ تھی۔

وہ خالہ کی باتوں پر کان دھرتا تھا نہ گھر والوں کی شکایتوں پر اور اس کی عادت نے میرے حسد کو اور بھڑکا دیا تھا۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس کا کاروبار بڑھنے کے بجائے گھٹتا ہی گیا تھا۔ باہر سے ایکسپورٹ کے آرڈرز ملنا پہلے سے کم ہوئے اور پھر آہستہ آہستہ بند ہی ہو گئے۔ ان دنوں میں جب بھی خالہ کے گھر جاتی، ان کے ہونٹوں پر کاروبار کا ہی ذکر ہوتا۔

”اچھا بھلا کام چل رہا تھا۔ مگر جب سے یہ چڑیل گھر میں آئی ہے آہستہ آہستہ کاروبار ختم ہی ہو گیا ہے۔“

وہ اب بلند آواز سے ثناء کو کوسنے دیا کرتی تھیں اور تب پہلی بار میں نے اسے پریشانی میں دیکھا اور یہ احساس میرے دل کو بے حد تقویت

پہنچا رہا تھا کہ اب وہ تکلیف میں وقت گزارے گی۔ اب وہ لڑے گی، چیخے گی، چلائے گی۔ آخر وہ انسان تھی اور پچھلے ڈیڑھ سال سے وہ عیش ہی تو کر رہی تھی۔ مجھے عمر حسن سے ہمدردی تھی۔ اگر یہ حالت ثناء سے شادی سے پہلے ہوتی تو میں اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیتی۔ میں اپنے ابو کو مجبور کرتی کہ وہ اس کی مدد کریں، لیکن اب نہیں۔ اب میں اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اب میں اسے بھی تکلیف میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے بھی تو پتا چلنا چاہیے تھا کہ جب مٹھی میں جکڑی ہوئی چیزیں پھسل جاتی ہیں اور لاکھ کوشش کرنے کے باوجود ہاتھ میں نہیں آتیں تو کیسا لگتا ہے۔

اس کو بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہو اور وہ آپ کے پاس نہ رہے تو کیا ہوتا ہے۔ میں ان کے گھر جاتی رہتی تھی۔ میں چہرے دیکھتی رہتی تھی۔ پہلے وہ بہت مصروف ہوتا تھا اور بہت کم ہی گھر پر نظر آتا تھا مگر اب وہ اکثر گھر پر نظر آیا کرتا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے اس کے چہرے پر جو رونق رہتی تھی، وہ غائب ہونے لگی تھی۔ میں جانتی تھی وہ پریشان ہے اور بعض دفعہ میرا دل چاہتا، میں بھاگ کر اس کے پاس جاؤں اور کہوں۔

”مجھے بتاؤ۔ تمہیں کیا چاہیے تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے، مگر تم مسکرا دو۔“

مگر پھر وہ آ جاتی ہمیشہ کی طرح اور میرے سارے جذبات بھک سے اڑ جاتے۔

ان دنوں خالہ بھی بہت پریشان تھیں اور وہ اپنی پریشانی کا اظہار وقتاً فوقتاً جھگڑوں سے کرتی رہتی تھیں۔ ان جھگڑوں کا نشانہ ثناء بنتی اور اب تو خالہ، عمر کو بھی طعنے دینے لگی تھیں۔ وہ اسے کئی دفعہ بہت غصے سے کہتیں کہ ”گھر چلانا اب اس کی ذمہ داری ہے اور وہ محنت کرنے کے بجائے کام چوروں کی طرح ادھر ادھر پھر کر شام کو گھر آ جاتا ہے اسے فکر ہی نہیں ہے کہ گھر میں کچھ پکانے کے لیے ہے یا نہیں اور گھر کا خرچ کہاں سے چل رہا ہے۔“

بعض دفعہ خالہ میرے سامنے ہی یہ سب کچھ کہتیں اور وہ سرخ چہرے کے ساتھ وہاں سے چلا جاتا۔ اگر ثناء وہاں ہوتی تو مجھے خالہ کی یہ ڈانٹ پھٹکار بہت اچھی لگتی، اگر وہ نہ ہوتی تو مجھے اس پر بے اختیار ترس آتا۔ وہ چند ماہ سے خالہ کو گھر کے خرچ کے لیے پیسے نہیں دے رہا تھا اور خالہ کو چچا کی پنشن میں ہی گزارا کرنا پڑ رہا تھا، اور وہ رقم اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی کہ با آسانی گھر کا خرچ چلایا جا سکے۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ان کے پاس کیا ہوتا ہے یا کیا نہیں۔ میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ثناء کے صبر کا پیمانہ کب لبریز ہوتا ہے یا عمر کب ان حالات سے تنگ آ کر فرسٹریشن کا شکار ہوتا ہے اور اس سے جھگڑنا شروع کرتا ہے۔

مگر ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں بہت بڑے فریبی تھے۔ یا پھر شاید ایکٹر تھے۔ انہیں اپنے جذبات چھپانا بہت اچھی طرح آتا تھا ورنہ پتا نہیں انہیں ایک دوسرے کے وجود سے الجھن کیوں نہیں ہوتی تھی۔ مجھے ثناء پر زیادہ حیرت ہوتی تھی۔ آخر عمر میں تھا ہی کیا جو اس نے اس کا انتخاب کیا اور اب کیا رہا تھا جو وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔

وہ گھر کا خرچ نہیں چلا پا رہا تھا تو اسے کیا دیتا ہوگا اسے وحشت نہیں ہوتی ہوگی اس گھر کے ماحول سے۔ اسے چلے جانا چاہیے وہاں سے۔ میں نے سوچا اور سوچتی ہی رہی۔ مگر پتا نہیں وہ کس مٹی سے بنی تھی۔ گھر چھوڑ کر جانے کے بجائے ایک دن مجھے پتا چلا کہ اس نے کہیں جاب کر لی ہے۔ ہمارے خاندان میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ کسی نے جاب کی ہو۔

خالہ نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ انہوں نے عمر کو ہر طعنہ دے ڈالا اور یہ صرف ایک دن نہیں ہوتا تھا۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ جب بھی ان کے سامنے "آتا وہ اسے طعنے دیتیں بعض دفعہ مجھے اس پر بے حد رحم آتا مگر خالہ کو رحم نہیں "آتا تھا عمر نے سب کچھ سننے کے باوجود شاہ کو نوکری سے نہیں روکا تھا۔

مجھے ذاتی طور پر شاہ کی جاب پر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ یہ پہلا ایسا قدم تھا جو چھٹکارے کی طرف تھا۔ میں جانتی تھی کام کرنے والی عورتیں زیادہ دیر تک نکھٹو شوہر برداشت نہیں کرتیں اور عمر کے پاس اب کچھ بھی نہیں تھا اس کا دفتر تقریباً بند ہو چکا تھا اور ان دنوں وہ خود جاب کی تلاش میں رہنے لگا تھا شاہ کے نوکری کرنے سے یہ ہوا کہ عمر نے ایک بار پھر سے گھر میں خرچ کے لیے پیسے دینا شروع کر دیے۔

ظاہر ہے کہ پیسے شاہ کی تنخواہ کے ہی ہوتے تھے اور خالہ ان دونوں کو درجنوں طعنے اور گالیاں دینے کے باوجود بھی وہ پیسے لے لیتی تھیں۔ انہیں پتا تھا کہ صرف پنشن سے گھر نہیں چل سکتا۔ چچا نے بھی ایک پارٹ ٹائم جاب ڈھونڈی تھی اور کم از کم یہ ضرور ہو گیا تھا کہ اب خالہ ہر دوسرے چوتھے روز امی کے پاس ادھار مانگنے نہیں آیا کرتی تھی کچھ وقت اور اسی طرح گزر گیا تھا میری امیدیں ابھی بھی قائم تھیں۔

"یہ رشتہ ختم ہو جائے گا رہنے والا نہیں ہے۔ بس دیکھو کہ اور کتنا وقت لگتا ہے۔"

میں خود کو تسلیاں دیتی رہتی اس کے علاوہ ان دنوں میرے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

◆

اس دن بھی میں خالہ کے گھر تھی، جب شاہ کی دو فرینڈز اس سے ملنے آئی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی جب اچانک خالہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جا کر ان کی باتیں سنوں اور انہیں بتاؤں کہ وہ اپنی فرینڈز سے کیا کہہ رہی ہے۔ اس سے پہلے خالہ اکثر یاسمین کے ذریعے اس پر نظر رکھتی تھیں مگر اس دن یاسمین گھر پر نہیں تھی سو خالہ نے یہ کام مجھے سونپ دیا۔ ایک عجیب سی سنسنی میرے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ میں زندگی میں پہلی دفعہ یہ کام کر رہی تھی مگر پھر بھی ایک عجیب سا جوش تھا میرے اندر۔ دھڑکتے دل اور دبے قدموں سے میں ڈرائنگ روم کی اس کھڑکی کے پاس کان لگا کر کھڑی ہو گئی جو گھر کے دائیں طرف والی گلی میں کھلتی تھی۔ مجھے کافی احتیاط سے وہاں جانا پڑا تھا کیونکہ گلی کافی تنگ تھی اور جا بجا گملے رکھے ہوئے تھے جن میں چیری لگائی گئی تھی۔ پھر کچھ لکڑی کا پرانا فرنیچر بھی وہاں پڑا ہوا تھا۔ بہرحال بہت احتیاط سے سب چیزوں سے بچتی بچاتی میں کھڑکی کے پاس پہنچ ہی گئی۔

اندر سے آوازیں صاف آ رہی تھیں، کیونکہ کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے میں نے کھڑکی کے سامنے آ کر اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس طرح کوئی بھی مجھے دیکھ سکتا تھا، بس کھڑکی کے ایک طرف کھڑے ہو کر کان اندر لگا دیے۔

"دل کیوں نہیں چاہتا؟ چاہتا ہے دل، لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ ساری زندگی دل کی خواہشوں کے تحت تو نہیں گزاری جا سکتی۔ کچھ برداشت، کچھ صبر بھی کرنا پڑتا ہے اور میں آج کل وہی کر رہی ہوں اور رابعہ! یقین کرو میں ناخوش نہیں ہوں۔"

میں نے شاہ کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ کسی چیز کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

"پھر بھی شاء! گھر چلانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے یہ عمر کی ذمہ داری ہے یا تمہارے سسرال والوں کی۔ تمہاری نہیں۔"

اس کی دوستوں میں سے کسی نے کہا تھا میں بڑے غور سے اس کا جواب سننے لگی۔

"ذمہ داری کا ہی تو مسئلہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی اپنے سر پہ لینے پر تیار نہیں ہوتا۔ دیکھو رابعہ! یہ تعلیم میں نے اس لیے حاصل کی تھی کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو اسے استعمال کروں اور اب مجھے اس کا استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ عمر ایسا بندہ نہیں ہے جو اپنی ذمہ داریاں دوسروں کے کندھوں پر ڈال کر خوش ہو، نہ ہی وہ کوئی کام چور قسم کا آدمی ہے۔ لیکن پرابلم یہ ہے کہ ابھی اس کا بزنس تقریباً ختم ہو گیا ہے اور اچھی جاب کوئی ہے نہیں، اور میں خود بھی نہیں چاہتی کہ وہ کوئی جاب کرے اگر اس نے جاب کرنی شروع کر دی تو پھر بزنس تو اسے چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اتنی محنت سے جو اس نے ایک فرم، ایک آفس بنایا ہو سکتا ہے وہ دوبارہ کبھی نہ بنا سکے بزنس میں، اچھا برا وقت تو آتا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ برا وقت بھی تھوڑے عرصے کے لیے ہی ہو اس لیے میں نہیں چاہتی کہ وہ صرف گھر کا خرچ چلانے کے لیے جاب کرنے پر مجبور ہو جائے۔ برا وقت گر مل کر گزاریں گے تو پھر ہمارا رشتہ اتنا مضبوط ہو جائے گا کہ کوئی چیز اس پر اثر انداز نہیں ہو سکے گی۔"

مجھے اس کی باتوں سے جلن ہونے لگی تھی وہ ابھی بھی ناامید نہیں تھی۔

"اور بچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ کیا اپنا خاندان بڑھانا نہیں ہے؟" اس دفعہ ایک دوسری آواز نے پوچھا تھا۔

"دیکھو سعدیہ! ابھی بچے پیدا کر کے کیا کرنا ہے بچوں کے لیے ابھی ہمارے پاس ہے کیا۔ انہیں تو کم از کم اس طرح نہیں رکھ سکتے جس طرح ہم رہ رہے ہیں۔ پھر انہیں ابھی پیدا کرنے کا کیا فائدہ؟ ویسے بھی عمر بالکل نہیں چاہتا کہ ابھی کوئی بچہ پیدا ہو اور جب وہ ہی نہیں چاہتا تو پھر ظاہر ہے مجھے کس بات کی جلدی ہے۔"

"پھر بھی شاء! تمہاری شادی کو دو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے کیا تمہارے سسرال والے کوئی اعتراض نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں، میری ساس طعنے وغیرہ بھی دیتی ہیں، مگر دونوں اس کے بارے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں، اس لیے نہ میں پروا کرتی ہوں نہ عمر اور جب عمر کو پروا نہیں ہے تو پھر ظاہر ہے میں کیوں پریشان ہوں گی۔"

"تم بہت ایثار کر رہی ہو عمر کے لئے۔ عورت کو عام طور پہ یہ ایثار راس نہیں آتے۔ تمہارا یہ ایثار، یہ قربانیاں وہ کب تک یاد رکھے گا مرد کی یادداشت بڑی کمزور ہوتی ہے ان معاملات میں اور کیا عمر مختلف ہو سکتا ہے۔"

"بالکل یاد رکھے گا۔ کیوں نہیں یاد رکھے گا میں یہ بالکل نہیں مانتی کہ مرد کے لئے قربانی دی جائے اور وہ اسے بھول جائے۔ اس کا کوئی صلہ نہ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو بندہ آپ کا شوہر ہو۔ آپ سے محبت کرتا ہو۔ آپ اس کے لئے کچھ کریں تو وہ اسے بھلا دے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو اور پھر ہم دونوں میں تو ذہنی ہم آہنگی ہے، ہمیں تو اپنی باتیں ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے بعض دفعہ الفاظ کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کم از کم عمر حسن وہ واحد شخص ہے جس کے بارے میں، میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ احسان فراموش نہیں ہے اس کے لئے کچھ کیا جائے تو وہ اس سے بڑھ کر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

”مگر ابھی تک تو تم ہی اس کے لیے کچھ نہ کچھ کیے جا رہی ہو۔ پہلے تم نے اس کی بہن کی شادی پر اپنا زیور بیچ کر روپے اسے دے دیے پھر یہ جاب۔“

میں اس کی دوست کی بات پر چونک پڑی تھی۔ ثناء نے اپنی دوست کو بات مکمل نہیں کرنے دی۔

”دیکھو رابعہ! زیور بیچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں ہے۔ پھر میں نے اپنی مرضی سے اس کی مدد کی تھی اس نے مجھ سے نہیں کہا تھا۔ زیور کون سی چیز ہے جس کے بغیر رہا نہ جا سکے شادی بیاہ پر ہی پہنا جاتا ہے اور وہ کسی سے بھی لے کر پہنا جا سکتا ہے جیسے میں اپنی امی سے لے کر پہن لیتی ہوں۔ جب اس گھر میں آ گئی ہوں تو اس گھر کی ہر ذمہ داری کو شیئر کرنا بھی میرا فرض ہے۔ پھر اس کی بہن اور میری بہن میں کیا فرق تھا۔ میں اتنی معمولی چیزوں کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہیں ہوتی۔ اس کے پاس جب روپیہ آئے تو دیکھ لینا، وہ مجھے کیا کیا دے گا۔“

اس کے لہجے میں ایک عجیب سا یقین تھا اور یہ یقین مجھے سانپ کی طرح ڈس رہا تھا۔ یہ کس مٹی سے بنی ہوئی ہے کہ اس کے گمان کبھی غلط ہوتے ہی نہیں۔ اس کا یقین کبھی ختم نہیں ہوتا۔

”عمر حسن نہ کبھی تمہارا رہے گا نہ تمہارے لیے کچھ کرے گا۔ وہ پہلے بھی میرا تھا اور اب بھی میرا ہے، وہ کل بھی میرا ہی رہے گا۔ میں دیکھوں گی تم کب تک اس کے دل میں بسی رہو گی۔“ میں، خود ہی خود چلا رہی تھی۔

پھر میں زیادہ دیر تک وہاں کھڑی نہیں رہ سکی۔ میں وہاں سے خالہ کے پاس آ گئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے ان کی گفتگو کے بارے میں پوچھا تھا اور میرے دل میں جو آیا، میں نے گھڑ کر خالہ کو بتا دیا۔ ان کا طیش بڑھتا ہی گیا تھا۔ میں وہاں سے آ گئی تھی۔ اس شام عمر کے آنے پر خالہ نے گھر میں تماشا کھڑا کر دیا۔ انہوں نے دونوں کو کھری کھری سنائی تھیں۔ ثناء نے بہت انکار کیا تھا کہ اس نے اپنی فرینڈز سے خالہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی مگر خالہ نے ایک نہیں سنی۔ انہیں مجھ پر بڑا یقین تھا مجھے خالہ کے اس کارنامے کی تفصیل اگلے دن معلوم ہوئی تھی اور میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

◆

دن اسی طرح گزرتے جا رہے تھے۔ عمر کے بزنس میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا تھا اس نے کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی کر لی تھی۔ ان کے گھریلو ماحول میں ویسے ہی تناؤ تھا۔ خالہ ہر بات کا ذمہ دار ثناء کو ٹھہراتی تھیں وہ اسے منحوس کہنے لگی تھیں۔ میں مانتی ہوں، یہ میں ہی تھی، جس نے ثناء کے معاملے میں خالہ کی پوری برین واشنگ کر دی تھی اگر میں خالہ کے گھر میں اتنی آمد و رفت نہ رکھتی تو شاید خالہ کو ثناء کی کوئی اچھائی بھی نظر آ جاتی۔ شاید وہ ان کے دل میں کچھ جگہ بنا ہی لیتی۔ لیکن میں نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا بڑی ہوشیاری سے میں نے ان کے دل میں نفرت کا بیج بویا تھا اور پھر اسے مسلسل پانی دیتی رہی یہاں تک کہ وہ ایک تناور درخت بن گیا تھا، ایسا تناور درخت جسے کاٹنا اب ثناء اور عمر کے بس کا کام نہیں رہا تھا۔ شاید اب میں بھی چاہتی تو اس درخت کو گرا نہیں سکتی تھی لیکن میں اسے گرانا چاہتی بھی نہیں تھی۔ اس کے سائے تلے تو مجھے بیٹھنا تھا۔

ان دنوں خالہ نے ان دونوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ ثناء آفس سے گھر آتی اور کسی نہ کسی بات پر خالہ کوئی ہنگامہ شروع کر دیتیں۔ میں بعض دفعہ اس کی برداشت پر حیران ہوتی تھی اس میں صبر کا مادہ میری توقع سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ خالہ کی باتیں سرخ چہرے کے ساتھ سنتی رہتی بعض دفعہ

اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے مگر وہ پھر بھی چپ ہی رہتی تھی۔

پھر جب رات کو عمر گھر آتا تو خالہ نے پھر کوئی تماشا تیار رکھا ہوتا۔ وہ بلند آواز سے بولتی جاتیں۔ اپنی قسمت کے رونے روتیں۔ ثناء کو گالیاں دیتیں۔ عمر کو بیوی کی کمائی کھانے اور اس کے غلام بن جانے کے طعنے دیتیں۔ لوگوں کے بیٹوں کی فرمانبرداری، محنت اور کاروبار میں ترقیوں کے قصے سناتیں اور پھر رونا شروع کر دیتیں۔ جب میں وہاں ہوتی تو میں انہیں تسلی دینے لگتی۔

عمر زرد چہرے کے ساتھ سر جھکائے یہ سب سنتا اور پھر باہر نکل جاتا۔ میرا دل کٹنے لگتا۔ ”میں اسے تو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتی۔“ میں سوچتی ور صرف سوچتی اگلی بار پھر کچھ ایسی ہی بات ہوتی، پھر وہی جھگڑا، وہی ہنگامہ، وہی تماشا اور وہی خاموشی۔

⁂

پھر ایک دن پتا چلا کہ عمر نے چچا سے ان کی گریجویٹی کی رقم مانگی ہے تاکہ وہ اپنے کاروبار میں لگا سکے۔ چچا نے صاف انکار کر دیا تھا۔

”ہم لوگوں نے اس سے کہہ دیا کہ اب اسے کوئی رقم نہیں دے سکتے۔ آخر اسے پہلے بھی تو بزنس شروع کرنے کے لئے روپے دیئے تھے ان سے اس نے کون سا تیر مار لیا جواب وہ اور چاہتا ہے۔ پھر ہماری باقی اولاد بھی ہے، ان کا حق ہم کیوں ماریں۔ جو تھوڑا بہت روپیہ ہے، وہ بھی تو ہے۔ اس سے یاسمین کی شادی کرنی ہے اور انصر کو بھی کوئی کاروبار کروانا ہے۔ ویسے بھی وہ اب شادی شدہ ہے اسے پیسے کی ضرورت ہے تو اپنے سسرال والوں سے مانگے۔ سب لوگ مانگتے ہیں۔ ہم نے اس کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔“

خالہ نے میری امی کو بتایا مجھے خالہ کی بات پر خوشی ہوئی تھی۔

”اچھا ہے بیوی سے مانگے، اس سے کہے، وہ لا کر دے۔ آخر اور بھی تو لڑکیاں اپنے میکے سے ضرورت کے وقت رقم لا کر دیتی ہیں، وہ کیوں نہیں دے سکتی۔“

میں نے خالہ سے کہا تھا خالہ میری بات پر ثناء کے خلاف تقریر کرنے لگی تھیں۔ مجھے ان کی تقریر میں دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے دلچسپی تھی تو صرف اس بات میں کہ عمر کا ردعمل کیا ہوگا اور اس کی خاموشی آخر کار ٹوٹ ہی گئی تھی۔

خالہ کی اس تجویز پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ اسے ان سے جو جو شکایتیں تھیں، وہ اس دن اس نے کر دی تھیں۔ ان کے روپے کے بارے میں، ان کی باتوں کے بارے میں، ان کی سوچ کے بارے میں، ثناء سے ان کے سلوک کے بارے میں، پچھلے دو ڈھائی سال کا غبار آخر باہر آ ہی گیا تھا۔

جواب میں خالہ بھی چپ نہیں رہی تھیں۔ انہوں نے اسے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ وہاں خوش نہیں تو بیوی کو لے کر چلا جائے۔

لیکن وہ نہیں گیا تھا۔ وہ نہیں جائے گا یہ بات خالہ بھی جانتی تھیں کہیں جانے کے لئے کہیں رہنے کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے پاس کیا تھا۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس کا دل خالہ کی طرف سے اور بدگمان ہو گیا میں ہر بات پر غور کرتی رہتی تھی پھر اس کے مطابق اپنے مہرے آگے بڑھاتی تھی۔

پھر پتا نہیں کیا ہو لیکن مجھے لگنے لگا کہ ثناء مجھے بے حد ناپسند کرتی ہے شاید اسے شک ہو گیا تھا کہ میں خالہ کو کچھ نہ کچھ سکھاتی رہتی ہوں۔ مجھے

اس کی ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی یہ گھر خالہ کا تھا اس کا نہیں اور مجھے وہ کسی طور بھی وہاں آنے سے منع نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ لہرا جاتا تھا۔ وہ جن نظروں سے مجھے دیکھتی تھی وہ بعض دفعہ مجھے خوفزدہ کر دیتی تھیں۔ بے تاثر، سرد، گہری، سلاخوں کی طرح دل میں اتر جانے والی نظریں۔ مگر پھر میں نے خود پر قابو پانا سیکھ لیا تھا۔ اس سے ڈر جاؤں گی تو یہ جنگ کیسے جیتوں گی۔'' میں ہر بار خود کو یقین کی رسی تھما دیتی۔

پھر خالہ سے پتا چلا کہ ثناء نے اپنے جہیز کی تقریباً ساری قیمتی چیزیں بیچ دی تھیں۔ فریج، ٹی وی، وی سی آر، ڈیک، فرنیچر تقریباً ہر چیز۔

میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو چڑیل کہنے لگی۔ ''جی آپ نے ہی کہا تھا کہ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے تو میں عمر کی مدد کر رہی ہوں۔ میکے میں کبھی کچھ لینے نہیں جاؤں گی۔ کیونکہ ان پر میرا جتنا حق تھا وہ ادا کر چکے ہیں۔ پھر میں ان سے کچھ مانگ کر اپنے شوہر اور سسرال کو چھوٹا کرنا نہیں چاہتی۔ ہاں میری ہر چیز عمر کی ہے ان چیزوں پر اس کا حق ہے۔ اسے ضرورت ہے، اور میں ان چیزوں کو بیچ کر اس کی ضرورت پوری کر دوں گی۔ یہ چیزیں رشتوں سے بڑھ کر نہیں ہوتیں۔'' میرا دل چاہا میں اس کے منہ پر جوتا کھینچ ماروں۔ ''شوہر کا چیزوں پر حق ہے سسرال والوں کا نہیں۔ یہ پڑھی لکھی لڑکیاں بڑی مکار اور فریبی ہوتی ہیں انہیں شوہروں کو پھانسنے اور پھانسے رکھنے کے سو طریقے آتے ہیں۔''

خالہ مجھے بتا رہی تھیں اور میرا دل جل رہا تھا۔ ''اللہ کرے تو مر جائے ثناء اللہ کرے تو مر جائے۔'' میرے دل سے بددعائیں نکل رہی تھیں۔

''کتنے خنجر گاڑے گی میرے سینے میں اور کتنے خنجر گاڑے گی۔''

اس سے میری نفرت میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ عمر سے عشق اتنا ہی بڑھ گیا تھا خالہ نے بتایا تھا کہ اس نے پچاس ہزار کی کوئی کمیٹی ڈالی ہوئی تھی اور اس نے وہ بھی عمر کو دے دی تھی۔

عمر نے جاب چھوڑ دی تھی۔ پتہ نہیں ان دنوں وہ کہاں کہاں گھومتا رہتا تھا۔ عجیب حلیہ ہو گیا تھا اس کا۔ اسے کسی چیز کی ہوش ہی نہیں تھی سوائے اپنے بزنس کے بعض دفعہ وہ ساری ساری رات باہر رہتا۔

بعض دفعہ وہ دو دو تین تین دن کے بعد گھر آتا اور پھر پتا نہیں کیا ہوا مگر اس کا بزنس ایک بار پھر ٹھیک ہونے لگا تھا ایک بار پھر سے اسے آرڈرز ملنے لگے تھے اور ہر نئے آرڈر کی خبر میرے دل کی ایک دھڑکن کو کم کر دیتی۔ روپیہ نہیں آنا چاہیے اس کے پاس روپیہ نہیں آنا چاہیے روپیہ آئے گا تو یہ اور ثناء ''میں آگے کچھ نہ سوچ پاتی میرا دل ڈوبنے لگتا۔'' کیا کروں اللہ میں کیا کروں جو سب کچھ پھر پہلے کی طرح ہو جائے۔ خالہ اپنی باتیں کہے جاتیں، میں اپنے منصوبے بناتی رہتی۔ مگر بعض دفعہ منصوبے بھی کام نہیں آتے کچھ بھی کام نہیں آتا بس وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔ عمر کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ رات دن اپنے بزنس میں مصروف رہتا تھا اور اس کا بزنس ترقی کرتا جا رہا تھا صرف چار پانچ ماہ میں ہی ان کے گھر میں تبدیلیاں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ خالہ کو پہلے سے دوگنی رقم دینے لگا تھا۔ گھر میں بہت سی چیزوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اور ثناء خوش رہنے لگی تھی۔

اب میں خالہ کے پاس جاتی تو وہاں میرا دم گھٹنے لگتا۔ ہر بگڑی ہوئی چیز صحیح ہونے لگی تھی۔ ثناء اکثر مسکرانے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر چمک ہوتی تھی۔ بعض دفعہ وہ اور عمر ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے تو مجھے لگتا جیسے کسی نے مجھے آگ میں پھینک دیا ہے اور اس دن تو میں بے تحاشا روئی تھی جب مجھے خالہ سے پتہ چلا تھا کہ عمر نے ثناء کی جاب چھڑوا دی ہے۔

میں خالہ کی بات پر گم صم ہو گئی تھی۔ میرا ہر داؤ ہر وار الٹا ہی پڑتا جا رہا تھا اب میرا جی چاہنے لگا میں کسی طرح اسے زہر دے دوں۔ وہ مر جائے جب تک وہ زندہ ہے اس سے عمر کی جان چھوٹے گی نہ میری۔ مگر اسے زہر دینے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں۔

* * *

ان دونوں کی شادی کو تین سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا اور پہلی بار میں نے ثناء میں تبدیلی محسوس کی تھی۔ اب وہ خالہ کی کسی بات کسی نکتہ چینی پر چپ نہیں رہتی تھی، وہ وضاحت کر دیا کرتی تھی۔ بڑے پر سکون اور اطمینان انداز میں اور خالہ کو تو بس آگ ہی لگ جاتی تھی۔ اگر وہ شروع سے اسی طرح اپنی پوزیشن کلیئر کرتی ہوتی تو شاید خالہ یہ سب اتنا برا نہ لگتا مگر اب انہیں لگتا تھا کہ وہ ان سے بحث کرنے لگی ہے۔

میں مانتی ہوں، خالہ کو اس طرح سوچنے پر بھی میں نے ہی مجبور کیا تھا۔ میں خالہ سے کہتی رہتی تھی کہ ”اب عمر کے پاس روپیہ آنا شروع ہو گیا ہے اب وہ اسے کبھی رہنے نہیں دے گی اور وہ آپ سے فضول بحث اس لئے کرتی ہے کیونکہ اسے یہ لگتا ہے کہ آپ لوگ اس کے شوہر کی کمائی کھا رہی ہیں۔“ میں خالہ کو اس طرح کی باتوں سے خوب بھڑکا دیا کرتی۔ وہ ثناء سے پہلے سے بھی زیادہ جھگڑا کرنے لگی تھیں اور میں پھر پر سکون ہونے لگی تھی۔ اچھا تھا کہ یہ تماشا اسی طرح جاری رہتا۔ پھر مجھے پتا چلا کہ ثناء میرے آنے پر اعتراض کرنے لگی تھی۔ میں خالہ کے سامنے خوب روئی تھی اور خالہ نے بھی مجھے گلے لگا کر خوب آنسو بہائے تھے۔

”جب تک میں زندہ ہوں، کسی کی مجال نہیں جو تمہیں یہاں آنے سے روک سکے پھر یہ چڑیل کیا کرے گی۔“

انہوں نے مجھے تسلی دی تھی۔ وہ یہ یقین دہانی نہ بھی کراتیں تب بھی میں جانتی تھی کہ مجھے وہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ خالہ کی بدگمانیاں ثناء سے اور بڑھ گئی تھیں۔ عمر بہت مصروف رہتا تھا۔ رات کو بہت لیٹ آتا اور صبح بہت جلدی چلا جاتا۔ خالہ کو اس سے شکوے شکایتوں کا موقع کم ہی ملتا تھا اور یہ غبار پھر وہ ثناء پر برس کر نکالتی تھیں۔

* * *

اس شام بھی میں خالہ کے گھر پر تھی جب ثناء کی امی اور ممانی آئی ہوئی تھیں۔ ثناء کی چھوٹی بہن اس کی ممانی کے گھر بیاہی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بجائے صحن میں خالہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ثناء کچن میں چائے بنا رہی تھی۔

ثناء کی امی بار بار خود ہی خالہ کو مخاطب کرتیں اور کوئی نہ کوئی بات شروع کر دیتیں جبکہ خالہ بڑی بیزاری سے صرف ہوں ہاں کرتی جا رہی تھیں۔ پھر پتا نہیں کیا ہوا لیکن ثناء کی امی کی کسی بات پر خالہ نے ثناء کی برائیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔ اس کی امی کچھ گنگ سی ہو گئی تھیں۔ ثناء کی ممانی نے صورتحال کو قدرے بہتر کرنے کے لئے ثناء اور اس کی بہنوں کی تعریف کی تھی اور خالہ تو پھر جیسے پھٹ ہی پڑی تھیں۔

”اس بھی کوئی گن نہیں ہے اس میں۔ وہ ایک بدزبان، بے لحاظ اور بدتمیز لڑکی ہے۔ میری جگہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو اب تک اسے دھکے دے کر گھر سے نکال چکی ہوتی۔ ایک بچہ تک تو وہ پیدا کر نہیں سکی اور عمر کی شادی کو ساڑھے تین سال ہونے والے ہیں۔ یہ تو ہمارا حوصلہ ہے ہم پھر بھی اسے یہاں برداشت کر رہے ہیں ورنہ لوگ تو ایک سال میں ایسی عورت کو فارغ کر کے گھر بھیج دیتے ہیں۔ یہ تو عمر کا ہی دماغ خراب ہے جس

نے ، سے اب تک رکھا ہوا ہے ورنہ اسے اب بھی لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی ہے اسے۔"

میں سر جھکائے ایک طرف کرسی پر بیٹھی خالہ کی باتیں سن رہی تھی۔ ثناء کی امی اور ممانی بالکل گم صم بیٹھی تھیں۔ وہ ایک لفظ نہیں کہہ رہی تھیں۔ شاید انہیں خالہ سے یہ سب سننے کی توقع ہی نہیں تھی۔ کچھ دیر تک اسی حالت میں بیٹھے رہنے کے بعد وہ کچھ کہے بغیر اٹھیں اور چلی گئی تھیں۔ انہوں نے چائے بھی نہیں پی تھی۔

ثناء ان سب باتوں سے بے خبر نہیں رہی تھی۔ اس نے بھی یہ سب کچھ سن لیا تھا۔ اپنی امی اور ممانی کے سامنے وہ بالکل چپ رہی تھی لیکن ان کے جاتے ہی وہ تیر کی طرح خالہ کے پاس آئی تھی۔

"آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ آپ میری ماں سے میرے بارے میں ایسی باتیں کریں؟"

اس کی آواز نیچی تھی لیکن لہجہ تلخ تھا۔ پہلی دفعہ میں نے اسے خالہ سے اس انداز میں بولتے سنا تھا۔ خالہ اس کے سوال پر بھڑک اٹھی تھیں۔

"جو سچ ہے، وہ تو میں کہوں گی، چاہے کسی کو کڑوا لگے۔ تمہاری ماں سے بھی میں نے سچ ہی کہا ہے۔"

"تھوڑا سچ اپنے بارے میں بھی کہہ دیتیں۔" اس نے کافی بدتمیزی سے کہا تھا میں نے بڑی دلچسپی سے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا تھا۔

"تمہیں اگر اتنا خوف تھا تو پھر اپنی ماں کو یہاں بلایا کیوں؟ یہاں جو آئے گا، میں اسے تمہاری اصلیت تو ضرور بتاؤں گی۔"

"کیا اصلیت ہے میری؟ پہلے آپ مجھے تو بتائیں۔"

"مجھ سے فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس قسم کی زبان درازی تمہاری ماں برداشت کرتی ہوگی میں نہیں۔"

خالہ اس کی بات پر مزید گرم ہو گئی تھیں۔

"میری ماں نے مجھے یہی ایک چیز تو نہیں سکھائی، جس کی سزا میں آج تک بھگت رہی ہوں۔ میں نے آپ کی بہت عزت کرنے کی کوشش کی تھی مگر کچھ لوگ عزت کے قابل ہوتے ہی نہیں۔"

"تمہاری ماں عزت کے قابل ہے؟"

"میری ماں کے بارے میں بات نہ کریں۔ وہ دوسروں کی زندگیاں آپ کی طرح اجیرن نہیں کرتیں۔ آپ کی طرح لوگوں کے سامنے اپنی داستانیں لے کر نہیں بیٹھتیں۔"

اس کا ہر جملہ میری خوشی میں اضافہ کر رہا تھا تو خدا خدا کر کے یہ کفر ٹوٹ ہی گیا تھا۔

"کیوں نہ بتاؤں تمہارے بارے میں۔ لوگوں سے کیوں نہ کہوں کہ تم بانجھ ہو۔ تم نے اس گھر میں بربادی کے علاوہ اور دیا ہی کیا ہے۔"

خالہ یک دم چیخنے لگی تھیں۔

"مجھ سے اس قسم کی بات نہ کریں۔ میں اب برداشت نہیں کروں گی۔"

"برداشت نہیں کر سکتیں تو جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اپنی یہ منحوس شکل لے کر غائب ہو جاؤ پھر یہاں کھڑی کیوں ہو؟"

”میں کیوں جاؤں یہاں سے، یہ میرے شوہر کا گھر ہے، وہ لایا تھا مجھے یہاں پر۔ وہ کہے گا تو جاؤں گی آپ کے کہنے پر نہیں۔“

”یہ تمہارے شوہر کا نہیں، میرے شوہر کا گھر ہے، ان کے نام ہے تمہارے شوہر کی ابھی اتنی اوقات کہاں کہ ایک کمرہ بھی بنا سکے۔“

خالہ بھی اتنی ہی بلند آواز سے چلا رہی تھیں۔ میں نے اس موقع پر تھوڑا ڈراما ضروری سمجھا۔ میں نے خالہ کو چپ کروانے کی کوشش کی۔

”خالہ! آپ چھوڑیں، دفع کریں آپ کیوں اپنا دل دکھاتی ہیں۔“

میں نے خالہ سے کہا تھا اور وہ میری بات پر بھڑک اٹھی تھی۔

”یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے تم کون ہوتی ہو دخل اندازی کرنے والی۔ تمہیں کوئی حق ہی نہیں ہے درمیان میں بولنے کا، بلکہ تمہیں اس وقت یہاں ہونا بھی نہیں چاہیے۔ تم جاؤ یہاں سے یہ میرا اور ان کا معاملہ ہے تمہارا اور میرا نہیں۔“

اس نے بڑے ترش انداز میں اچانک مجھ سے کہا مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے یوں جھڑک دے گی۔

”یہ میری خالہ ہیں میں بھی ان سے بات کر رہی ہوں تم سے نہیں، اور تم مجھے اس گھر سے نہیں نکال سکتیں۔ یہ تمہارا نہیں میری خالہ کا گھر ہے۔“

میں نے بھی اسے اسی طرح جواب دیا تھا۔ وہ میری بات پر اور مشتعل ہو گئی تھی۔

”فساد کی جڑ تم ہی ہو۔ یہ سب باتیں تم ان کے کانوں میں ڈالتی ہو۔ اگر تم یہاں نہ آؤ تو اس گھر میں کوئی جھگڑا نہ ہو۔“

اس کی بات سن کر میری آنکھوں میں نمی آ گئی تھی (دل میں میں نے سوچا تھا کم بخت نے صحیح اندازہ لگایا ہے مگر بہت دیر سے) میں نے خالہ کی طرف دیکھا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے (مجھے اس کے لیے خاصی محنت کرنی پڑی تھی)

خالہ نے یک دم سے صلواتیں سنانا شروع کر دی تھیں مگر وہ بھی بڑی ثابت قدمی سے اپنے مطالبے پر جمی رہی کہ میں وہاں سے چلی جاؤں۔ ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ تب ہی اچانک عمر آ گیا تھا۔ اس کے لیے یہ منظر یقیناً حیران کن ہوگا۔ میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے بھی اسے یقیناً پریشان کیا ہوگا۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس نے کافی حیرانگی سے پوچھا تھا۔

”کچھ نہیں ہوا بس میں یہ چاہتی ہوں کہ شائلہ یہاں سے چلی جائے، اور دوبارہ یہاں کبھی نہ آئے۔“

وہ اس کی بات پر مزید حیران ہوا اور میں نے اپنے آنسوؤں کی رفتار میں اضافہ کر دیا تھا۔

”ثناء کہتی ہے کہ اس گھر میں سارے جھگڑے میری وجہ سے ہوتے ہیں میں فساد کی جڑ ہوں۔ مجھے یہاں سے نکال دینا چاہیے حالانکہ میں تو صرف خالہ کے لیے آتی ہوں۔“ ثناء کے بجائے میں نے اس سے کہا تھا۔

”ثنا! یہ سب تم نے کہا ہے؟“ اسے یقین نہیں آیا تھا شاید، اس لیے اس نے ثناء سے پوچھا تھا۔

”ہاں، میں نے کہا تھا اور میں پھر کہتی ہوں، اس سے کہو کہ ہمارے گھر سے چلی جائے۔“ وہ اب بھی پہلے ہی کی طرح بات کر رہی تھی۔

”احمقانہ باتیں مت کرو اور کمرے میں جاؤ۔“ اس نے اسے جھڑک کر کہا مگر ثناء پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی کسی قیمت پر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ پہلے اسے یہاں سے نکالو پھر میں یہاں سے جاؤں گی۔"

وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ اس کی بات پر خالہ نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا تھا، ثناء بھی چپ نہیں رہی تھی۔ خالہ جس قدر بلند آواز سے بول رہی تھیں وہ ان سے بھی بلند آواز میں بات کر رہی تھی۔ عمر کچھ دیر تک ان دونوں کو چپ کروانے کی کوشش کرتا رہا مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ جھنجھلا گیا اور اس نے بلند آواز میں ثناء سے کہا۔

"بس ثناء! اب چپ ہو جاؤ۔ میں تمہارے منہ سے مزید کچھ نہیں سننا چاہتا۔"

"میں چپ نہیں کروں گی۔" اس نے اب بھی اتنی بلند آواز میں کہا تھا اس کے لہجے میں عمر جیسے ٹھنڈے آدمی کو بھی مشتعل کر دیا تھا۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اپنی زبان بند کر لو۔" وہ چلایا تھا۔

"کیوں، میں ہی کیوں اپنی زبان بند رکھوں۔ تمہاری امی کیوں نہیں؟ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اتنے سال سے میں کیا کرتی آ رہی ہوں۔ خاموشی، خاموشی، بس خاموشی۔ کیا میں جانور ہوں۔ لیکن اب میں کچھ برداشت نہیں کروں گی۔ تم اگر مجھے چپ کروانا چاہتے ہو تو اس گھر میں شمائلہ کا آنا جانا بند کرو۔"

"شمائلہ یہاں بچپن سے آ رہی ہے، اب بھی آتی رہے گی۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

عمر نے تیز آواز میں اس سے کہا تھا اور خوشی کی ایک لہر میرے اندر دوڑ گئی۔

"ہاں۔ تم کیوں چاہو گے کہ وہ یہاں آنا بند کرے۔ تمہارے لیے ہی تو آتی ہے وہ۔"

اس کی بات پر وہ بے حد حیران نظر آیا پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا تھا۔

"ثناء! تمہارا ذہن بے حد گھٹیا ہے اور تمہاری سوچ اتنی ہی گندی ہے۔ میں نے تمہیں بہت غلط سمجھا تھا۔ تم بہت عام سی لڑکی ہو۔ تم میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا کہ میں تم سے شادی کرتا۔"

عمر کے کہے گئے ہر لفظ نے میرے کانوں میں مسرت گھول دیا تھا۔ مجھے ثناء کی آنکھوں میں بڑی بے یقینی نظر آئی۔ شاید اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب عمر نے کہا ہے کچھ دیر اسی طرح گم صم رہنے کے بعد اس نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا تھا۔

"میں گھٹیا نہیں تم گھٹیا ہو، یہ گھٹیا ہے، اور میں پھر کہوں گی، بار بار کہوں گی اسے یہاں سے نکالو اس سے کہو کہ یہ یہاں سے چلی جائے۔"

"یہ نہیں جائے گی۔ تم چلی جاؤ تم نکل جاؤ یہاں سے۔" وہ اس کی بات پر دھاڑا تھا۔

"تم مجھے یہاں سے جانے کو کہہ رہے ہو، اس کے لیے؟"

وہ میری طرف انگلی اٹھائے عجیب بے یقینی کے عالم میں اس سے کہہ رہی تھی۔

"ایک لفظ مت کہنا، اب ایک لفظ مت کہنا۔ بس یہاں سے چلی جاؤ، یہاں سے نکل جاؤ۔ میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔" عمر کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔ میں کبھی نہیں جاؤں گی۔ مجھے کیسے نکال سکتے ہو تم، کیسے کہہ سکتے ہو، مجھ سے کہ میں یہاں جاؤں۔ میں نے تمہارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں نے اس گھر کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ عمر حسن! میری وجہ سے تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو۔ میں سہارا نہ دیتی تو تم کہاں ہوتے۔ میں اگر...."

وہ اس سے کہہ رہی تھی مگر اس نے دانت پیستے ہوئے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"تم یہاں سے جاؤ تم میرے گھر سے نکل جاؤ۔"

میں نہیں جاؤں گی۔ کبھی نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا بھی گھر ہے اور میں تمہاری بیوی ہوں۔ مجھے تم نکال نہیں سکتے۔ اس طرح تو کبھی نہیں نکال...."

"تو پھر ٹھیک ہے پھر میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

"عمر نے جو کہا تھا، اس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ مجھے نہ خالہ کو نہ ثناء کو اور نہ ہی شاید عمر حسن کو۔ سب کچھ غصے میں ہوا تھا مگر سب کچھ ہو گیا تھا۔ مجھے لگا تھا جیسے کسی نے میرے وجود کی آگ کو ٹھنڈے پانی سے بجھا دیا تھا۔

خالہ کے چہرے پر بھی عجیب سا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ ہاں وہ... وہ عمر حسن کو بس دیکھتی جا رہی تھی۔

اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا مگر اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، بہو کی بے یقینی اور عمر حسن اب بھی سرخ آنکھوں اور سرخ چہرے کے ساتھ اس کے جانے کا منتظر تھا۔ میں بھی اب وہاں نہیں رہنا چاہتی تھی جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب اس ڈرامے سے میری Exit ہو جانی چاہیے تھی۔ میں اسی طرح بہتے آنسوؤں کے ساتھ چہرہ چھپاتی تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے گھر آ گئی تھی۔

بعد میں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہاں خالہ نے بتایا تھا کہ ثناء کچھ کہے اور کچھ لیے بغیر وہاں سے اسی خاموشی سے چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد عمر حسن بھی وہاں سے چلا گیا تھا اور پھر ساری رات واپس نہیں آیا تھا۔

اس نے دوسرے دن تحریری طور پر بھی اسے طلاق بھجوا دی تھی۔ اب ان دونوں کے درمیان مصالحت کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں لیکن ثناء کے گھر سے کوئی اس کا جہیز کا سامان لینے بھی نہیں آیا تھا۔ عمر ایک دن خود ہی ساری چیزیں اکٹھی کر کے ان کے گھر پہنچا آیا تھا۔ خالہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے ثناء کے ابو سے کہا تھا کہ جو چیزیں وہ بیچ چکا ہے اور جو روپیہ اس نے ثناء سے لیا تھا، وہ انہیں دو تین ماہ تک واپس کر دے گا۔

میرے راستے کی ہر رکاوٹ دور ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے کارڈز بڑی مہارت کے ساتھ کھیلے تھے۔ میں صرف خالہ کے گھر ہی نہیں روئی تھی، گھر آ کر بھی میں نے امی کو اسی طرح روتے ہوئے سب کچھ بتایا تھا کہ کس طرح ثناء نے مجھ پر عمر کے ساتھ تعلقات کا الزام لگایا ہے۔ میں نے اپنی طرف سے بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔

امی اور خالہ نے کوشش کی تھی کہ اس جھگڑے میں کہیں میرا ذکر نہ آئے لیکن میں چاہتی تھی، ایسا ہو۔ میں نے اپنی ہر کزن، ہر دوست کو یہ سب بتایا تھا کہ یہ طلاق میری وجہ سے ہونے والے جھگڑے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ ہر جگہ میرا نام عمر حسن کے نام کے ساتھ آئے ہم

دونوں کی بدنامی ہو اور پھر امی مجھے اس سے بیاہ دیں اور شاید اس سب کے بغیر عمر حسن بھی مجھ سے کبھی شادی نہ کرتا۔

ویسا ہی ہوا تھا جیسا میں نے چاہا تھا۔ دو تین ماہ میں پورا محلہ اور پورا خاندان ہمارے رشتے کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے لگا تھا۔ میں نے خالہ کے گھر جانا چھوڑ دیا۔ میں ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ شاہ کی وجہ سے میں بدنام ہو گئی ہوں۔ میری زندگی برباد ہو گئی ہے۔ خالہ بھی مجھ سے شرمندہ تھیں وہ جب بھی آتیں۔ ان کے سامنے میں پہروں روتی ان کے سامنے اپنی قسمت کی دہائیاں دیتی۔ ان کے دل کا بوجھ اور بڑھ جاتا۔ انہوں نے عمر حسن کی طرف سے بھی مجھ سے معافی مانگی تھی وہ شرمندہ تھا کہ اس کی بیوی کی وجہ سے میرے خلاف لوگوں میں اس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔

امی بڑی محنت سے دن رات میرے رشتے کی تلاش میں مصروف تھیں۔ دو تین جگہ انہوں نے میری بات طے کرنے کی کوشش کی اور جب بات طے ہونے لگی تو میں کسی نہ کسی طرح اس سارے معاملے کی خبر ان لوگوں تک پہنچا دیتی۔ نتیجہ ان کے انکار کی صورت میں ہوتا میرے ماں باپ اس صورت حال سے بے حد پریشان تھے لیکن میں نہیں تھی۔

پھر میں نے امی سے کہہ دیا تھا کہ میں بدنام تو اس کے ساتھ ہو چکی ہوں بہتر ہے کہ وہ وہیں میری شادی کر دیں۔ شروع میں امی کو میری اس بات پر شاک لگا اور انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے ان سے کہا کہ اگر کہیں اور میری شادی ہو بھی گئی اور بعد میں ان لوگوں کو اس معاملے کے بارے میں پتا چلا تو کیا ہوگا میری زندگی تو ایک بار پھر خراب ہو جائے گی۔

امی میری اس بات پر سوچنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ انہوں نے خالہ سے بات کی تھی وہ تو پہلے ہی تیار تھیں عمر حسن شادی پر رضا مند نہیں تھا لیکن میرے ماں باپ اور خالہ اور خالو نے پتا نہیں اسے کیا کیا واسطے دیئے۔ کیا کیا دلیلیں دیں کہ وہ مجبور ہو گیا تھا۔

* * *

شاہ کو طلاق دینے کے پورے ساڑھے چار ماہ کے بعد اس سے میری شادی ہو گئی اور شادی بے حد دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ خالہ نے اپنے سارے ارمان نکالے تھے اور ہمارے گھر کی بھی یہ پہلی شادی تھی۔ عمر حسن میرا کیا ہوا تھا، مجھے لگا تھا دنیا میری ہو گئی ہے۔ کسی نے محبت میں اتنے صبر آزما لمحات نہیں گزارے ہوں گے جتنے میں نے گزارے تھے۔ کسی نے کسی کو پانے کے لیے اتنی دعائیں نہیں کی ہوں گی جتنی میں نے کی تھیں، اور میں نے اسے پا ہی لیا تھا۔ وہ شادی پر بجھا بجھا تھا۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس نے شادی کی رات کو مجھ سے معافی مانگی تھی کہ اس کے اور شاہ کے جھگڑے کی وجہ سے مجھے اتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔

میرا دل چاہا میں اس سے کہوں کہ مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی جو واحد پریشانی تھی، وہ ساڑھے چار ماہ پہلے جا چکی تھی۔ مگر میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ میں بے حد خوش تھی۔ بہت مسرور تھی۔ اس کے کمرے میں سونے کے خواب پتا نہیں میں نے کب سے دیکھنے شروع کیے تھے، اور میں وہاں آ ہی گئی تھی۔ اس کی بیوی بن کر۔

لوگوں کا عشق شادی کے بعد ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے، میرا اور بڑھنے لگا تھا۔ میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں خود کو اس کے قدموں میں بچھا دوں۔ میں اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی، وہ اگر دن کو رات کہتا تو میں بھی رات ہی کہتی۔ بس میں یہ چاہتی تھی کہ اسے کبھی بھی ایک لمحے کے

لیے بھی ثناء یاد نہ آئے وہ اس کے بارے میں نہ سوچے۔ وہ کہیں میرا اور اس کا موازنہ نہ کرنے لگے۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی۔

میں اس کے معاملے میں جتنی پرجوش ہوتی گئی وہ اتنا ہی سرد ہوتا گیا۔ کزن کی حیثیت سے وہ مجھ سے جتنی باتیں کیا کرتا تھا، اب اتنی گفتگو بھی نہیں کرتا تھا۔ بس خاموش رہتا تھا اس کی خاموشی سے میرا دل ڈوبنے لگتا۔ عجیب طرح کے وہم میرے دل میں آنے لگتے تھے۔ کہیں یہ ثناء کے بارے میں تو نہیں سوچ رہا، کہیں اسے وہ یاد تو نہیں آ رہی۔ میں سوچتی اور مجھے ہول اٹھنے لگتے۔

میں نے اس گھر سے ثناء کی ہر نشانی ختم کر دی تھی۔ اپنے بیڈروم کے کلر سکیم بدلوا دی تھی گھر کے ہر کمرے کی ڈیکوریشن بدل دی تھی۔ ہر وہ چیز جس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ یہ ثناء خرید کر لائی تھی وہ میں نے اٹھا کر بیچ دی تھی یا پھینک دی تھی۔

میری شادی کو چھ سات ماہ گزرے تھے، جب مجھے پتا چلا تھا کہ ثناء کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ اس خبر نے میرے دل کو ایک عجیب سا سکون دیا تھا، ایک عجیب سے تحفظ اور خوشی کا احساس ہوا تھا مجھے۔ میں کسی کا بھی برا نہیں چاہتی تھی۔ میں ثناء کا برا بھی کبھی نہیں چاہتی لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ عمر حسن کی زندگی میں آ گئی تھی جو میری زندگی تھا اور اب جب وہ اس کی زندگی سے نکل گئی تھی تو مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اس کی بھی کسی اچھی جگہ شادی ہو جائے اور وہ بھی خوش رہے اور اب اس کی شادی کی خبر نے مجھے پرسکون کر دیا تھا۔

بہت دنوں تک میں عمر حسن کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتی رہی میں اس کے چہرے پر پتا نہیں کیا ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ثناء کی شادی سے کہیں وہ پریشان تو نہیں مگر میں اس کے چہرے پر کچھ بھی تلاش نہیں کر پائی وہ ویسا ہی تھا جیسے پہلے تھا۔ افسردہ، خاموش۔ کسی تیسرے حس کا ظہور نہیں تھا نہ چہرے پر نہ باتوں میں۔ میں مطمئن ہو گئی تھی۔

"سب کو ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" میں خود کو تسلیاں دیتی رہتی۔

⁂

جب سے میں عمر کے گھر آئی تھی، اس کا کاروبار پھیلتا ہی گیا تھا۔ روپیہ بارش کی طرح ہم پر برس رہا تھا۔ خالہ ہر ایک سے کہتیں کہ میں ان کے گھر کے لیے بہت خوش قسمت ثابت ہوئی ہوں۔ میری وجہ سے گھر میں روپیہ آ رہا ہے، میری وجہ سے کاروبار ترقی کر رہا ہے۔ میں ان کی باتوں پر بے حد مسرور ہوتی۔

مجھے بے حد فخر ہوتا۔

"ہاں یہ سب میری وجہ سے ہی ہے۔ میں یہاں نہیں تھی تو یہاں کیا تھا مگر اب میں ہوں تو جیسے سب کچھ ہے۔"

میں دل ہی دل میں سوچتی۔ ورنہ یہ کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس کا کاروبار دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ اس کا ثبوت وہ بڑی بڑی رقوم تھیں جو وہ مجھے اور خالہ کو خرچ کرنے کے لیے دیا کرتا تھا، کم از کم اس معاملے میں مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

شادی کے بعد اس نے کبھی مجھے کسی چیز کی تنگی کا شکار نہیں ہونے دیا تھا۔ مجھے شروع سے ہی روپیہ پانی کی طرح بہانے کی عادت تھی اور میری یہ عادت شادی کے بعد بھی قائم رہی، وہ مجھے جتنے روپے دیتا، میں ایک بار شاپنگ پر جاتی اور خرچ کر آتی۔ پھر میں اسے اور روپے مانگتی اور وہ ایک لفظ کہے بغیر میرا مطالبہ پورا کر دیتا۔

اس نے کبھی مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ میں اتنے روپوں کا کیا کرتی ہوں میں خود ہی اپنا ہر نیا سوٹ، ہر نیا زیور بڑے شوق سے اسے دکھاتی اور وہ کسی دلچسپی کے بغیر اسے دیکھتا اور میرے پوچھنے پر سرسری انداز میں تعریف کر دیتا۔ میرے لیے یہ بھی کافی تھا۔

میں ہر وقت خود کو سجا سنوار کر رکھتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ عمر حسن کو سادگی پسند ہے اسے زیادہ میک اپ اور بھاری بھرکم بھڑکیلے لباس پسند نہیں ہیں۔ لیکن یہ سب مجھے پسند تھا اور خالہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ میں خوبصورت ہوں اور مجھے بن سنور کر رہنا چاہیے، اس طرح میں اس کے دل میں اپنی جگہ بنا لوں گی۔

عمر نے بھی کبھی مجھے اس سے نہیں روکا نہ ہی اس نے کبھی مجھ سے کہا کہ اسے یہ سب پسند نہیں ہے، بس وہ مجھے سراہتا نہیں تھا مگر میں خود ہی اس سے پوچھتی رہتی کہ میں کیسی لگ رہی ہوں اور وہ کہہ دیتا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" اور میں اس کی بات پر جیسے ہواؤں میں اڑنے لگتی۔

ان دنوں زندگی بے حد خوبصورت تھی۔ میں ماں بننے والی تھی اور مجھے یقین تھا کہ میرا بچہ عمر کو بھی بدل دے گا۔ اس کی خاموشی توڑ دے گا۔ میرے ہاں شادی کے ڈیڑھ سال بعد بیٹی پیدا ہوئی لیکن عمر کی خاموشی نہیں ٹوٹی۔ وہ بیٹی سے محبت کرتا تھا۔ اسے بے تحاشا چیزیں لا کر دیتا تھا۔ اسے گود میں بھی اٹھا لیتا لیکن پھر بھی وہ افسردگی ختم نہیں ہوتی تھی جس نے اس کے وجود کو گھیرا ہوا تھا۔ مگر اب میں مطمئن تھی۔ میری پوزیشن اولاد ہونے کے بعد بہت مضبوط ہو چکی تھی۔

مجھے اب کوئی اس گھر سے شاء کی طرح نہیں نکال سکتا تھا۔ عمر ویسے بھی اب بہت مصروف رہنے لگا تھا کیونکہ وہ فیکٹری بنوا رہا تھا۔ اس کے پاس فرصت اب بہت کم ہی ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ خالہ سے بھی میرے تعلقات اب اتنے خوشگوار نہیں رہے تھے۔ کچھ عرصے

تک تو انہوں نے میرے بڑے ناز اور لاڈ اٹھائے تھے مگر پھر انہیں میری بہت سی باتوں پر اعتراض ہونے لگا تھا۔

میں بازاروں میں بہت جاتی ہوں، میں گھر کے معاملات میں ان کی رائے نہیں لیتی۔ میں کہیں جانے سے پہلے ان سے اجازت نہیں لیتی، میں اپنے گھر اتنے چکر کیوں لگاتی ہوں، میں بہت فضول خرچ ہوں، میں گھر کے کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتی، میرے مزاج آسمان پر رہتے ہیں، میں نے عمر کو ان سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ وہ ان کے پاس آ کر بیٹھتا ہی نہیں۔

کوئی ایک شکایت نہیں تھی، انہیں مجھ سے۔ نہیں تو بس شروع سے بولنے کی عادت تھی، یہ عادت اب کیسے چھوٹ جاتی مگر میں کوئی شاہ نہیں تھی جو زبان پر ٹیپ لگا کر پھرتی پھر جب میرے شوہر کو میری کسی بات پر اعتراض نہیں تھا تو وہ اعتراض کرنے والی کون ہوتی تھیں۔ عمر کو میں نے ان سے جدا نہیں کیا تھا وہ خود ان کے پاس نہیں بیٹھتا تھا پھر میں اسے کیسے پکڑ پکڑ کر ان کے پاس بٹھاتی اور یہ اچھا ہی تھا۔ ان کے پاس بیٹھ کر اس نے کیا سننا تھا، میری شکایتیں۔

ایک دو بار خالہ سے میرا بہت زیادہ جھگڑا بھی ہوا تھا اور خالہ نے جب عمر سے اس بارے میں شکایت کی تو اس نے بڑی تلخی سے ان سے کہا تھا وہ آئندہ میرے بارے میں اس سے کوئی شکایت کریں نہ ہی وہ ایک لفظ سنے گا۔ خالہ اس کی بات پر جیسے شاک میں آ گئی تھیں۔ مگر مجھے بے حد فخر ہوا تھا خود پر اور عمر پر۔ اس کے دل میں میرے لئے کچھ تھا تب ہی تو اس نے میری طرف داری کی تھی۔ اس سے میری محبت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

* * *

ہماری شادی کو تین سال ہوئے تھے اور پتا نہیں کیوں لیکن یک دم عمر کے رویے میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔ بعض دفعہ رات کو میری آنکھ کھلتی تو وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا ہوتا۔ میں نے اس کی پریشانی کی وجہ جاننے کی کوشش کی تھی مگر وہ خاموش ہی رہا تھا بلکہ کافی بے رخی سے ساتھ مجھے جھڑک دیتا تھا۔ ان دنوں وہ ارم سے بھی کھنچا رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ کسی کاروباری مسئلے کی وجہ سے پریشان تھا۔ مگر اب کاروبار اتنا پھیل چکا تھا کہ میں کم از کم یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ پہلے جیسے حالات لوٹ آئیں گے۔

اس کی یہ کیفیت دو تین ماہ رہی تھی۔ وہ زیادہ وقت گھر میں گزارتا نہ ہی مجھ سے بات کرتا اور اگر میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ میں اگر کبھی اس کے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیتی تو وہ یوں میرا ہاتھ جھٹکتا جیسے میں کوئی غلیظ چیز ہوں۔ اس نے ان دو تین ماہ میں ایک بار بھی ارم کو نہیں اٹھایا نہ ہی اس کے پاس گیا۔ میں اس کے رویے سے بے حد پریشان تھی۔

ان دنوں ایک بار پھر میں نے خلوص نیت سے خدا سے اس کے ٹھیک ہو جانے کی دعا کی تھی اور ایک بار پھر میری دعا قبول ہو گئی تھی۔ دو تین ماہ تک اسی طرح رہنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو گیا تھا اور صرف ٹھیک نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے چہرے کی مسکراہٹ بھی لوٹ آئی تھی۔ شادی کے تین سال بعد وہ اس افسردگی سے باہر نکل آیا تھا۔ شاہ کا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ اور میں   میں اس کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

اب وہ اکثر مجھ سے بات کیا کرتا۔ کبھی مجھے کوئی گفٹ بھی لا دیتا، کبھی اپنے ساتھ کہیں گھمانے بھی لے جاتا۔ ارم سے بھی پہلے سے زیادہ

محبت کرنے لگا۔ ہاں خالہ کے ساتھ اس کا رویہ ویسا ہی تھا۔ ان کے ساتھ وہ اب بھی کھنچا کھنچا ہی رہتا تھا بہر حال وہ کھڑے کھڑے انہیں کچھ رقم تھما دیتا۔ ان کا حال احوال پوچھتا اور چلا جاتا۔

خالہ بعد میں بولتی رہتیں لیکن کوئی ان کی نہیں سنتا تھا۔

◆

وقت آہستہ آہستہ گزرتا جا رہا تھا۔ ہماری شادی کو دس سال گزر گئے تھے ان دس سالوں میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ میرے ہاں ایک اور بچی ہوئی تھی۔ اور اس بچی کی پیدائش پر عمر حسن نے کہا تھا کہ اب وہ مزید کوئی بچہ نہیں چاہتا۔ مجھے بیٹے کی بے پناہ خواہش تھی اور میں نے بہت اصرار کیا تھا کہ کم از کم ایک بیٹا ضرور ہونا چاہئے مگر اس نے بڑی سختی سے میرے اس مطالبے کو رد کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ دو بچے کافی ہیں، وہ ان ہی کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہے۔ دو سے زیادہ بچوں کو وہ وقت نہیں دے سکتا اور بیٹے اور بیٹیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا بس اولاد اچھی ہونی چاہئے۔

مجھے اس کی باتوں پر خوشی اور حوصلہ ہوا تھا کہ اس کے نزدیک بیٹیاں بھی بیٹوں کے برابر ہیں لیکن میرے دل میں پھر بھی بیٹے کا ملال ضرور تھا۔ مجھے اس کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ آخر اتنا بڑا کاروبار کل کون سنبھالتا۔ عمر کو اس کی بھی فکر نہیں تھی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ بزنس میں لگایا ہوا تھا۔

اور یقیناً وہ سوچتا ہوگا کہ انصر اس کے بعد کاروبار سنبھال سکتا ہے لیکن میں اپنے دل میں کچھ اور منصوبے رکھتی تھی۔ اگر بیٹا نہیں تو پھر میرے دامادوں کو ہی یہ کاروبار سنبھالنا چاہئے۔ میں نے اپنے دل میں طے کر رکھا تھا۔ بزنس تھا کہ وہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ پہلے ایک فیکٹری تھی اب تین فیکٹریاں تھیں اور عمر اب بھی پاگلوں کی طرح رات دن بزنس میں لگا رہتا۔ مہینے میں ایک بار ضرور یا تو اسے کراچی جانا پڑتا یا پھر بیرون ملک، اور ہر دفعہ واپسی پر کوئی نہ کوئی نیا کانٹریکٹ ضرور اس کے ساتھ ہوتا۔

میں اس بڑھتے ہوئے بزنس پر بے پناہ خوش تھی۔ اس لئے میں نے کبھی گھر میں کم وقت دینے پر اس پر اعتراض نہیں کیا۔ وہ سب کچھ میرے گھر کے لئے ہی کر رہا تھا۔ میرے بچوں کے لئے کر رہا تھا۔ میرے لئے کر رہا تھا۔ میں جانتی تھی پھر مجھے اعتراض کیوں ہوتا۔ ان دس سالوں میں وہ اپنی سب سے چھوٹی بہن کی شادی کر چکا تھا۔ انصر کی بھی شادی ہو چکی تھی۔

شادی کے چھٹے سال ایک حادثے میں چچا کا انتقال ہو گیا تھا۔ اگلے ہی سال ہم اپنے نئے گھر میں منتقل ہو گئے تھے خالہ کو ہم ساتھ نہیں لائے وہ خود بھی آنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ انصر اور اس کی بیوی کے ساتھ اسی پرانے گھر میں تھیں۔ اب ان کا سارا طنطنہ ختم ہو چکا تھا وہ بے حد خاموش رہنے لگی تھیں اور گوشہ نشین ہو گئی تھیں۔

سارا دن وہ اپنے کمرے کے ایک کونے میں تسبیح لئے بیٹھی رہتیں اس عمر میں آ کر سب ایسے ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ کسی کو پتا نہیں چلتا کہ اس خاموشی سے پہلے لوگوں نے کیسے کیسے طوفان برپا کئے ہوئے تھے۔ ساری عمر خالہ نے بھی اپنی زبان سے لوگوں کو نشتر کی طرح کاٹا تھا اور اب انہیں اپنی آخرت کا احساس ہوتا ہوگا۔

میں جب بھی خود کو دیکھتی مجھے یہی خیال آتا تھا۔ کبھی کبھی جب میں پچھلے دس سال کے بارے میں سوچنے بیٹھتی تو مجھے خیال آتا کہ عمر حسن کو جیتنے کے لیے میں نے کیسی جنگ لڑی تھی۔ کون سا جتن تھا جو میں نے نہیں کیا تھا۔ کون سا حربہ تھا جو نہیں آزمایا تھا۔ لیکن اس کا حصول میرے لیے خسارے کا سودا ثابت نہیں ہوا تھا۔ مانتی ہوں میں نے کچھ ناجائز کام بھی کیے تھے لیکن محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ عمر حسن میری محبت تھا اور ثناء سے میری جنگ تھی پھر میں نے وہی کیا جو جائز تھا۔ کم از کم میری نظر میں اور کیا ہوا تھا، کس کا گھر تباہ ہوا تھا، سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔

عمر کا گھر تباہ ہوا، مگر اس کی شادی مجھ سے ہو گئی اور آج وہ بے حد خوش ہے۔ کون سی چیز ہے جو اس کے پاس نہیں ہے۔ ثناء کا گھر برباد ہوا مگر اس کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ بھی اپنے گھر خوش ہو گی۔ میری خواہش عمر حسن تھا۔ مجھے بھی وہ مل گیا۔ میری زندگی بھی برباد ہونے سے بچ گئی۔

”بعض دفعہ ایک گھر توڑنے سے بہت سی زندگیاں سنور جاتی ہیں۔“ میں اکثر سوچا کرتی۔

⁂

زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ میری شادی کو سترہ سال ہونے والے تھے۔ ہم تین سال پہلے ایک بار پھر پہلے سے بڑے گھر میں شفٹ ہوئے تھے۔ زندگی بے حد پرسکون تھی۔ میری بیٹیاں بڑی ہو گئی تھیں اور عمر نے انہیں شہر کے بہترین سکول میں داخل کروایا ہوا تھا۔ وہ ان کی تعلیم کے بارے میں شروع سے ہی بہت دلچسپی لیتا تھا۔ مجھے ان کے بارے میں کبھی بھی زیادہ فکر کرنی نہیں پڑی۔ ویسے بھی مجھے خود تو تعلیم میں کوئی دلچسپی تھی نہ ہی میں اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد کر سکتی تھی کیونکہ میں خود صرف مشکل سے ایف اے ہی کر سکی تھی۔ اس لیے ان کی تعلیم کا مسئلہ میں نے عمر کے لیے ہی چھوڑا تھا۔ وہ خود تو انہیں نہیں پڑھاتا تھا مگر اس نے ان کے لیے بہت مہنگے اور بہترین ٹیوٹر لگوا رکھے تھے اس کے پاس ان کو پڑھانے کے لیے وقت ہوتا بھی کہاں۔

پچھلے سترہ سالوں میں اس نے کاروبار کو اتنا پھیلا لیا تھا کہ اب وہ چاہتا بھی تو اس سے جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔ انصر بھی بے حد مصروف رہتا تھا۔ عمر پہلے کی نسبت اب زیادہ دنوں کے لیے گھر سے غائب رہتا تھا۔ ہاں اب بعض دفعہ مجھے اس کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔

وہ کبھی بھی کسی فنکشن پر ہمارے ساتھ جانے کے لیے وقت نہیں نکال سکتا تھا اور نہ ہی وہ کبھی مجھے یا بچوں کو اپنے ساتھ کسی فنکشن میں لے کر گیا تھا بلکہ اس کے دوست بھی کبھی ہمارے گھر نہیں آتے تھے، نہ ان سے ہمارا ملنا جلنا تھا۔ جب بھی اسے کبھی کسی فنکشن کی دعوت آتی تو یا تو وہ ہمیں بتاتا ہی نا اور اگر کبھی بتا دیتا اور میں ساتھ جانے کی فرمائش کرتی تو وہ لے جانے سے انکار کر دیتا۔ مجھے یہ لگتا کہ شاید اسے پسند نہیں ہے کہ میں اس کے ساتھ اس قسم کی گیٹ ٹوگیدرز میں جاؤں۔ اس لیے میں زیادہ اصرار نہیں کرتی تھی۔ مگر گرمیوں کی چھٹیوں میں بھی جب بچے بہت اصرار کرتے تو بھی وہ ہم لوگوں کو کبھی اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لیے کسی تفریحی مقام پر نہیں لے جا سکا۔

گرمیوں میں اس کے اپنے بیرون ملک کے ٹورز آ جاتے تھے۔ وہ ہمیں کہیں جانے سے نہیں روکتا تھا بلکہ ہمارے جانے کے پورے انتظامات کروا دیا کرتا تھا اور انصر کی فیملی کے ساتھ ہمیں کہیں نہ کہیں بھجوا دیا کرتا تھا لیکن پھر بھی میرا دل چاہتا کہ وہ ساتھ ہو، کچھ دنوں کے لیے ہم تنہائی میں بیٹھ کر کچھ اچھی باتیں کرتے، جہاں اس کی کوئی مصروفیت آڑے نہ آئے۔ مگر اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا بعض دفعہ میں جذباتی ہو کر اسے ایسی بات کہتی تو وہ بڑی غیر دلچسپی سے کہتا۔

”دیکھو شائلہ! میں بہت پریکٹیکل آدمی ہوں یہ رومانس وغیرہ نہیں کرسکتا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور نہ ہی یہ رومانس کی عمر ہے، ہماری بچیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ اب ہمیں اپنی خواہشات کے بجائے ان کی خواہشات کے بارے میں سوچنا چاہئے۔“

میرا دل چاہتا، میں اس سے کہوں کہ اس عمر میں کیا، ہم نے تو کسی بھی عمر میں رومانس نہیں کیا۔ اس کے پاس ہمیشہ وقت کم ہوتا تھا۔ اس کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی کام ہوتا تھا، بعض دفعہ میرا دل چاہتا میں اس سے پوچھوں کہ تم نے شاہ سے رومانس کیسے کیا تھا۔ کیا تب تم پریکٹیکل آدمی نہیں تھے؟ مگر میں بس چپ ہو جاتی۔

◆

پھر اچانک میری زندگی میں ایک طوفان آگیا تھا۔ میں کبھی اس کی فیکٹری گئی تھی نہ آفس لیکن اس دن شاپنگ سے واپسی پر قائداعظم روڈ سے گزرتے ہوئے میری گاڑی کا ٹائر پنکچر ہوگیا۔ ڈگی میں دوسرا ٹائر بھی نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ قائداعظم روڈ پر ہماری فرم کا ہیڈ آفس ہے، میں نے سوچا کہ میں وہاں چلی جاتی ہوں اور اگر وہ وہاں ہوا تو وہ اپنے ڈرائیور کو کہہ کر مجھے گھر ڈراپ کروا دے گا۔ میرے ڈرائیور کو بھی اس آفس کا پتا تھا اور جہاں میری گاڑی پنکچر ہوئی تھی، وہاں سے کچھ فاصلے پر ہی وہ آفس تھا۔ ڈرائیور مجھے وہاں تک چھوڑ گیا۔

میں آفس کے اندر چلی گئی تھی۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ریسپشنسٹ سے میں نے اپنا تعارف کروایا تھا وہ حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگی تھی۔ مجھے اس کی حیرانی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے عمر کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ آفس میں نہیں ہیں، اس پر میں نے اس سے کہا کہ وہ آفس کی کسی گاڑی پر مجھے گھر ڈراپ کروانے کا انتظام کرے۔ وہ میرے مطالبے پر عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

”دیکھیں، یہ تو میں جانتی ہوں کہ آپ مسز عمر نہیں ہیں لیکن آپ کون ہیں؟ یہ میں نہیں جانتی۔ نہ ہی یہ جانتی ہوں کہ آپ غلطی سے یہاں آئی ہیں یا کسی نے آپ کو بھیجا ہے۔“ مجھے اس کی بات پر غصہ آگیا تھا۔

”کیا سمجھ رہی ہو تم مجھے؟ کیا خیال ہے تمہارا کہ میں کون ہوں؟“

”میں مسز عمر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ عمر صاحب کو کئی بار لنچ پر لینے آتی ہیں اور ویسے بھی کبھی کبھار آتی رہتی ہیں اور آپ مسز عمر نہیں ہیں۔“

اس کی بات مجھے بم کے دھماکے جیسی لگی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی نے مجھے چار سو چالیس وولٹ کا شاک دیا ہو۔

”او خدایا کیا کہہ رہی ہے؟“ میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔

”عمر! اتم۔“ میں آگے کچھ نہیں سوچ سکی۔ میرے تاثرات سے بے خبر وہ کہہ رہی تھی۔

”اگر آپ مسز عمر ہیں تو آپ کو اپنے گھر کا علم ہونا چاہئے آپ اپنے گھر کا ایڈریس بتا دیں؟“

میں نے عجیب سی کیفیت میں اپنے گھر کا ایڈریس دہرا دیا۔ اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔

”لیکن عمر حسن صاحب کے گھر کا ایڈریس 104 ڈی بلاک، ماڈل ٹاؤن ہے۔ گلبرگ میں ان کے بھائی کا گھر ضرور ہے مگر اس کا ایڈریس بھی وہ نہیں جو آپ بتا رہی ہیں۔ آپ کوئی بہت بڑی فراڈ۔“

میں نے اس کی بات پوری سننا گوارا نہیں کیا تھا۔ تیز قدموں سے میں آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ میں بے حد طیش میں اس جگہ پر آئی

جہاں میری گاڑی تھی۔ گاڑی اب بھی وہیں تھی لیکن ڈرائیور نہیں تھا شاید وہ پاس کے کسی دکان سے کسی آدمی کو لینے گیا تھا۔ میں وہیں کھڑی اس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ گاڑی کا ٹائر، اتار کر پاس ہی کہیں پنکچر لگوانے گیا تھا۔ جب وہ آیا تو میں نے اسے گھر کے بجائے ماڈل ٹاؤن کا ایڈریس بتا کر وہاں چلنے کے لئے کہا۔

وہ مجھے مطلوبہ گھر کے سامنے لے آیا تھا۔ اس گھر کے سامنے میرا گھر ایک جھونپڑی تھا۔ وہ گھر بلاشبہ خوبصورتی کا شاہکار تھا۔

''عمر حسن! میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔''

میں نے اپنے دل میں عزم کیا تھا۔ میں اس گھر کے اندر چلی گئی تھی میرا وجود جیسے آگ میں جل رہا تھا۔ میں چاہ رہی تھی میں اس گھر اور اس کی ہر چیز کو آگ لگا دوں۔ پھر وہ بچہ میرے سامنے آیا تھا اور میرا دل چاہا میں اپنے بال نوچنے لگوں۔ اپنے کپڑے پھاڑ دوں اس بچے کے ٹکڑے کر دوں۔

''عمر حسن! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' میرا دل لہو ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بھی خون اترا ہوا تھا۔

اور پھر میں نے اسے دیکھا تھا مسز عمر کو، اس عورت کو جس نے میرے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا، جس نے میرا گھر برباد کر دیا تھا۔ وہ چہرہ شناسا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور یوں لگا جیسے کسی نے میرے جلتے ہوئے وجود کو ایک برفیلی قبر میں دفن کر دیا ہو۔

ہاں وہ ثناء تھی۔ وہی ثناء جس سے میں نے عمر حسن کو چھینا تھا۔ میں کچھ بول سکی نہ کچھ سوچ سکی۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا سکون تھا۔ مجھے لگا جیسے اس کی آنکھیں مجھ پر ہنس رہی ہوں۔ اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ تھاما اور اندر چلی گئی میں بھاگتی ہوئی باہر آ گئی۔

سترہ سال میں پہلی بار میں دل سے روئی تھی اور اتنا روئی تھی کہ شاید کبھی کوئی نہیں روئے گا۔ میں جہاں سترہ سال پہلے تھی، اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ سترہ سال میں نے خود کو فریب دے دے کر گزارے تھے اور مجھے پتا ہی نہیں کہ عمر حسن سراب ہے۔ نہ وہ سترہ سال پہلے میرا تھا نہ اب میرا ہے۔ میں اپنا کمرہ بند کر کے سارا دن ماتم کرتی رہی تھی اور مجھے اب کرنا ہی کیا تھا۔

وہ رات کو گھر آیا تھا۔ اسے کچھ کہنے، اسے کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ پہلے ہی باعلم تھا اور بے حد پرسکون تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ میرے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

''میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی۔ نہ پہلے کبھی، نہ آج، نہ ہی آئندہ کروں گا، میں تم سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ تم سے میرا رشتہ محبت کا رشتہ ہے نہ ضرورت کا۔ صرف مجبوری کا رشتہ ہے۔''

وہ بڑے سکون سے میرے کانوں میں صور پھونک رہا تھا۔

سترہ سالوں میں پہلی بار وہ اس طرح روبرو مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے سب کچھ کہا تھا، سب کچھ۔ مجھے خواہش تھی کہ وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرے۔ اس نے آج میری وہ خواہش پوری کر دی تھی۔

''عمر! میں نے تم سے محبت کی تھی۔ تمہارے لئے قربانی دی تھی۔ تمہارا گھر بسایا تھا۔''

میں نے اس سے کہا تھا۔ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ بڑی بے رخی سے مسکرایا تھا۔

''یہ سب تمہاری خواہش تھی۔ میری نہیں۔ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھ سے محبت کرو۔ میں نے نہیں کہا تھا کہ میرا گھر بناؤ اور کون سی

قربانی دی ہے تم نے میرے لئے۔ کوئی قربانی نہیں دی تم نے۔ قربانی ثناء نے دی تھی۔ ایک دو نہیں بہت سی اور اب تک دیتی آ رہی ہے۔ یہ وہ تھی جو میرے لئے بڑے گھر کو چھوڑ کر آئی تھی۔ یہ وہ تھی جس نے مجھ سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ یہ وہی تھی جس نے میری کنگالی کے دنوں میں مجھے اور میرے گھر کو سپورٹ کیا۔ یہ وہ تھی جس نے میری ماں کی ہر غلط و رناجائز بات کو برداشت کیا۔ تمہیں برداشت کیا۔ یہ وہ تھی جس نے اپنا پورا زیور میری بہن کی شادی کے لئے بیچ دیا۔ قربانی اگر کسی نے دی تو اس نے دی، تم نے نہیں۔ تمہیں تو سب کچھ ملا۔ بتاؤ کیا نہیں ملا تمہیں؟ شادی کے بعد سے کون سی خواہش تمہاری پوری نہیں ہوئی؟ میں نے تمہیں سب کچھ دیا۔ سب کچھ تاکہ تم کبھی مجھ پر کوئی احسان نہ جتا سکو۔ مجھ پر اگر کسی کے احسان ہیں تو ثناء کے اور ایسا کوئی نہیں ہے جس کے احسان کا بدلہ میں نہ دے سکوں۔“

اس نے مجھے آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔

”شائلہ! میں سب کچھ جان گیا تھا۔ تمہاری ورامی کی اصلیت دیر سے سہی مگر میں پہچان گیا تھا۔ تم نے پوری پلاننگ سے میرا گھر برباد کیا تھا۔ میں تب سوچتا تھا کہ تم صرف امی کے لئے آئی ہو مگر ثناء ٹھیک کہتی تھی، تم امی کے لئے نہیں اس گھر کو برباد کرنے کے لئے آئی تھیں۔ بہت ہنگامہ مچایا تھا تم نے کہ ثناء نے تمہیں بدنام کر دیا ہے۔ اب کوئی تم سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہے۔ نہیں شائلہ! تمہیں بدنام ہونے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ تم بہت خوش تھیں کیونکہ تم یہی چاہتی تھیں کہ تم بدنام ہو اور میں مجبور ہو کر تم سے شادی کروں۔“

”یا اللہ کیا ہر انکشاف آج ہی ہوگا۔“ میں نے کرب سے آنکھیں بند کر لی تھیں مگر وہ آواز بند نہیں ہوئی۔

”تمہارا اولہڑ پن، تمہاری بے تکلفیاں، تمہارے انداز، تمہاری باتوں ہر چیز نے ثناء کے شبے کی تصدیق کی تھی۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھیں اور اس کے لئے جو چاہا تم نے کیا۔ میں جان گیا تھا۔ میں تمہیں جان گیا تھا۔ تمہارے اندر کیا تھا۔ مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں رہا لیکن میرے پاس تم سے جان چھڑانے کا کوئی رستہ نہیں تھا۔ مجھے ثناء سے صرف دو دن کے لئے نفرت ہوئی تھی، صرف دو دن کے لئے اور اس دو دن نے میرے اور اس کے درمیان اتنی دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ جنہیں پار کرنے میں مجھے تین سال لگ گئے۔ میرے غصے، میری جلد بازی، میری حماقت نے ڈھائی سال تک اسے ایک جہنم میں رہنے پر مجبور کیا تھا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا تھا۔ تمہاری وجہ سے میں نے اسے طلاق دی۔

تمہاری وجہ سے اسے اس شخص کے ساتھ ڈھائی سال گزارنے پڑے جس نے اسے جسمانی و ذہنی دونوں طرح سے ٹارچر کیا۔ تم نے کبھی سگریٹ سے جسم پر پڑنے والے ”دھبے“ دیکھے ہیں؟ نہیں! کیونکہ میں نے کبھی تمہارے جسم کو سگریٹ سے نہیں جلایا۔ تمہارے جسم پر کبھی کسی نے ٹھوکریں ماری ہیں؟ نہیں! اس کے جسم پر بہت دفعہ ماری گئی ہیں۔ تمہیں کبھی میں نے بیلٹوں سے پیٹا ہے؟ نہیں! مگر اسے اس کا شوہر پیٹتا رہا ہے۔ تمہیں میں نے کبھی گالی نہیں دی اسے بہت دی گئی ہیں اور یہ سب ایک دن دو دن یا ایک ہفتہ، دو ہفتہ نہیں ہوا، یہ سب ڈھائی سال ہوا ہے، اور یہ سب میری اور تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اسے طلاق نہ دیتا تو وہ کبھی اس ذہنی مریض کے ہتھے نہ چڑھتی اور پھر طلاق کے لیبل سے بچنے کے لئے یہ سب چھپاتی نہ پھرتی۔ لیکن میں نے اسے طلاق دے دی جو اس نے برداشت کیا ہے وہ تم کبھی نہ کرتیں۔ ”تکلیف“ اور ”قربانی“ کے لفظ تمہیں صرف کہنا آتے ہیں تم ان کا مطلب نہیں جانتیں۔ تم جانتی ہو، میں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ وہ ایک سرکاری ہاسپٹل میں اپنے ہاتھ کی ٹوٹی ہوئی ہڈی اور خون سے لتھڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ایک جمگھٹے میں کھڑی تھی اور مجھے دیکھ کر اس نے اپنے چہرے کو چادر سے چھپا لیا تھا۔ تم اس کرب

کا اندازہ نہیں کر سکتیں جس سے میں گزر رہا تھا۔

ثناء وہ تھی جسے میں نے کبھی سخت ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اور وہ شخص معمولی بات پر اسے جانوروں کی طرح پیٹتا تھا۔ پتا ہے شمائلہ! اس دن میرا دل کیا چاہا تھا؟ میرا دل چاہ رہا تھا، میں بھی تمہارے جسم پر اسی طرح ٹھوکریں ماروں جیسے وہ اس کے جسم پر مارتا تھا، جلتے ہوئے سگریٹ کو تمہارے جسم پر مسل کر بجھاؤں تا کہ تمہیں پتا چلے کہ تم نے ثناء کے ساتھ کیا کیا تھا۔“

وہ کہتا جا رہا تھا۔ بس کہتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر میرے لئے اتنی نفرت تھی کہ میں اسے دیکھ نہیں پائی۔ میں نے اپنے سر کو گھٹنوں میں چھپا لیا وہ تب بھی خاموش نہیں ہوا تھا۔

”میں اس دن تمہیں طلاق دے دینا چاہتا تھا۔ میں تمہیں رکھنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھے ارم کا خیال آ گیا۔ وہ بہت چھوٹی تھی۔ اسے بھی تمہاری ضرورت تھی۔ میں ایک بار پھر جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے صبر کیا پھر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ میں نے اس کے والدین سے مل کر اس شخص سے اس کو طلاق دلوائی تھی اور پھر اس سے شادی کر لی تھی۔ ایک سال تک ہم دونوں خاموش رہے ایک دوسرے سے کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ اگر کبھی روتی تو مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ میں اسے خاموش کروا سکوں۔ اسے کوئی دلاسا دے سکوں۔ ایک مجرم کی طرح میں اس کے سامنے جایا کرتا تھا اور یہ سب تم نے کیا تھا۔ اس سب کی ذمہ دار تم تھیں۔“

میں اس کی آواز سے اس کے دل کی کیفیت جان رہی تھی۔ آج جیسے یوم حشر تھا۔

”جب ارم کچھ بڑی ہوئی تو میں تمہیں طلاق دے دینا چاہتا تھا۔ میں نے ثناء سے اس بارے میں بات کی تھی اور اس نے سختی سے مجھے مجبور کیا تھا کہ میں ایسا نہ کروں، وہ نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری بیٹی کی زندگی برباد ہو۔ تمہارے ساتھ وہ کچھ ہو جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے مجھے تمہارے ساتھ شیئر کرنا قبول کر لیا تھا۔ پھر ایسے بہت سے مواقع آئے تھے جب میں تم سے جان چھڑانا چاہتا تھا، میں صرف ایک گھر چاہتا تھا، ثناء کے ساتھ۔ دو گھروں سے تنگ آ گیا تھا۔ لیکن ہر بار وہ نہیں مانی۔ ہر بار وہ مجھے مجبور کر دیتی کہ میں تمہیں طلاق نہ دوں۔“

اس نے ایک ایک کر کے بے شمار بھالے میرے سینے میں اتار دیئے تھے۔

”تو تمہارے ساتھ پچھلے سترہ سال میں نے بھیک میں ملی خیرات کے طور پر گزارے ہیں۔“ میں اپنے سر کو اٹھا نہیں پا رہی تھی۔

”میرے اور ثناء کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ میں تم سے اسی لئے اور کوئی اولاد نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارا کوئی بیٹا ہو اور ثناء کے بیٹوں کے ساتھ میرے کاروبار کو شیئر کرے۔ میرا سب کچھ ثناء اور اس کی اولاد کا ہے اور میں چاہتا تھا کہ میرا نام اور میری نسل ثناء سے ہی چلے۔ تم پوچھتی تھیں نا کہ اتنے بڑے کاروبار کو کون سنبھالے گا۔ میرے اور ثناء کے بیٹے سنبھال لیں گے۔ میں اپنا تقریباً سارا کاروبار اور جائیداد ان چاروں کے نام کر چکا ہوں۔ تمہارے لئے میں نے یہ گھر رکھا ہے اور ارم اور اقصیٰ کے لئے بینک میں کچھ روپیہ ڈیپازٹ کروا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز پر تم لوگوں کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اس شہر میں مسز عمر کے نام سے اگر کوئی جانا جاتا ہے تو وہ ثناء ہے۔ تم اگر اپنا تعارف اس حوالے سے کرو گی تو لوگوں کے مذاق کا نشانہ بنو گی۔ اس لئے آئندہ کبھی اس حوالے سے اپنا تعارف مت کروانا، نہ ہی کبھی دوبارہ میرے گھر جانا۔ تم خاندانی بیوی ہو مگر دوسری بیوی، ہمیشہ دوسری ہی رہو گی۔ تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تم شاپنگ کرتی رہو۔ خاندان سے مکمل ملاپ رکھو اور وہاں

میرے حوالے سے عزت حاصل کرتی رہو۔ مگر شاء میری پہلی بیوی ہے اور جہاں جہاں میں جاؤں گا، وہاں میری بیوی کی حیثیت سے وہی جائے گی اور اسے ہی عزت ملے گی تمہیں نہیں۔“

میں نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ آج بھی اتنا ہی دور نظر آ رہا تھا جتنا سترہ سال پہلے تھا۔

”تم نے اتنے سال مجھ سے یہ سب چھپایا کیوں؟“ میں نے اس سے پوچھا تھا۔

”ہاں، صرف تم سے میں نے چھپایا تھا اور کسی سے نہیں۔ امی اور افسر دونوں شاء سے میری شادی سے واقف ہیں۔ تمہیں بتانے کی میں نے کبھی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔“

میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ میرے قدموں تلے سے زمین کھینچنے میں وہ کیل نہیں تھا۔ وہ بے حد مطمئن، بے حد پرسکون تھا۔ اس نے میرے پاس کچھ بھی رہنے نہیں دیا تھا اور میں پچھلے سترہ سالوں میں یہ سوچ کر خوش ہوتی رہی تھی کہ میرے پاس سب کچھ ہے اور یہ ”سب کچھ“ ہمیشہ کے لئے ہے، مگر یہ سب فریب تھا۔ شاء کا آسیب ہمیشہ میری زندگی میں رہا تھا اور اس آسیب نے ایک بار پھر میرے وجود کو نگل لیا تھا۔

”عمر! میں تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ تم مجھے طلاق دے دو، اتنا بڑا دھوکا کھا کر میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

میں نے پتا نہیں یہ کہنے کا حوصلہ کہاں سے پیدا کیا تھا۔

”مجھے تمہیں طلاق دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ خوشی ہوگی لیکن تم اچھی طرح اس بات کے بارے میں سوچ لو اور پھر مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔ میں ارم اور اقصیٰ کو تم سے نہیں چھینوں گا۔ وہ تمہارے پاس ہی رہیں گی۔ میں انہیں شٹل کاک بنانا نہیں چاہتا لیکن تم یہ ضرور سوچ لو کہ تمہارے اس فیصلے سے ان دونوں کے ذہن اور زندگی پر کیا اثر ہوگا تمہیں کچھ سالوں کے بعد ان دونوں کی شادی بھی کرنی ہے اور کسی مطلقہ کی بیٹی کو بیاہ کر لانے سے پہلے لوگ ہزار بار سوچتے ہیں پھر بھی اگر تم طلاق ہی چاہتی ہو تو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں طلاق دے دوں گا لیکن بہتر ہے تم اچھی طرح اس بارے میں سوچ لو۔“

وہ یہ کہہ کر بڑی لاپروائی سے اپنا بریف کیس اٹھا کر چلا گیا۔ اور میں تب سے اسی کرسی پر جھول رہی ہوں۔ چیزوں کو بنتے ہوئے کتنے مہینے کتنے سال لگ جاتے ہیں مگر جب وہ ختم ہونے لگتی ہیں تو پھر سب کچھ لمحوں میں ختم ہو جاتا ہے۔ میں کرسی پر جھولتے ہوئے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے مرر میں اپنے وجود کو دیکھ رہی ہوں۔ مرر مجھے سبز کپڑوں میں ملبوس تراشیدہ بالوں والی ایک فربہی مائل چالیس سالہ عورت کا عکس دکھا رہا ہے، جس کا ماضی ایک فریب تھا اور مستقبل ایک خواب رہا ہے۔ جس کا خوب صورت چہرہ اس مرد کے دل کو نہیں جیت پایا تھا جسے اس نے سب سے زیادہ چاہا تھا۔

”میں یہ نہیں مانتی کہ مرد کے لئے قربانی دی جائے اور وہ اسے بھول جائے۔ اس کا کوئی صلہ نہ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بندہ جو آپ کا شوہر ہے، آپ سے محبت کرتا ہے، آپ اس کے لئے کچھ کریں تو وہ اسے بھلا دے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی وقعت ہی نہ ہو اور پھر ہم دونوں میں تو ذہنی ہم آہنگی ہے۔ ہمیں تو اپنی بات ایک دوسرے تک پہنچانے کے لئے بعض دفعہ لفظوں کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ کم از کم عمر حسن وہ واحد شخص ہے جس کے بارے میں میں کہہ سکتی ہوں کہ وہ احسان فراموش نہیں ہے۔“

بہت سال پہلے ایک بار شاء نے اپنی کسی دوست سے کہا تھا۔ اس کی آواز میرے کانوں میں لہرا رہی تھی۔ ہاں عمر حسن، احسان فراموش

نہیں تھا۔ اس میں وہ خوبیاں تھیں جو عام مردوں میں نہیں تھیں اور ان خوبیوں کی وجہ سے ہی میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ مجھ میں اس جیسی کوئی خوبی نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش کی تھی۔

ہم نامکمل لوگ مکمل لوگوں کے ساتھ کبھی نہیں چل سکتے، کبھی ہمارا سانس پھول جاتا ہے اور کبھی وہ ہمیں بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

میرے ساتھ یہ دونوں باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے کسی فعل پر کوئی شرمندگی، کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں نے جو ٹھیک سمجھا، اسے حاصل کرنے کے لئے کیا۔ میں انسان تھی کوئی فرشتہ نہیں اور پھر سب یہی کرتے ہیں۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا، اگر میری وجہ سے ثناء کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ یہ سب اس کی قسمت میں تھا پھر عمر حسن مجھے ان سب چیزوں کا ذمہ دار کیسے ٹھہرا سکتا ہے۔ میں نے سترہ سال کے دوران سب کچھ پایا تھا۔ دولت، گھر، بچے، سکون، میں نے سوچا تھا اب دنیا میں کچھ اور پانے اور حاصل کرنے کے لئے باقی نہیں رہا، مگر مجھے یہ پتا نہیں چلا تھا کہ عمر حسن، ہاں بس عمر حسن میرا نہیں ہوا۔ میں نے اس کو اتنا چاہا تھا کہ اس کے عشق میں، اپنے وجود کو آگ بنا ڈالا تھا۔ اور اس آگ نے کتنوں کو جلایا۔ مجھے کبھی اس کا احساس نہیں ہوا۔

اب یہاں اس کمرے میں کرسی پر جھولتے ہوئے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ اس سے طلاق لے لوں تو اس عمر میں اپنے چہرے، اپنے ماتھے پر یہ داغ کیسے سجا لوں۔ بچی بیٹیوں کو میں کیا بتاؤں کہ میں عمر حسن سے طلاق کیوں لے رہی ہوں۔ اپنے ماضی کے کارنامے کو ان کے سامنے کیسے رکھ دوں۔ وہ تو پھر بہت سے سوال کریں گی میرے بارے میں، عمر حسن کے بارے میں اور ثناء کے بارے میں اور میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتی اور اگر انہیں مطمئن کر بھی دوں تو ان لوگوں کو کیسے مطمئن کروں گی جو میری بیٹیوں کا رشتہ لینے آئیں گے اور اور اگر میں طلاق نہ لوں تو زندہ کیسے رہوں؟ پچھلے سترہ سال جس فریب، جس سراب کے ساتھ رہی ہوں، اس کے ساتھ آگے کیسے رہوں۔ اس کی بے اعتبار نظروں اور اجنبی لہجے کو کیسے برداشت کروں جو میرا خون کر دیتے ہیں اور یہ کیسے برداشت کروں کہ وہ اسی شہر میں ایک گھر میں اس عورت کے پاس بھی جاتا ہے جسے وہ سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ یہ کیسے برداشت کروں کہ میرے لئے اس کی نظروں میں نفرت اور اس کے لئے محبت ہو۔ میں دوراہے پر کھڑی ہوں اور جانتی ہوں کہ منزل دونوں ہی رستوں پر نہیں ہے پھر بھی مجھے ایک رستہ چننا ہے اور میں انتخاب نہیں کر پا رہی۔

اور اب میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں کون سا رستہ چنوں۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں نے اچھا کیا یا برا۔ مجھ پر نیکی اور بدی کا فتویٰ جاری مت کیجئے۔ میں سب جانتی ہوں، صرف یہ نہیں جانتی کہ مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہئے اس لئے آپ سے آپ کی مدد چاہتی ہوں۔ شاید آپ مجھے اس برزخ سے نکال لیں جس میں، میں اپنی مرضی سے گری ہوں مجھے بتائیں اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟

* * *

شہرِ ذات

''خدا کا خوف کرو فلک! اتنی دیر میں لوگ چاند پر جا کر واپس آ جاتے ہیں جتنی دیر میں تم صرف اپنی آنکھوں کا میک اپ کر رہی ہو۔ میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلاتی ہوں، وہاں سلمان انصر کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے اتنے ہتھیاروں سے لیس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

رشنا کی بیزاری اب اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی، اور وہ سیدھا سیدھا طنز کرنے پر اتر آئی تھی۔ مگر اس کی کسی بات کا فلک پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی سکون و اطمینان سے اپنی پلکوں پر مسکارے کی ایک اور کوٹنگ کرتی رہی۔

''اٹھ جاؤ فلک! اٹھ جاؤ! ہم کنسرٹ پر جا رہے ہیں کسی فیشن شو میں نہیں اب بس کرو۔'' اس کی خاموشی نے رشنا کو کچھ اور تپایا۔ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر اس کے سامنے پڑی میک اپ کٹ کو اٹھا کر بند کر دیا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے یار! چند منٹ انتظار نہیں کر سکتیں؟'' فلک نے اس کے ہاتھ سے میک اپ کٹ چھینتے ہوئے کہا۔

''مجھے قطعاً کوئی تکلیف نہیں ہے مگر یہ جتنی جانفشانی سے تم میک اپ میں مصروف ہو، اس سے تمہیں ضرور کوئی تکلیف ہو جائے گی۔''

فلک اس کی بات کا جواب دیے بغیر ایک بار پھر مسکارا لگانے میں مصروف ہو گئی۔ رشنا ڈریسنگ ٹیبل پر بیٹھ کر ہلکی سی مسکراہٹ سے اسے دیکھنے لگی۔ فلک اپنے چہرے پر جمی اس کی آنکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میک اپ میں مصروف رہی۔

''فلک! تمہیں آخر میک اپ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہیں تو خدا نے پہلے ہی بہت مکمل بنایا ہے۔ میک اپ کی ضرورت تو ان لوگوں کو ہوتی ہے جن میں کوئی خامی کوئی کمی رہ گئی ہو۔ تم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' چند لمحے اس کے چہرے پر نظر جمائے رکھنے کے بعد رشنا نے کہا۔

ایک دلکش مسکراہٹ فلک کے چہرے پر لہرائی۔ ایک خاص ادا سے دایاں ابرو اچکاتے ہوئے اس نے کہا۔

''جانتی ہوں مجھے میک اپ کی ضرورت نہیں ہے مگر سلمان کو میک اپ پسند ہے اور جو چیز اسے پسند ہے، وہ فلک کو کیسے ناپسند ہو سکتی ہے۔ مس رشنا کمال! یہ سب سنگھار صرف اسی ایک شخص کے لیے کر رہی ہوں تا کہ اس کی نظر کہیں اور نہ جا سکے۔ اگر کوئی چہرہ اس کے خیالوں میں رہے تو وہ یہی چہرہ ہو، اگر کوئی وجود اس کی نظر کو اسیر کرے تو وہ یہی وجود ہو۔''

فلک نے میک اپ کٹ بند کر کے دراز میں رکھ دی۔

''دل تو اس بندے کا پہلے ہی جیت چکی ہو اب باقی کیا رہا جسے حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ وہ بندہ تمہارے پیچھے اس قدر دیوانہ ہے کہ اس سب سنگھار کے بغیر بھی اس کی نظر تمہارے علاوہ کسی اور چہرے پر نہیں ٹکے گی۔''

رشنا نے رشک آمیز حسرت سے کہا تھا۔ ایک تفاخر آمیز مسکراہٹ سے فلک اپنے تراشیدہ بالوں میں برش کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

خوبصورتی کی اگر کوئی حد ہوتی تو وہ حد فلک شیر افگن تھی۔ وہ مجسم حسن تھی جو نظر ایک بار اس چہرے کو دیکھ لیتی وہ دوبارہ کچھ اور دیکھنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔ اسے نظروں کا اسیر کرنے کا ہنر آتا تھا۔ بعض دفعہ وہ اپنے وجود کو آئینے میں دیکھتی اور خود اپنے سحر میں گرفتار ہو جاتی اور پھر سوچتی۔

”اگر میں ایک عورت ہوتے ہوئے خود اپنے ہی عکس سے نظر ہٹا نہیں سکتی تو کسی مرد کے لیے یہ کتنا مشکل ہوگا۔“

یہ احساس اسے بیٹھے بٹھائے قلوپطرہ بنا جاتا پھر وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی سنگھار میں مصروف رہتی۔ بہت سے لوگوں کو دنیا میں صرف ایک چیز ملتی ہے اور بس ایک ہی چیز ملتی ہے۔ بعض لوگوں کو دنیا میں سب کچھ ملتا ہے اور سب کچھ ہی ملتا ہے، فلک شیر افگن دوسری فہرست میں آتی تھی۔ وہ شیر افگن جلیل کی اکلوتی بیٹی تھی اور شیر افگن جلیل ملک کے نامور انڈسٹریلسٹ تھے۔ اسے چاہا نہیں گیا تھا۔ بے تحاشا چاہا گیا تھا گر اس کے ماں باپ کا بس چلتا تو وہ واقعی اسے اپنی پلکوں پر بٹھا لیتے۔ وہ خود پسند بھی تھی اور خود پرست بھی مگر کوئی اور خامی اس میں نہیں تھی یا شاید اس کا حسن کسی دوسرے کو اتنی جرأت ہی نہیں دیتا تھا کہ وہ فلک شیر افگن کی کوئی خامی ڈھونڈ پاتا۔

اس نے ہر جگہ سے ستائش پائی تھی چاہے وہ گھر ہو یا اسکول، کالج ہو یا یونیورسٹی۔ وہ لڑکیاں بھی جو اس سے حسد کرتی تھیں۔ کہیں نہ کہیں ان کے دل میں بھی اس سے دوستی کی خواہش ضرور دبی رہتی تھی۔ بعض دفعہ کوئی دل ہی دل میں اس سے سخت بدگمان ہوتا اسے ناپسند کرتا اس کے بارے میں دوسروں سے غلط باتیں کہتا اور پھر وہ ایک بار ہی اس سے مخاطب ہوتی، حال احوال پوچھتی، مسکراتی اور اگلا چاروں شانے چت ہو جاتا پھر اس میں کوئی مزاحمت ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ اگلے کتنے دن وہ اسی احساس کے ساتھ ساتویں آسمان پر رہتا کہ فلک شیر افگن نے اس سے بات کی ہے اس کا حال احوال دریافت کیا ہے، اسے دیکھ کر مسکرائی ہے۔ پھر وہ دوبارہ کبھی اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ کر پاتا۔ وہ اکثر اپنے مخالفین کو اسی طرح چت کیا کرتی تھی۔

وہ یونیورسٹی میں ایم ایف اے کر رہی تھی مگر اس کا حلقہ احباب لمبا چوڑا نہیں تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد محدود تھی۔ اس کی چند دوستیں وہی تھیں جن کے ساتھ اسکول کے زمانے سے اس کی دوستی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلق نہ صرف مضبوط ہوا تھا بلکہ اس کی دوستوں میں کوئی اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔ رشنا بھی اس کی ان ہی گہری دوستوں میں سے ایک تھی اور اس سے اور مریم سے ہی اس کا سب سے زیادہ میل جول تھا۔

فلک کے لیے رشتے تب سے آنے شروع ہو گئے تھے جب وہ اسکول میں تھی۔ مگر شیر افگن نے بڑی خوبصورتی سے سب کو ٹال دیا تھا وہ چھوٹی عمر میں اس کی شادی کرنا نہیں چاہتے تھے ویسے بھی وہ جانتے تھے کہ فلک کے لیے کبھی بھی رشتوں کی کمی نہیں ہوگی۔ وہ نہ صرف بے پناہ خوبصورت تھی بلکہ ان کی ساری دولت کی بھی مالک تھی پھر ایسی سونے کی چڑیا کو پھانسنے کے لیے شکاریوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ کیوں نہ ہوتا۔

وہ شروع سے کو ایجوکیشن میں پڑھی تھی اور شروع سے ہی اس کے پیچھے بھاگنے والوں کی فہرست بہت لمبی تھی۔ مگر فلک نے کبھی کسی کی پروا نہیں کی تھی یا پھر شاید اس کو کسی میں اتنی کشش ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ اس کے بارے میں سوچتی بلکہ وہ اکثر اپنی فرینڈز کے ساتھ مل کر ایسے عشاق کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ رشنا اکثر اس سے کہا کرتی تھی۔ ”جو لوگ خود خوبصورت ہوتے ہیں، انہیں کسی دوسرے سے محبت ذرا کم ہی ہوتی ہے اور عشق تو دور کی بات ہے۔“ وہ ہر بار اس کی باتوں پر قہقہہ لگایا کرتی تھی۔

حمدان ظفر سے اس کی ملاقات اپنی ایک دوست کی بہن کی شادی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ آواری میں سوئمنگ پول کے کنارے ایک

ٹیبل پر وہ اپنی دوستوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی حسب معمول بہت سی نظروں کا مرکز بنی ہوئی تھی، وہ اس بات سے آگاہ بھی تھی اور بے پرواہ بھی۔ اپنی دوستوں کے کسی بات پر قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی نظر سوئمنگ پول کے دوسرے کنارے پر موجود ایک ٹیبل پر پڑی تھی۔ سیاہ جینز اور اسی رنگ کی لیدر کی جیکٹ اور وائٹ شرٹ میں ملبوس وہ بندہ اس ٹیبل کی سب سے خاص چیز تھا۔ وہ اتنی دور سے بھی اس کے چہرے کے نقوش کی خوبصورتی کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لڑکے کی بات سن رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس سے کوک کے سپ لے رہا تھا۔ فلک چاہتے ہوئے بھی اس سے نظر ہٹا نہیں پائی۔ اپنی فرینڈز کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ وقفے وقفے سے اسے دیکھ رہی تھی اور کچھ دیر بعد اچانک اسے احساس ہوا تھا کہ وہ صرف فلک کی توجہ کا مرکز نہیں تھا۔ کچھ اور نظریں بھی بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اور اس احساس نے پہلی بار اسے حسد سے روشناس کروایا تھا۔ اس کے دل میں بڑی شدت سے اس کے پاس جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔

”رشنا! یہ سوئمنگ پول کے دوسری طرف ٹیبل پر بلیک آؤٹ فٹ میں جو بندہ ہے، اسے جانتی ہو؟“

اس نے اچانک رشنا سے سرگوشی میں پوچھا جو اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ رشنا نے نظر دوڑائی تھی۔ ”نہیں یار یہ کوئی نیا بندہ ہے کم از کم میں واقف نہیں ہوں۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

پھر فلک نے یہی سوال ٹیبل کے گرد بیٹھی ہوئی اپنی دوسری دوستوں سے کیا تھا۔ سب کا جواب نفی میں تھا۔

”رمشہ سے پوچھو، میرا خیال ہے، یہ اس کے بہنوئی کا کوئی دوست ہوگا۔“ رشنا نے اس سے کہا تھا۔ وہ رشنا کے ساتھ اٹھ کر اسٹیج کی طرف آ گئی تھی۔ وہاں رمشہ، دولہا دلہن کے ساتھ بیٹھی تصویریں بنوا رہی تھی۔ فلک نے اسے ایک طرف بلوایا اور اس بندے کے بارے میں پوچھا تھا وہ اپنے بھائی سے اس کے بارے میں پوچھنے گئی تھی۔

”یہ سلمان انصر ہے، اسد بھائی کا کزن ہے۔“ اس نے آ کر اپنے بہنوئی کا نام لیا تھا۔ فلک نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے اس سے ملوائے۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے، اسد بھائی کا چھوٹا بھائی جمشید بھی اسی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس کے پاس تمہیں لے جاتی ہوں ظاہر ہے وہ خود ہی ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کا تعارف کروا دے گا۔“ رمشہ نے اس ٹیبل پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

فلک دھڑکتے دل کے ساتھ رمشہ کے ساتھ اس ٹیبل کی طرف آ گئی تھی۔ وہ دور سے جتنا خوبصورت نظر آ رہا تھا پاس آ کر اس سے زیادہ اچھا لگا تھا اسے۔ رمشہ کے ساتھ جب وہ اس ٹیبل کے پاس پہنچی تو رمشہ نے جمشید سے اس کا تعارف کروایا تھا پھر جمشید نے باری باری ٹیبل کے گرد بیٹھے ہوئے لڑکوں کا تعارف ان سے کروایا تھا۔

سلمان انصر نے اپنے تعارف پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہیلو کہا تھا۔ پھر وہ پہلے کی طرح اردگرد نظر دوڑانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ فلک کے لیے یہ بات حیران کن تھی۔ وہ اس ٹیبل پر بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکوں کی طرح اسے ستائشی نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل کو کچھ ٹھیس لگی تھی، کچھ دل گرفتہ سی وہ واپس اپنی میز پر آ گئی تھی۔ فنکشن کے اختتام تک اس کی توجہ اسی پر مرکوز رہی تھی مگر اس نے سلمان انصر کو ایک بار بھی اپنی طرف متوجہ نہیں دیکھا۔

اگلے کئی دن وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ چہرہ جیسے اس کے دماغ میں کہیں فیڈ ہو گیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی سے اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔

سلمان انصر سے اس کی دوسری ملاقات Pace میں ہوئی تھی۔ وہ ہاتھوں میں کچھ شاپنگ بیگز تھامے باہر کی طرف آ رہا تھا۔ جبکہ وہ اندر جا رہی تھی۔ اسے سامنے سے آتے دیکھ کر فلک کے قدم رُک گئے۔

"ہیلو!" پاس آنے پر فلک نے بے تابی سے اسے مخاطب کیا وہ کچھ حیران ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نہیں تھی۔

فلک کو شاک لگا۔ "کیا مجھ میں ایسی کوئی بات بھی اسے نظر نہیں آئی کہ یہ مجھے یاد رکھتا۔" اس نے سوچا تھا۔

"سوری، میں نے آپ کو پہچانا نہیں ہے۔"

فلک نے کچھ دل گرفتہ ہو کر دو ہفتے پہلے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بتایا۔

وہ ایک دم مسکرایا۔ "مجھے یاد آ گیا کیسی ہیں آپ؟"

اس کی مسکراہٹ نے فلک کی ساری سنجیدگی دور کر دی تھی "میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟"

"فائن۔"

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا میں آپ کو لنچ کی آفر کر سکتی ہوں؟" اس نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر اس سے کہا تھا۔

وہ اس اچانک آفر پر کچھ حیران ہوا تھا۔

"لنچ آل رائٹ چلیں۔" چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

دونوں باہر نکل آئے۔ فلک نے اپنے ڈرائیور کو واپس بھجوا دیا۔ سلمان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"کہاں چلیں؟" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"فیوجی یاما۔" وہ گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے سڑک پر لے آیا تھا۔

"آپ پڑھتی ہیں؟" اس نے اپنی ٹی شرٹ کے ساتھ لٹکتے ہوئے سن گلاسز اتار کر لگاتے ہوئے کہا تھا۔

فلک نے اسے اپنے بارے میں بتایا۔

"اور آپ؟"

"مجھے تو کافی سال ہو گئے پڑھائی/تعلیم مکمل کیے۔ اکنامکس میں ماسٹرز کیا ہے۔ سرامکس کی فیکٹری ہے میرے ڈیڈی کی وہیں ہوتا ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ اپنے بارے میں بتاتا گیا۔ پھر گفتگو کا سلسلہ طویل ہوتا گیا تھا۔

(فیوجی یاما) میں ہونے والا یہ لنچ پہلا اور آخری لنچ ثابت نہیں ہوا تھا۔ ان کی ملاقاتوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی اور پھر اینڈ رزلٹ وہی ہوا تھا

جو فلک نے چاہا تھا۔ سلمان نے اسے پرپوز کر دیا اور اس نے ایک لمحے کے تامل کے بغیر یہ پرپوزل قبول کر لیا۔ سلمان، سے پہلی ملاقات میں ہی دوسرے مردوں سے مختلف لگا تھا۔ فلک بیس سال کی تھی، اور وہ اس سے دس سال بڑا تھا فلک کی طرح وہ نہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک اٹھتا تھا اور نہ ہی کسی بات پر فوراً اپنا ردعمل ظاہر کرتا تھا۔ وہ بہت سوبر اور ڈیسینٹ تھا۔ پرسکون انداز میں ٹھہر ٹھہر کر دھیمی آواز میں بات کیا کرتا تھا اور فلک کسی سحر زدہ معمول کی طرح اسے بات کرتے دیکھتی رہتی تھی۔ وہ کبھی بھی کسی کی بات اتنے انہماک سے نہیں سنتی تھی جس طرح وہ سلمان کو سنتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ سلمان کے پرپوز کرنے پر جیسے اس کی دلی مراد پوری ہو گئی تھی اسے پہلی بار اپنی خوش قسمتی پر یقین آیا تھا لیکن ابھی کچھ مشکلات باقی تھیں۔

گھر میں اس پرپوزل کا ذکر کرنے پر جیسے ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ شیر افگن کو اعتراض تھا کہ وہ اُن کی برادری کا نہیں ہے اور ویسے بھی وہ فلک سے دس سال بڑا تھا۔ ایک اور اعتراض انہیں یہ تھا کہ وہ بہرحال ایک ویل آف فیملی سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ فیملی شیر افگن جلیل کی ٹکر کی نہیں تھی فلک کے لیے اگر یہ ساری باتیں بے معنی تھیں تو شیر افگن کے لیے یہی چیزیں اہمیت رکھتی تھیں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے داماد بھی ویسا ہی چاہتے تھے اور سلمان اس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ مگر فلک کی ضد کے آگے ان کی مخالفت زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکی تھی۔ وہ اس کے رونے دھونے اور خاموشی کو برداشت نہیں کر سکے تھے اور انہوں نے سلمان کے رشتہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر لیا تھا۔

مگر شیر افگن کی ناپسندیدگی سلمان سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ منگنی کے فوراً بعد ان کے اختلافات ایک بار پھر ابھر کر سامنے آئے تھے جب شیر افگن نے یہ کوشش کی تھی کہ سلمان اپنی فیکٹری چھوڑ کر ان کے بزنس کو دیکھنا شروع کرے۔ انہوں نے یہ پیش کش فلک کے ذریعے کی تھی۔

”یعنی تمہارے فادر کو ایک ایسا داماد چاہیے جو ان کی فائلوں والا بریف کیس اٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے چلے، سرونٹ کم سن ان لاء۔“ اس کا لہجہ طنزیہ تھا فلک کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”تم کیسی باتیں کر رہے ہو سلمان؟ کیا میرے پاپا تمہیں نوکر بنا کر رکھیں گے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم ان کا بزنس سنبھالنا شروع کر دو ظاہر ہے ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے اور میری شادی جس سے بھی ہوتی، اسے پاپا کا بزنس تو سنبھالنا ہی ہوتا۔“ اس نے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔

”اور میری سرامکس کی فیکٹری کا کیا ہو گا؟“ اس نے کچھ دیر بعد فلک سے پوچھا تھا۔

”تم اپنے کسی بھائی کے سپرد کر سکتے ہو یا اپنی جگہ کوئی جنرل منیجر رکھ سکتے ہو۔“ فلک نے مشورہ دیا تھا۔ وہ کافی کے سپ لیتے ہوئے کچھ دیر تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ ”کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں، میں نے تم سے بات ہی نہیں کی اور یہی غلطی کی ہے، میرا خیال ہے انگیجمنٹ سے پہلے ہی مجھے تم سے ان چیزوں کے بارے میں بات کرنی چاہیے تھی۔“ اس کا لہجہ خاصا سرد تھا۔

فلک کچھ چونک گئی تھی۔

”مجھے شادی ایک لڑکی سے کرنی ہے۔ کوئی باس گھر لے کر نہیں آنا ہے۔ میرا خیال ہے میں اس طرح کا شوہر ثابت نہیں ہو سکتا جس طرح کا تمہیں یا تمہارے گھر والوں کو ضرورت ہے۔ اگر میرا اپنا بزنس نہ ہوتا تو میں تمہارے فادر کے بزنس کے بارے میں سوچتا لیکن اب میری اپنی

فیکٹری ہے جو پوری طرح سے اسٹیبلش ہے۔ تم چاہتی ہو، میں وہ چھوڑ کر تمہارے فادر کے بزنس کو جوائن کر لوں جو میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کو اپنے طریقے سے گزارنا چاہتا ہوں۔ بیوی یا ان لاز کی مرضی کے مطابق نہیں۔ میرا خیال تھا ہم نے کافی وقت اکٹھا گزارا ہے تم مجھے کسی نہ کسی حد تک سمجھ چکی ہو گی مگر میرا خیال غلط ہے۔ بس یہ میرا خیال ہے ہمیں کسی نئے رشتے میں بندھنا نہیں چاہیے۔"

اس نے اپنی بات کے اختتام پر اپنی انگلی سے منگنی کی انگوٹھی اتار کر فلک کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔ اس نے والٹ نکال کر بل کے پیسے مینو کارڈ میں رکھے اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ فلک کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی چھوٹی سی بات پر یہ قدم

اس نے اسے ریسٹورنٹ کے دروازے سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ پھر جیسے وہ اپنے حواس میں واپس آ گئی تھی۔ اپنا بیگ اور انگوٹھی اٹھا کر وہ بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے گئی تھی۔ وہ پارکنگ کی طرف جا رہا تھا۔

"آئی ایم سوری سلمان! اگر تم میری بات پر ہرٹ ہوئے ہو تو۔ لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس نے پاس آ کر اس کے کندھے کو تھام کر لجاجت سے کہا تھا۔

وہ رک گیا تھا۔ "بات ہرٹ ہونے یا نہ ہونے کی نہیں ہے بات اپنی اپنی خواہش اور ضرورت کی ہے۔ تمہارے فادر کو واقعی ایک شخص کی ضرورت ہے جو ان کے بزنس کو سنبھالے لیکن میں....."

اس نے بڑی نرمی سے اس سے کہا تھا مگر فلک نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اس موضوع پر ہمارے درمیان دوبارہ کبھی بات نہیں ہو گی۔ جو تم چاہو گے وہی ہو گا۔ پاپا کیا سوچتے ہیں یا کیا چاہتے ہیں۔ میں تم سے دوبارہ کبھی اس بات کا ذکر نہیں کروں گی۔" اس نے قطعی لہجے میں سلمان سے کہا تھا "اور اب تم یہ انگوٹھی پہن لو۔"

سلمان نے کچھ سوچتے ہوئے رنگ پکڑ لی۔

شیر افگن کی ناراضگی سلمان کے اس انکار کے بعد کچھ اور بڑھ گئی تھی انہوں نے فلک کو سلمان کے خلاف اکسانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اب ان کی کوئی بات سننے پر تیار نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سلمان اگر اس کا بزنس جوائن نہیں کرنا چاہتا ہے تو انہیں اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے بھی وہ سلمان کی اس حرکت کے بعد خوفزدہ ہو گئی تھی بہت دنوں تک وہ اس واقعہ کو ذہن سے نہیں نکال سکی تھی۔

"کیا سلمان کے نزدیک میری ذرا بھی اہمیت نہیں تھی کہ اس نے اتنی معمولی سی بات پر انگوٹھی اتار کر پھینک دی؟"

یہ سوال بار بار اس کو خوفزدہ کر دیتا تھا۔

"مگر اگر اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہ ہوتی تو وہ مجھے شادی کا پرپوزل کیوں دیتا۔" وہ جیسے خود کو تسلی دینے کی کوشش کرتی تھی۔

"ایک شخص سے محبت، انسان کو کتنا مجبور کر دیتی ہے میں نے زندگی میں کسی کی پرواہ ہی نہیں کی اور اب اس شخص کی پرواہ کی ہے تو مجھے احساس ہوا ہے کہ محبت کرنے کے بعد بندے کو کتنا جھکنا پڑتا ہے صرف اس خوف سے کہ کہیں دوسرا آپ کو چھوڑ نہ دے۔"

وہ سوچتی تھی۔ ہر بار یہ سوچ اسے دل گرفتہ کر دیتی تھی اور ہر بار سلمان کے سامنے آنے پر اس کی ساری دل گرفتگی جیسے دھواں بن کر غائب

ہو جاتی تھی۔ اس کے سارے شکوے جیسے ختم ہو جاتے تھے۔ وہ عام مردوں کی طرح لمبی چوڑی باتیں کرتا تھا نہ ہی اس کے حسن کے قصیدے پڑھتا مگر فلک کو اس کی موسم کے حالات کے بارے میں کہی جانے والی بات بھی کسی خوبصورت اور رومینٹک شعر سے زیادہ اچھی لگتی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ سلمان کو اس کے ساتھ بیٹھنا باتیں کرنا اس کے ساتھ چلنا پھرنا کیسا لگتا تھا۔ مگر اسے سلمان کے ساتھ چلتے ہوئے اپنے وجود پر فخر ہوتا تھا یوں جیسے وہ سلمان کو نہیں پورے جہان کو اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہو۔ جیسے دنیا میں اس کے علاوہ ہر لڑکی خالی ہاتھ ہو۔

اس کی زندگی میں اگر سلمان پہلا مرد تھا تو سلمان کی زندگی میں آنے والی بھی وہ پہلی لڑکی ہی تھی۔ وہ شروع سے ہی بہت ریزرو طبیعت کا مالک تھا، اور لڑکیوں کے ساتھ گھومنا پھرنا کبھی بھی اس کی عادت میں شامل نہیں رہا تھا۔ فلک کی طرح وہ بھی اپنی خوبصورتی اور صنف مخالف کے لیے اپنی کشش سے واقف تھا۔ اور اس کی طرح وہ خود پرست بھی تھا اور انا پرست بھی لیکن ان دونوں باتوں کے باوجود بھی فلک کی محبت میں گرفتار تھا۔ ہاں یہ محبت فلک کی طرح طوفانی اور سب کچھ قربان کر دینے والی نہیں تھی۔

ان کی منگنی تقریباً تین سال رہی تھی اور ان تین سالوں میں فلک نے خود کو سلمان کی پسند کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ وہ سلمان کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتی تھی جو رنگ سلمان کو پسند تھے اس نے بھی وہی پہننا شروع کر دیے تھے۔ جو رنگ سلمان کو ناپسند تھے وہ جیسے اس کی زندگی سے بھی نکل گئے تھے۔ جو چیز سلمان کو کھانے میں پسند تھی۔ لاشعوری طور پر وہ اس کی پسند بھی بن گئی تھی اور جس چیز سے سلمان بھاگتا تھا۔ وہ بھی اسے۔ تقریباً ناپسند کرنے لگی تھی اور یہ سب کچھ سلمان کے کہے بغیر ہوا تھا۔ سلمان نے کبھی اسے کسی بات پر مجبور نہیں کیا تھا مگر وہ خود ہی اسے خوش رکھنا چاہتی تھی۔ سرتاپا اس کی پسند میں ڈھل جانا چاہتی تھی اس کی دوستیں اس میں آنے والی تبدیلیوں پر حیران تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ فلک شیر افگن جو پتا نہیں خود کتنے دلوں کی دھڑکن ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف ایک شخص کے لیے۔ تبدیل کر دے گی۔ اس کی ہر بات میں سلمان نصر کا ذکر آتا تھا۔ بعض دفعہ اس کی دوستیں اس بات پر اس کا مذاق اڑاتیں مگر فلک کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔

تین سال بعد بڑی دھوم دھام سے اس کی اور سلمان کی شادی ہو گئی تھی۔ شادی سے کچھ عرصہ پہلے ہی سلمان نے اپنے لیے ایک علیحدہ گھر لے لیا تھا اور فلک شادی کے بعد اسی گھر میں آ گئی تھی۔ شادی کے بعد فلک کے دل میں سلمان کے بارے میں جو تھوڑے بہت خدشات تھے وہ بھی ختم ہو گئے تھے، وہ ایک بہت ہی محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ شادی سے پہلے کی جس بے نیازی اور بے پروائی نے فلک کو خوفزدہ کیا تھا۔ وہ شادی کے بعد غائب ہو گئی تھی۔ وہ فلک کا کسی ننھے بچے کی طرح خیال رکھتا تھا۔ شادی سے پہلے کی اس کی کم گوئی بھی ختم ہو گئی تھی۔

فلک کو اپنی زندگی پر پہلی بار رشک آنے لگا تھا۔ ٹھیک ہے میں نے اس شخص کے لیے اپنے آپ کو بہت بدلا ہے اسے خوش کرنے اور خوش رکھنے کے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے مگر وہ سب بے کار تو نہیں گیا۔ سلمان انصر کو احساس ہے کہ میں نے اس کے لیے کیا کیا ہے اور اس کے نزدیک میری، ہر قربانی ہر ایثار کی اہمیت ہے۔”

وہ اکثر سوچتی اور مسرور ہوتی رہتی۔ شادی کے بعد سلمان انصر کے شیر افگن کے ساتھ بھی تعلقات اچھے ہو گئے تھے حالانکہ فلک کو خدشہ تھا کہ شاید سلمان کی انا ان تعلقات کی بہتری میں رکاوٹ بنے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر فلک کے ساتھ اس کے گھر جایا کرتا تھا اور میمونہ اور شیر افگن

دونوں کی بہت عزت کرتا تھا۔ خود شیر افگن بھی اس کے بارے میں اپنے پچھلے خیالات اور رائے بدلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ فلک کو اس کے ساتھ اس قدر خوش دیکھ کر اور سلمان کے طور طریقے دیکھ کر وہ اسے پسند کرنے لگے تھے۔

سلمان بہت لبرل قسم کا آدمی تھا اور کچھ یہی حال فلک کا تھا۔ شیر افگن اور میمونہ نے جس ماحول میں فلک کی تربیت کی تھی وہاں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ بچپن میں ایک بار قرآن پاک پڑھ لینے کے بعد فلک نے دوبارہ اس مقدس کتاب کو ہاتھ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نماز اور روزے سے بھی وہ اپنی ماں کی طرح بے نیاز تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آج کے دور میں اتنا مذہبی ہونا خاصا دقیانوسی کام ہے۔ جب کبھی دوستوں سے اس کی اس موضوع پر بات ہوتی تو وہ کہتی۔

”دیکھو یار! مجھے قیامت وغیرہ پر زیادہ یقین نہیں ہے جو کچھ ہوتا ہے دنیا میں ہی ہوگا۔ اچھی یا بری جیسی زندگی بھی گزارنی ہے بس ایک بار ہی گزارنی ہے ایسا بار بار نہیں ہوگا۔

رشنا کو بعض دفعہ اس کی باتوں پر اعتراض ہوتا کیونکہ وہ باقاعدگی سے نہ سہی لیکن نماز وغیرہ پڑھ لیا کرتی تھی۔ فلک اس کے اعتراض پر ہر دفعہ مسکرا کر کہتی۔

”دیکھو رشنا! یہ عبادت وغیرہ بندہ تب کرتا ہے جب اس کی اللہ سے لمبی چوڑی فرمائشیں ہوں یا پھر اس نے اچھے خاصے گناہ کیے ہوں۔

میرے ساتھ تو دونوں مسئلے نہیں ہیں نہ تو میں اللہ سے کچھ مانگتی ہوں اور نہ ہی میں کوئی گناہ کرتی ہوں پھر ہر وقت مصلے پر بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ۔“

رشنا ہر بار خاموش ہو جاتی تھی۔ وہ اسے دلیل سے قائل نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ خود اس کا مذہب کے بارے میں علم بہت کم تھا اور وہ فلک کو دلیل کیسے دے سکتی تھی۔ فلک کے برعکس سلمان اس طرح کی باتیں تو نہیں کرتا تھا لیکن نماز، روزے سے وہ بھی کوسوں دور تھا۔ اس کے نزدیک اتنا ہی اسلام کافی تھا کہ بندہ مسلمان ہو اور اس کا نام بھی مسلمانوں والا ہو۔ ہاں زندگی کو ویسے گزارنا چاہیے جیسے زمانہ ہو۔

اس سہ پہر وہ دونوں راوی کی سیر کے لیے گئے تھے۔ شادی سے پہلے بھی وہ دونوں اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ فلک کو یہاں دریا کے کنارے پر تنہائی اور خاموشی میں آ کر بیٹھنا بہت پسند تھا۔ بعض دفعہ جب سلمان اس کے ساتھ نہ ہوتا تو وہ اپنی کسی دوست کو ساتھ لے آتی۔ کشتی کے ذریعے وہ کامران کی بارہ دری میں چلے گئے۔ دریا کے وسط میں بنی ہوئی یہ مغلیہ دور کی عمارت اسے بڑی اٹریکٹ کیا کرتی تھی۔ سلمان اور وہ بارہ دری کے مختلف حصوں میں پھرتے اور باتیں کرتے رہے۔ پھر جب شام ڈھلنے لگی تو وہ دونوں ایک بار پھر کشتی کے ذریعے بارہ دری سے واپس کنارے پر آ گئے تھے۔

کنارے سے اوپر سڑک پر جانے کے لیے انہوں نے چلنا شروع کیا تھا جب فلک نے پھٹے کپڑوں اور لمبے بالوں اور داڑھی والے ایک فقیر کو دیکھا تھا۔ وہ دریا کے کنارے سے کچھ فاصلے پر بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی اور بالوں میں کیچڑ لگا ہوا تھا اور پھٹے کپڑوں میں سے اس کا سیاہ سوکھا ہوا جسم نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن میں کچھ پتھر اکٹھے کیے ہوئے تھے، اور وہ وقفے وقفے سے گڑھے میں پتھر پھینک رہا تھا۔ پتھر گرنے پر کیچڑ اور پانی اچھل کر ادھر ادھر گر رہا تھا۔ ان دونوں کو فقیر کے سامنے سے گزر کر جانا تھا اور فلک کا خیال تھا کہ ان کے گزرتے وقت فقیر پانی والے گڑھے میں پتھر نہیں پھینکے گا یہی اطمینان لیے وہ باتیں کرتی ہوئی سلمان کے ساتھ اس گڑھے کے پاس سے گزرنے لگی اور اسی وقت فقیر نے اپنی گود میں رکھا ہوا

سب سے بڑا پتھر اٹھا کر گڑھے میں پھینکا تھا۔ ایک چھپاکے کے ساتھ گدلا پانی اڑ کر فلک کے چہرے اور لباس کو داغدار کر گیا تھا۔ سلمان دوسری جانب تھا اس کے کپڑوں پر بھی چھینٹے پڑے مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی مگر فلک کے سفید لباس پر وہ کیچڑ بہت نمایاں ہو گیا تھا۔

"یو ایڈیٹ! اندھے ہو تم، نظر نہیں آتا تمہیں کہ کوئی گزر رہا ہے۔" وہ غصے کے عالم میں چلائی تھی۔

"میں واقعی اندھا ہوں۔ مجھے دنیا نظر نہیں آتی۔"

وہ اگلی بات پر ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی تھی۔ اپنے حلیے کے برعکس اس فقیر کی آنکھوں اور آواز میں بہت سکون، بہت ٹھہراؤ تھا۔ اس کا لب و لہجہ بہت شائستہ تھا۔ وہ ان پڑھ نہیں لگتا تھا۔

"اگر اندھے ہو تو یہاں بیٹھ کر لوگوں کو گندا کیوں کر رہے ہو، جاؤ کہیں اور جا کر بیٹھو یا اپنے ہاتھوں پر قابو رکھو۔" اس کا غصہ پھر عود کر آیا۔

اس نے ٹشو نکال کر چہرے سے کیچڑ صاف کرنا شروع کیا تھا۔

"بی بی! تو گندگی سے کیوں ڈرتی ہے۔ تجھے کیا لگتا ہے، یہ کیچڑ تجھے کسی کی نظر سے اوجھل کر دے گا۔ تجھے لگتا ہے اتنا سا کیچڑ اس شخص کی محبت کو ختم کر دے گا۔"

اس بار اس نے عجیب سے لہجے میں سلمان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

"اس شخص کی پرواہ نہ کر۔ اللہ کی پرواہ کر۔ اللہ کو کیچڑ اور گندگی سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے۔ ہمیشہ رہتا ہے اور اس نظر کو کیچڑ کی پرواہ نہیں ہوتی۔ یہ دیکھو دیکھو۔"

وہ یک دم اٹھ کر کیچڑ کے اس گڑھے کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور پھر اس نے کیچڑ نکال نکال کر اپنے چہرے اور لباس پر ملنا شروع کر دیا۔

"دیکھو، میں تو کیچڑ سے نہیں ڈرتا۔ میں تو گندگی سے خوف نہیں کھاتا۔ جانتا ہوں۔ اس کی نظر اس کیچڑ اور گندگی پر نہیں جائے گی۔ وہ صرف میرے وجود کو دیکھے گا۔"

اس بار بات کرتے ہوئے وہ ہذیانی کیفیت میں تھا۔ وہ ٹشو کے ساتھ چہرہ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھتی رہی اور اس کے اشتعال میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔ "میں جس کی نظر میں ہوں، میرے لیے یہ کافی ہے۔ مجھے جس کی محبت چاہیے، مل چکی ہے مجھے اور کسی کی محبت کی پرواہ نہیں ہے۔"

"یہ تو دروازہ ہے، دروازے کا کام رستہ دینا ہوتا ہے یا رستہ روکنا، تیرا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ تیرا ہی کیا ہر عورت کا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ اسے لے کر کیا کرے گی تو یہ کل نہیں ہے بی بی! یہ کل نہیں ہے۔ تو کل کی خواہش کیوں نہیں کرتی وجود کی طلب کیوں ہے تجھے۔ ذات کی چاہ کیوں نہیں ہے؟" اس کا ہاتھ ایک بار پھر سلمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

"تم بھکاری لوگ رستے میں بیٹھ جاتے ہو اور پھر بکواس کرنا شروع کر دیتے ہو چلو سلمان۔"

اس نے یک دم سلمان کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلنا شروع کر دیا جو اب تک بالکل خاموشی سے ساری گفتگو سنتا رہا تھا۔

"ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے اور ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے جب تک ٹھوکر نہیں لگتی، جب تک گھٹنوں پر نہیں گرتا۔ اپنی

اوقات کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا، بس ذات بھکاری نہیں ہو سکتی۔ وجود کے مقدر میں مانگنا ہے، ذات کا وصف دینا ہے۔ میں کیا، تو کیا، بی بی! سب بھکاری ہیں۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، کبھی نہ کبھی بھکاری بننا ہی پڑتا ہے۔ مانگنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے، کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا وہ خواہش کا ختم ہو جانا مانگتا ہے۔"

وہ فقیر بلند آواز میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ اوپر سڑک کی طرف جاتے ہوئے بھی اس کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں میں آ رہی تھی اور اس کے اشتعال میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"تم بھی عجیب ہو سلمان! تم سے اتنا نہیں ہوا کہ اسے جھڑک ہی دو، وہ کس طرح مجھ سے بات کر رہا تھا۔ مگر تم بالکل چپ کھڑے رہے۔"

اس نے یک دم سلمان سے کہنا شروع کیا تھا۔

"میں کیا کہتا اسے، وہ کوئی پاگل تھا۔ اس سے بحث کر کے مجھے کیا ملتا؟ تم نے بھی تو بحث کی ہے کیا فائدہ ہوا؟ بہتر تھا، تم بات بڑھاتیں ہی نہ، خاموشی سے نظر انداز کر کے وہاں سے آ جاتیں۔"

سلمان نے اس سے کہا تھا۔ وہ اس کی بات پر کچھ اور بھڑک اٹھی۔ "اسے نظر انداز کر کے آ جاتی تاکہ وہ کسی اور کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتا، پاگل نہیں تھا وہ، ڈھونگی تھا۔ دیکھا نہیں کس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ کیا باتوں سے اس کے پاگل پن کا پتہ چلتا ہے؟ نئے نئے طریقے اپنائے ہوئے ہیں ان لوگوں نے بھیک مانگنے کے۔ ہر جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور تمہارے جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی ان کا حوصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا، میں وہی پتھر اٹھا کر اس کے سر پر ماروں۔ اسے پتا تو چلے۔ اندھا ہے وہ الو کا پٹھا۔" اس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"کول ڈاؤن یار! اب اتنا زیادہ غصہ کرنے کا کیا فائدہ ہے، جو ہو گیا ہو گیا۔ اب ان باتوں کو دہرانے کا کیا فائدہ، گھر چل رہے ہیں، تم کپڑے بدل لینا بلکہ نہا لینا۔ یہ کیچڑ ختم ہو جائے گی تم خوامخواہ اس بات کو سر پر سوار کر رہی ہو۔"

سلمان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ "خیر میں کسی بھی بات کو خوامخواہ سر پر سوار نہیں کیا کرتی۔ جو بات ٹھیک تھی، میں نے وہی کہی ہے۔ آئندہ کم از کم کسی دوسرے کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے دس بار سوچے گا۔" اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا مگر اس نے مزید کوئی بات نہیں کی تھی سلمان نے بھی اس کے خاموش ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا گھر پہنچنے تک اس کے ذہن سے یہ بات نکل چکی تھی۔

اس واقعہ کو تقریباً چھ ماہ گزر گئے جب اس نے سلمان میں کچھ تبدیلیاں نوٹ کرنی شروع کی تھیں۔ شادی کے ڈھائی سال اور اس سے پہلے کے تین سال جو اس نے سلمان کے ساتھ گزارے تھے۔ ان میں اس نے سلمان کو ایک بے حد ٹھنڈے مزاج کا انسان پایا تھا۔ وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی فوری ردعمل کا اظہار نہیں کرتا تھا اور نہ ہی غصہ میں آتا تھا بلکہ اپنی ناراضگی کا اظہار بھی بڑے دھیمے لہجے میں کرتا تھا لیکن اب وہ یک دم چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑکنے لگا تھا۔

فلک نے پہلے اس بات پر اتنی توجہ نہیں دی۔ لیکن پھر جب ایسا اکثر ہونے لگا تھا تو وہ کچھ پریشان ہوئی لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر سب کچھ نظر انداز کرنے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے فیکٹری کے کسی معاملے کی وجہ سے وہ پریشان ہو۔ اس نے سلمان سے یہ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر ان

دنوں وہ اس کی کسی بھی بات کا ڈھنگ سے جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ ہر وقت جھنجھلایا رہتا تھا اور کسی بھی چھوٹی سی بات پر اسے فلک پر اپنا غصہ اتارنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نے پہلے کی طرح فلک کے ساتھ اس کے میکے جانا چھوڑ دیا تھا بلکہ اسے فلک کے وہاں جانے پر بھی اعتراض ہونے لگا تھا اس کا خیال تھا کہ فلک کو اپنے گھر سے زیادہ، اپنے ماں باپ کے گھر میں دلچسپی تھی اور وہ اپنا زیادہ وقت وہاں گزارنا چاہتی تھی۔ جب ایک دو بار اس نے اس طرح کی باتیں کیں تو فلک نے بہتری اسی میں سمجھی کہ وہ فی الحال اپنے والدین کے گھر جانا چھوڑ دے اس کا خیال تھا کہ اگر اس کی ناراضگی اور رویے میں تبدیلی کی وجہ یہ ہے تو یہ وجہ ختم ہونے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا، اس کے اعتراض اور نکتہ چینیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے کی طرح اب وہ ہر شام اسے اپنے ساتھ باہر لے کر نہیں جاتا تھا اور فلک کے اصرار پر وہ بگڑ جاتا تھا اس کا خیال تھا کہ اسے صرف باہر گھومنے پھرنے سے دلچسپی ہے گھر کا کوئی خیال نہیں۔

یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا اور فلک حقیقت میں پریشان ہو گئی تھی پھر ان ہی دنوں وہ گھر سے رات دیر تک غائب رہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے اس کی عادت تھی کہ وہ صبح نو بجے فیکٹری جاتا اور شام پانچ بجے گھر آ جاتا۔ اگر اسے ایمرجنسی میں کہیں اور جانا پڑتا یا فیکٹری میں رکنا پڑتا تو وہ فلک کو اطلاع دے دیا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ پانچ بجے کے بجائے رات دس گیارہ بجے واپس آنے لگا تھا۔ اگر فلک اس سے پوچھنے کی کوشش کرتی تو وہ کہتا۔

"میری مرضی، میں جب چاہوں گھر میں آؤں اور ضروری نہیں ہے کہ میں جہاں جاؤں، تمہیں اطلاع دے کر جاؤں۔ میں تمہارا ملازم نہیں ہوں۔"

فلک اس کی بات سے زیادہ اس کے لہجے پر روہانسی ہو جاتی۔

"لیکن میں پریشان ہو جاتی ہوں۔"

"تم کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ننھا بچہ نہیں ہوں۔" وہ بات ہی ختم کر دیتا تھا۔

فلک اس صورت حال سے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ رشنا شادی کے بعد کوئٹہ چلی گئی تھی وہ اس کے ساتھ یہ سب ڈسکس نہیں کر سکتی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے مریم سے بات کی تھی۔ وہ اس کی بات پر جیسے اچھل پڑی تھی۔

"اتنے مہینوں سے سلمان کا یہ رویہ ہے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"میں نے تمہیں کیا کسی کو بھی نہیں بتایا۔ میرا خیال تھا وہ کسی وجہ سے پریشان ہے اس لیے وقتی طور پر اس طرح ہو گیا ہے مگر اب تو۔"

"تم احمق ہو جو تم نے اسے اتنی ڈھیل دے دی۔ یہ سب اس کے آگے پیچھے پھرنے کا نتیجہ ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی اور لڑکی کے چکر میں ہے۔"

وہ مریم کے اندازے پر ہکا بکا رہ گئی۔

"تم کیا کہہ رہی ہو مریم؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ سلمان اس طرح کا نہیں ہے اور ابھی تو ہماری شادی کو صرف ڈھائی تین سال ہوئے ہیں۔"

وہ جیسے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

"تم اگر حقیقت کا سامنا نہیں کرنا چاہتیں تو اور بات ہے ورنہ اس طرح بات بے بات لڑنا، تم میں نقص نکالنا، تمہارے کاموں پر اعتراض

کرنا، راتوں کو دیر تک گھر سے باہر رہنا اس سب کا مطلب ایک ہی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور موصوفہ آ چکی ہیں۔"

وہ ہونق بنی مریم کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"تو پھر اب میں کیا کروں مریم؟ اب کیا ہو گا؟"

کچھ لمحے گزرنے کے بعد اسے مریم کی باتوں پر یقین آنے لگا تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ تم ذرا خود پر پہلے سے زیادہ دھیان دو، ذرا اچھے اور ٹھیک ٹھاک قسم کے کپڑے پہنو۔ اس پر زیادہ توجہ دو۔ ہو سکے تو اس کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے کہیں باہر چلی جاؤ جن باتوں پر اسے اعتراض ہے، وہ چیزیں ہونے ہی نہ دو کوشش کرو کہ اسے کسی بات پر اعتراض کا موقع ہی نہ ملے اور پھر بھی اگر وہ ٹھیک نہیں ہوتا تو اس سے صاف صاف بات کرو کہ اس کے اس رویے کی کیا وجہ ہے وہ کیا چاہتا ہے۔"

مریم نے اسے جیسے گر بتانے شروع کر دیے تھے۔ وہ بڑے انہماک سے اس کی باتیں سنتی رہی، اس کے گھر سے واپسی پر وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے بیوٹی پارلر چلی گئی تھی۔ اس نے وہاں جا کر اپنا ہیئر اسٹائل تبدیل کر دیا۔

بالوں میں اسٹریکس ڈلوائیں۔ آئی براؤز کی شیپ کو کچھ اور تیکھا کر دیا۔ واپس گھر آنے کے بعد اس نے سلمان کا پسندیدہ لباس پہنا تھا مگر میک اپ کرنے کے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ کبھی بھی اتنی خوبصورت اور فریش نہیں لگی تھی جتنی آج لگ رہی تھی۔

وہ رات گیارہ بجے آیا تھا اور خلاف معمول اس نے فلک کو لاؤنج میں دیکھا تھا۔ اس نے کچھ حیرانی سے اس کی تیاریوں کو دیکھا تھا اور پھر ایک لفظ بھی بولے بغیر بیڈ روم میں چلا گیا۔ وہ کچھ دل گرفتہ ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اتنی خوبصورت لگ رہی ہے کہ وہ چند لمحوں تک تو اس سے نظر نہیں ہٹا پائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی نظر بہت سرسری تھی۔

وہ اس کے پیچھے بیڈ روم میں چلی آئی۔ "میں کھانا لگا دوں؟" خود پر قابو پا کر اس نے بڑے ہشاش بشاش انداز میں پوچھا تھا۔

وہ ایک بار پھر ٹھٹھکا تھا۔ "کیا میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں کہ اس وقت کھانا کھانے بیٹھوں گا۔"

"لیکن میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔"

"کیوں نہیں کھایا؟ روز تو کھا لیتی ہو تم پھر آج اس خاص عنایت کی وجہ کیا ہے؟ بہرحال کھانا نہیں کھایا تو کھا لو۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔" وہ بیڈ پر بیٹھا ہوا شوز اتار رہا تھا۔

"میں نے آج تمہاری پسند کی ڈشز بنوائی ہیں۔" وہ اب مایوس ہو رہی تھی۔

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے ان ڈشز میں اور ہاں ایک بات اور۔" وہ واش روم کی طرف جاتے جاتے مڑا تھا۔

"کیا سارا دن اس تماشے سے تمہارا دل نہیں بھرتا جو اب تم رات کو بھی اسے لے کر بیٹھ گئی ہو۔ تم بیوی ہو، ماڈل یا ایکٹریس نہ بنو۔" اس کا

اشارہ اس کے میک اپ اور کپڑوں کی طرف تھا۔ وہ سن ہو گئی تھی۔

"اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ پہلے تو۔ کیا واقعی کوئی دوسری لڑکی۔"

وہ ایک بار پھر خوفزدہ ہو گئی تھی۔ سلمان انصر کے معمولات کو اس کی کسی "کوشش" نے نہیں توڑا تھا۔ وہ جس طرح چاہتا رہتا جہاں چاہتا جاتا، جب چاہتا گھر آتا اور جب دل چاہتا گھر نہ آتا۔ دن بہ دن فلک کی فرسٹریشن میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے، مجھے بتاؤ۔ سلمان تمہیں کیا ہوا ہے؟"

وہ اس دن اس کے انتظار میں رات کے دو بجے تک بیٹھی رہی تھی اور اس کے آتے ہی اس نے اس سے پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جواب دیئے بغیر سیدھا بیڈ روم میں چلا گیا تھا۔ وہ چیختی ہوئی اس کے پیچھے گئی۔ سلمان اپنی ٹائی کھول رہا تھا۔

"سلمان! میرے ساتھ اس طرح کیوں کر رہے ہو؟ میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟" وہ اس کے مقابل آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ سرد نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بازو پکڑ کر سامنے سے ہٹا کر ڈریسنگ میں چلا گیا۔ وہ برف کے مجسمے کی طرح وہیں کھڑی رہی۔

"میں تمہارے سامنے آتی تھی تو سلمان! تمہارا سانس رک جاتا تھا۔ میں بالمقابل آتی تھی تو تمہاری نظر کو اسیر کر لیتی تھی تمہارے وجود کو ہپناٹائز کر دیتی تھی۔ تم میرے معمول بن جاتے تھے۔ اب تم میں یہ طاقت کہاں سے آ گئی کہ تم مجھے سامنے سے ہٹا دو۔ میرا جادو توڑ دو۔ مجھ سے نظر چرا جاؤ۔ سلمان انصر میرا خدشہ ٹھیک ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان کوئی تیسرا آ گیا ہے، نہیں آ گئی ہے۔ کوئی فلک سے بڑھ کر، کوئی فلک سے بہتر اور اب تمہارے وجود پر کیا اسکا جادو چلا کرے گا۔"

اس کا دل چاہ رہا تھا وہ زور زور سے چلائے چیخے اسے بتائے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اسے یاد دلائے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا تھا۔ وہ وہیں بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ چند منٹ بعد نائٹ ڈریس میں ملبوس ڈریسنگ سے باہر آ گیا تھا۔ فلک نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کے چہرے کو پڑھنا شروع کر دیا تھا اسے وہ بے حد تھکا بہت بجھا بجھا لگا تھا۔ سلمان نے اپنے بیڈ کی طرف جاتے ہوئے ایک نظر اس کے چہرے پر دوڑائی تھی۔ اس کے گال آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے وہ آنکھیں چرا کر اپنے بیڈ کی طرف چلا گیا۔ فلک کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مارا تھا۔

"تو اب میرے آنسوؤں میں بھی اتنی طاقت نہیں رہی کہ یہ تمہیں باندھ لیں۔ تمہیں ہلنے نہ دیں۔ کیا ہر چیز آج ہی بے اثر ہو جائے گی۔"

"فلک اور کچھ بھی کرو مگر میرے سامنے رویا مت کرو۔ میں تمہارے آنسو برداشت نہیں کر سکتا ہوں، دنیا میں کون سی چیز ہے جو تمہیں رونے پر مجبور کرتی ہے۔ مجھے بتاؤ۔ میں وہ چیز ہی ختم کر دوں گا۔ میں نے تم سے شادی تمہیں رلانے کے لیے نہیں کی ہے۔ تمہارے آنسو دیکھنے کے لیے نہیں کی ہے۔ تم جانتی ہو تمہاری آنکھوں کو خدا نے آنسوؤں کے لیے نہیں بنایا ہے تمہاری آنکھوں کو ہنسنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ فلک! رونے کے لیے نہیں۔ تم روتی ہو تو مجھے لگتا ہے جیسے دنیا میں کچھ بھی باقی نہیں رہا، جیسے دنیا ختم ہو گئی ہے۔"

اسے یاد آ رہا تھا، یہ سب اسی شخص نے تو کہا تھا اور آج اس کو میرے آنسو نظر نہیں آئے۔ آج میرے آنسو دیکھ کر کیا اس کے لیے دنیا ختم نہیں ہوئی؟ کیا اس کا سب کچھ باقی رہ گیا ہے۔

وہ یک دم سسک سسک کر رونے لگی تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹ کر لائٹ آف کر چکا تھا۔

”فار گاڈ سیک بند کرو یہ رونا دھونا۔ کیا چاہتی ہو تم کہ میں یہاں نہیں آیا کروں۔ کیا اس گھر سے چلا جاؤں کہیں۔“

وہ ایک دم اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بیڈ پر اپنا سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ فلک نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کر دی۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”تمہیں میں اتنی بری کیوں لگنے لگی ہوں سلمان! بات کرتی ہوں تو تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ ہنستی ہوں تو تمہیں برا لگتا ہے۔ روتی ہوں تو تم چلاتے ہو۔ اتنی نفرت کیوں ہو گئی ہے تمہیں مجھ سے پہلے تو کبھی بھی نہیں تھے۔ تم مجھے دیکھنا نہیں چاہتے میری آواز سننا نہیں چاہتے تم ایسے نہیں تھے۔ سلمان! تم کبھی بھی ایسے نہیں تھے۔“

اس نے بات کرتے ہوئے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ اسے جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھ گیا تھا۔

”میں خود نہیں جانتا، مجھے کیا ہو گیا ہے؟“

اس نے فریج کے پاس جا کر پانی کی بوتل نکالی تھی اور اسے کھول کر پانی کے چند گھونٹ پیے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتی رہی، وہ اب بوتل ہاتھ میں لیے بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔

”کیا تم کسی اور سے محبت کرنے لگے ہو؟“

اس نے سانس روکتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ وہ یک دم اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر شکست خوردگی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ آ کر اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ ابھی تک سانس روکے پلکیں جھپکائے بغیر اس کے جواب کی منتظر تھی۔

”کیا کوئی اور؟“ اس نے ایک بار پھر پوچھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

”ہاں فلک! میں کسی اور سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

اسے پہلی بار پتہ چلا تھا، کانوں میں سیسہ اترنا کسے کہتے ہیں۔ وہ بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھے گئی۔ ”کیا فلک کے ہو سلمان اصغر کو کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟ کیا فلک کے ہوتے ہوئے سلمان اصغر کو کسی سے محبت ہو سکتی ہے؟“ وہ جیسے گنگ ہو گئی تھی۔

”اب کیا پوچھنا چاہتے؟ وہ کون ہے؟ کیسی ہے؟ یا پھر یہ کہ تمہیں اس سے محبت کیسے ہوئی؟ کیوں ہوئی؟ یا یہ کہ تم اس سے کہاں ملے؟ کیوں ملے؟ یا پھر یہ کہ تم نے مجھ سے یہ سب کیوں چھپایا؟ مجھے دھوکا کیوں دیا؟“

وہ سوالوں کا انبار ذہن میں لیے لرزتے جسم کے ساتھ وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔

”میں نہیں جانتا، یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا، تمہارے ساتھ بے وفائی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ یقین کرو فلک! میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کیا۔“

وہ سر ہاتھوں میں تھامے بول رہا تھا۔ وہ کسی مجسمے کی طرح اسے دیکھتی رہی۔

"وہ میری فیکٹری میں کام کرتی ہے، پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں اس کا نام تابندہ ہے۔"

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟" اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"خوب صورت؟ تم نہیں جانتیں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے۔ میں اسے اگر دن میں ایک بار دیکھوں تو یقین کرو، میں کچھ اور دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ یقین کرو فلک! میں چاہوں بھی تو کچھ اور دیکھ نہیں پاتا۔ مجھے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ تم نے کبھی کسی چمگادڑ کو دن کے وقت دیکھا ہے فلک! میں اس کا چہرہ دیکھے بغیر بالکل ویسا ہی ہو جاتا ہوں۔"

وہ بول رہا تھا، فلک کا چہرہ آنسوؤں سے ایک بار پھر بھیگنے لگا تھا۔

"سلمان! کیا وہ تم سے، مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے؟" اس نے ڈوبتے ہوئے جہاز کے کسی بادبان کو کھینچنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں، وہ کرتی ہے، وہ دنیا میں سب سے زیادہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ وہ یہی کہتی ہے اور مجھے اس کی باتوں پر یقین ہے۔" وہ اب اس کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"کوئی تمہیں مجھ سے زیادہ کیسے چاہ سکتا ہے؟"

"وہ چاہتی ہے، تابندہ چاہتی ہے۔ میں جانتا ہوں۔"

"وہ جھوٹ بولتی ہے سلمان! وہ غلط کہتی ہے۔" اس نے کسی ننھے بچے کی طرح روتے ہوئے سلمان کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"نہیں، وہ جھوٹ نہیں بولتی۔ تابندہ کبھی جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف پر یقین ہے۔ میں نہیں جانتا، یہ کیوں ہے مگر فلک! وہ بولتی ہے تو میرا دل چاہتا ہے، اس پر اعتبار کرنے کو۔ میرا دل گواہی دیتا ہے اس کے ایک ایک لفظ کی سچائی کی۔ اس پر یقین کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے جیسے اس سے محبت کرنا یا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔" وہ کسی آری کے ساتھ اسے کاٹ رہا تھا۔

"تم اس سے محبت کیسے کر سکتے ہو سلمان! تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے۔" اس نے جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے نہیں پتا میں تم سے محبت کرتا تھا یا نہیں مگر مجھے اس سے محبت ہے۔ نہیں محبت نہیں مجھے عشق ہے، یہ وہ ہے۔ تم نے ایک بار کہا تھا فلک! محبت تو رگوں میں خون بن کر بہتی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو مجھے پتا چلا، یہ کیسے ہوتا ہے؟ فلک! میں اسے دیکھتا ہوں تو بے اختیار ہو جاتا ہوں، وہ جو کہتی ہے میں وہی کرتا ہوں۔ وہ جو چاہتی ہے۔ مجھ سے وہی ہوتا ہے۔ میں اس کی آواز نہ سنوں تو مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی وہ ہنستی ہے تو اس کے ہر قہقہے کے ساتھ میرے دل کی ایک دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ وہ قدم اٹھائے تو میرا دل چاہتا ہے میں زمین بن جاؤں۔ صرف اس لیے کہ اس کے پیروں کے نیچے آ جاؤں وہ مجھ پر سے گزرے اس کے پیروں کو بھی اگر کوئی چیز چھوئے تو وہ میرا وجود ہو۔ وہ رکے تو میرا دل چاہتا ہے، دنیا کی ہر حرکت کرنے والی چیز کو روک دوں، ہر چیز کو چاہے وہ انسان ہو یا مشین یا پھر ہوا یا بہتا پانی۔ میں اسے سب کچھ دے دینا چاہتا ہوں سب کچھ، ہر چیز جو میرے پاس ہے۔ میں اسے دے دینا چاہتا ہوں چاہے وہ اسے رکھے یا آگ لگا دے یا کسی کو دے دے۔ مجھے پروا نہیں بس میں اسے خوش کرنا چاہتا ہوں۔ اسے بتانا چاہتا

ہوں کہ مجھے، مجھے اس سے عشق ہے۔ تم نہیں جانتیں فلک وہ اگر ایک خنجر لے کر میرے وجود کو کاٹنا شروع کر دے۔ ایک ایک پور، انگلی، ہاتھ، کلائی، بازو، کہنی، کندھا تو میں اسے اپنا ایک ایک حصہ دیتا رہوں گا۔ کسی ہچکچاہٹ، کسی اعتراض کے بغیر اسے حق ہے چاہے تو رہنے دے چاہے تو کاٹے چاہے تو جلا دے۔ مگر سب اپنے ہاتھ سے کرے اپنے ہاتھ سے میں نہیں جانتا فلک، یہ سب کیسے ہوا ہے؟ کیوں ہوا ہے مگر یہ سب ہو چکا ہے۔ میں تابندہ کے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ ہر چیز کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر نہیں۔ اس کے بغیر رہوں گا تو نہ مجھے کچھ نظر آئے گا، نہ میں کچھ سن سکوں گا نہ کچھ بول سکوں گا۔ میں ایسی زندگی گزارنا نہیں چاہتا فلک! میں ایسی زندگی گزارنا نہیں چاہتا۔“

وہ اب رو رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا اس نے کبھی سلمان انصر کو روتے دیکھا ہو، یوں بلک بلک کر پھوٹ پھوٹ کر زار و قطار اور وہ بھی ایک عورت کے لیے۔ ایک دوسری عورت کے لیے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسے بتائے کہ میرے لیے تم وہی سب کچھ ہو جو وہ تمہارے لیے ہو گئی ہے۔ میں بھی تمہیں دیکھے بغیر اندھی ہو جاتی ہوں۔ میں بھی تمہاری آواز سنے بغیر کچھ اور سننے کے قابل نہیں رہتی۔ میں بھی تم سے باتیں کیے بغیر کسی دوسرے سے بات نہیں کر سکتی پھر تمہیں یہ سب کچھ پتا کیوں نہیں چلا۔ مگر وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی تھی۔

”میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں فلک! تم اجازت دو گی تو بھی، نہیں دو گی تو بھی میں اس سے شادی کروں گا۔ مگر میں چاہتا ہوں یہ کام تمہاری رضامندی سے ہو۔ ہم دونوں نے بہت سا وقت اکٹھے گزارا ہے۔ اچھا وقت گزارا ہے۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں تمہیں ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا مگر میں تابندہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم تو محبت کرتی ہو مجھ سے۔ جو محبت کرتے ہیں وہ تو بہت بڑی بڑی قربانیاں دے دیتے ہیں کیا تم مجھے اس سے شادی کی اجازت نہیں دے سکتیں۔“

وہ اب اس کا ہاتھ تھامے اس سے کہہ رہا تھا۔ صورِ اسرافیل کیسا ہو گا؟ وہ اب اندازہ لگا سکتی تھی۔

”میں بھی تو تم سے محبت کرتی ہوں، اتنی نہیں بلکہ اس سے زیادہ محبت جتنی وہ لڑکی تم سے کرتی ہے۔“

اس نے اپنے مہروں کو آگے بڑھانے کی آخری کوشش کی تھی۔ وہ مایوسی سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”مگر مجھے تمہاری محبت کی ضرورت نہیں ہے، مجھے اس کی محبت کی ضرورت ہے۔“

”میں نے کون سی غلطی کی ہے سلمان؟“

”مجھے نہیں پتا بس مجھے اس سے محبت ہے۔“

”میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا، پچھلے تین سال میں کیا نہیں کیا؟“

”مجھے اس کی پروا نہیں ہے، مجھے بس وہ چاہیے۔“

”میں نے پچھلے تین سال میں زندگی کو ویسے گزارا ہے۔ جیسے تم نے چاہا ہے پھر بھی تم مجھ سے خوش نہیں ہو۔ بیزار ہو گئے ہو۔“

”تو میں کیا کروں، میں نے تم سے نہیں کہا تھا تم نے یہ سب اپنی مرضی سے کیا۔ مگر مجھے صرف تابندہ کی ضرورت ہے۔“

”تم مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔ مجھ سے محبت کرنے لگو مجھے ٹھکراؤ نا؟“

"مجھے تمہاری ضرورت ہی نہیں۔ مجھے تمہاری کوئی بات کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی کیونکہ تم تابندہ نہیں ہو۔"

"میں نے تم سے محبت کی ہے، جو محبت کرتے ہیں، کیا انہیں اس طرح ٹھوکر ماری جاتی ہے۔ کیا تم مجھے اس طرح چھوڑ دو گے؟"

"جو بھی چیز میرے اور تابندہ کے درمیان آئے گی، میں اسے چھوڑ دوں گا۔ مجھے پرواہ نہیں ہے کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ میرے لیے بس وہ کافی ہے۔"

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"مگر مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تابندہ کی ضرورت ہے۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ تمہیں بانٹنا نہیں چاہتی کسی کے ساتھ، تمہاری محبت میں کمی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"تم چاہو گی تو میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا لیکن تمہیں مجھ سے دستبردار ہونا ہی پڑے گا۔ تابندہ کو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔"

"یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ تم جو چاہو کر سکتی ہو۔"

"تم نہیں جانتے تم میرے لیے کیا ہو؟"

"مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"تابندہ میں ایسا کیا ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔"

"یہ میں نہیں جانتا بس میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

"پھر تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی؟"

"پتا نہیں، مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی، اگر مجھے علم ہوتا کہ میری زندگی میں تابندہ آئے گی تو میں کبھی تم سے شادی نہ کرتا۔"

"میرا وجود تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"نہیں، یہ میرے لیے۔ کچھ نہیں ہے سب کچھ تابندہ ہے۔"

ہر میرہ ہوری باری ہٹ گیا تھا۔ اس کا سانس گھٹنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ لاؤنج میں خاموشی بھی تھی اور تاریکی بھی۔ یہ دونوں چیزیں اس کے اندر تھیں۔ وہ لائٹ آن کر کے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

"دنیا میں تم سے زیادہ مکمل کوئی دوسری لڑکی نہیں ہے۔" بہت عرصہ پہلے سمعان کی کہی ہوئی ایک بات اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔

"اور اب مجھ سے زیادہ بہتر، زیادہ مکمل تمہیں کوئی دوسری مل گئی ہے۔"

اس نے اپنی آستین سے چہرہ رگڑا تھا۔ پھر اس کے دل میں پتا نہیں کیا آئی۔ وہ اٹھ کر واش روم میں آ گئی۔ دیوار پر لگے ہوئے بے چوڑے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ پھر اس نے اپنے بالوں میں لگا ہوا کلپ اتار دیا۔ اس کے سیاہ سلکی اسٹیپس میں

کٹے ہوئے بال کاندھوں پر بکھر گئے تھے۔ اس نے واش بیسن کے نل میں سے پانی لے کر چہرے پر چھینٹے مارے تھے، پھر تولیہ سٹینڈ سے تولیہ لے کر چہرے کو خشک کیا۔

"کیا میں خوبصورت نہیں رہی؟" اس نے جیسے آئینے سے سوال کیا تھا۔ "کیا میں بدصورت ہو گئی ہوں؟ کیا میری آنکھیں اب دلوں کو تسخیر کرنے کے قابل نہیں رہیں؟ کیا میری مسکراہٹ اپنی کشش کھو چکی ہے؟ کیا میرے ہونٹ اور ناک حسن نہیں صرف گوشت کے ٹکڑے ہیں؟ کیا میری دودھیا رنگت میں کوئی فرق آ گیا ہے؟" وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کر سوچتی رہی۔

"کچھ بھی نہیں بدلا، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ نہ آنکھیں نہ ہونٹ نہ رنگت نہ ناک نہ چہرہ نہ بال نہ جسم، کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ پھر اس کا دل کیسے بدل گیا ہے، نظر کیسے بدل گئی ہے۔"

اس نے آئینے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ آئینہ حسن دکھا رہا تھا سلک کی سلیولیس سفید نائٹی میں ملبوس سنگ مرمر سے تراشیدہ ایک وجود جو سر سے پاؤں تک حسن میں ڈھلا ہوا تھا۔

"کہیں کوئی عیب، کوئی نقص" اس نے تلاش کرنا شروع کیا تھا۔ "ہر چیز مکمل ہے پھر بھی" اس نے مایوسی سے آئینے کو دیکھا تھا۔ "اگر عشق حسن سے ہوتا ہے تو میں حسن ہوں پھر وہ۔۔۔ وہ تابندہ۔"

ایک آگ اس کے وجود کو اپنے حصار میں لپیٹنے لگی تھی۔

"ہاں کوئی تو بات ہو گی اس میں، کوئی تو چیز ہو گی اس میں جو سلمان کو مجھ میں ملی جو اسے مجھ سے دور لے گئی۔ جس نے اس کا دل مجھ سے پھیر دیا۔ مجھے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ کیا ہے اس عورت میں جس نے سلمان انصر کو یوں مسمرائز کر دیا ہے کہ اسے دنیا نظر نہیں آتی۔ فلک شیر افگن نظر نہیں آتی۔ مجھے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ کیا ہے ان قدموں میں جن کے نیچے وہ اپنے وجود کو مٹی بنا کر بکھیر دینا چاہتا ہے۔ صرف اس چاہ میں کہ وہ قدم اس مٹی کو چھو لیں۔ کیا وہ میرے پیروں سے زیادہ خوبصورت ہو سکتے ہیں۔"

اس نے اپنی نائٹی کو اٹھا کر جھک کر اپنے پیر دیکھے تھے۔ وہ اتنے ہی دودھیا، اتنے ہی نرم و نازک، اتنے ہی مکمل تھے جتنا اس کے وجود کا کوئی دوسرا حصہ۔

"مجھے بھی تو دیکھنا چاہیے، وہ کیسا وجود ہے جس کے نام وہ اپنی ساری زندگی کر دینا چاہتا ہے۔ وہ کیسے ہاتھ ہیں جو اسے خنجر سے کاٹ دیں تو اسے شکایت نہیں ہو گی۔ وہ کون سے ہونٹ ہیں جو بات کریں تو اسے دنیا میں کچھ اور سنائی نہیں دیتا، وہ کون سا وجود ہے جو رکے تو وہ ہوا کو روک دینا چاہتا ہے۔" وہ ایک پھر چیخ رہی تھی۔

"اور اگر وہ۔۔۔ وہ عورت مجھ سے زیادہ خوبصورت ہوئی تو۔۔۔ تو پھر میں کیا کروں گی۔ کیا اسے سلمان پر قابض ہونے دوں۔ کیا اس کا رستہ خالی چھوڑ دوں۔ میں کیا کروں گی۔ کیا کروں گی؟ ہاں میں اس حسن کو ختم کر دوں گی، جس نے سلمان کو پاگل بنا دیا ہے۔ میں اسے اس قابل نہیں چھوڑوں گی کہ وہ اسے دوبارہ دیکھے۔ دوبارہ اس کی طرف جائے۔ میں اس کا وہ چہرہ ہی بگاڑ دوں گی جس نے سلمان کو اپنا اسیر کیا ہے۔ وہ آنکھیں مٹا دوں گی، جس نے۔"

وہ آئینے کے سامنے کھڑی کسی پاگل کی طرح خود سے باتیں کر رہی تھی۔

بہت دیر بعد وہ تھکے تھکے قدموں سے واش روم سے باہر نکل آئی۔۔ لاؤنج کے صوفے پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ آنسو ایک بار پھر چہرے پر پھیلنے لگے۔

"تم جانتے ہی نہیں، تمہیں یا تمہاری محبت کو کھونے سے بڑھ کر کوئی نشتر نہیں ہے، جو کوئی مجھے لگا سکتا ہے۔ کیا نہیں ہے میرے پاس؟ سب کچھ ہی تو ہے۔ اب اگر نہیں ہے تو صرف تم نہیں ہو۔ میں تو تمہیں اپنے سائے کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ کسی دوسری عورت کے ساتھ کیسے کروں۔ کیسے برداشت کر لوں کہ میرے علاوہ تم کسی اور سے بات کرو۔ کسی عورت کا ہاتھ تھامو۔ کسی اور کے آنسو پونچھو۔ کسی اور کو اپنا نام دو۔ تابندہ سلمان! نہیں میں، تو تمہارے پیار کی ایک دھجی تک کسی کو نہیں دے سکتی۔ تمہارے پورے وجود کو کس طرح دے دوں اور وہ بھی اپنے ہاتھ، اپنی مرضی سے یہ نہیں کر سکتی۔ سلمان انصر! بس میں یہ نہیں کر سکتی۔ تمہارے بدلے چاہے کوئی مجھ سے سب کچھ لے لے مگر مجھے تمہارا وجود چاہیے۔ تمہیں میں کسی کو نہیں دے سکتی۔ اس عورت کو کیا محبت ہو گی تم سے اس کو تو پیسہ چاہیے ہوگا۔ میں اسے پیسہ ہی دوں گی۔ تمہیں خرید لوں گی اس سے اور اگر یہ نہ ہوا، تو پھر میں اس کے چہرے کو تیزاب سے جلا دوں گی۔ اسے اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گی کہ تم دوبارہ کبھی اس پر نظر ڈالو۔" وہ روتے روتے پتا نہیں کس وقت سو گئی تھی۔

صبح جس وقت اس کی آنکھ کھلی، گھر میں نوکر آ چکے تھے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی، کمرہ خالی تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا، اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح آنکھیں کھولے چھت کو گھورتی ہوئی وہیں پڑی رہی پھر وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گئی تھی۔ شاور لینے کے بعد خاص طور پر منتخب کیے ہوئے کپڑے پہن کر وہ باہر نکلی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنے بالوں میں رولرز لگانے شروع کیے وہ آج بہت خاص بن کر وہاں جانا چاہتی تھی۔ بہت ہی خاص بن کر وہ اس عورت کو دکھانا چاہتی تھی کہ سلمان انصر کی بیوی کیا ہے، فلک کیا ہے۔

آدھ گھنٹے بعد میک اپ مکمل کرنے کے بعد اس نے رولرز اتار کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا تھا۔ بہت دیر تک وہ اپنے عکس سے نظریں نہیں ہٹا سکی۔ زمردی رنگ کی سلک کی ساڑھی اور ڈارک گرین کلر کے کھلے گلے کے نیٹ کے بلاؤز میں وہ ایک مکمل عورت لگ رہی تھی۔ کسی خامی، کسی کمی کے بغیر۔ اس نے بہت سنجیدگی سے ایک بار پھر خود پر نظریں دوڑائی تھیں پھر اس نے Chanel 5 نکال کر گردن کے دونوں اطراف میں اس کا سپرے کیا۔ پرس اور گلاسز اٹھا کر وہ بیڈروم سے نکل آئی تھی۔

"راستے میں سے تیزاب کی ایک بوتل خرید لینا۔"

فیکٹری چلنے کا حکم دینے کے بعد اس نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ ڈرائیور نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ مگر جواباً کچھ نہیں کہا۔ ایک دکان سے تیزاب کی بوتل خریدنے کے بعد اس نے فلک کو تھما دی۔ اس نے کچھ دیر تک اسے ہاتھ میں تھامے رکھا تھا۔ پھر اس کا ڈھکنا کھول کر کارک نکال دیا۔ بوتل کا ڈھکن بند کر کے اس نے اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ فیکٹری پہنچنے کے بعد وہ سلمان کے آفس کی طرف نہیں گئی تھی بلکہ ایڈمن آفیسر کے

کمرے میں چلی گئی تھی۔

الیاس صاحب اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر گڑبڑا گئے تھے۔

"میڈم! آپ یہاں؟"

"ہاں، مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔"

وہ خود کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ الیاس صاحب کچھ نروس ہو کر بیٹھ گئے۔

"پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں تابندہ نام کی کوئی لڑکی ہے؟"

چند لمحے دفتر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے بہت سرد لہجے میں ان سے پوچھا تھا۔ وہ اس کے سوال پر کچھ اور نروس ہو گئے تھے۔

"میڈم! وہاں تو بہت سی لڑکیاں ہوں گی، جن کے نام تابندہ ہیں آپ کس لڑکی کا پوچھ رہی ہیں؟" اس نے اپنی نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ اور پریشان ہوئے تھے۔

"میں سلمان انصر والی تابندہ کا پوچھ رہی ہوں۔"

اتنے ڈائریکٹ ریفرنس پر ان کے چہرے پر پسینے آنے لگے تھے۔

"کیوں کیا یہاں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے، جس کے ساتھ سلمان انصر۔" اس نے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"میڈم! دیکھیں، مجھے تو اس بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ میں تو۔"

اس نے ان کی بات کاٹ دی تھی۔ "اگر مجھے گھر میں بیٹھ کر اس چکر کا پتا چل سکتا ہے تو میں یہ نہیں مان سکتی کہ آپ کو ان سب باتوں کا پتا نہ ہو۔ آفٹر آل آپ ایڈمن آفیسر ہیں۔ باس اور ورکرز کے روابط کا آپ کو پتا نہیں ہو گا تو کس کو پتا ہو گا۔ بہرحال، میں آپ کو کوئی الزام نہیں دے رہی ہوں۔ میں صرف اس لڑکی سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ اسے بلوائیں۔"

اس نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔ اس بار الیاس صاحب کے چہرے پر ندامت نمایاں تھی۔

"میڈم! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں لیکن میں بے بس تھا۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ آپ ورکر کو تو سمجھ سکتے ہیں مگر باس کو نہیں۔ میں نے سلمان صاحب سے بات کی تھی کہ ان کے اور اس لڑکی کے بارے میں بہت سی باتیں ہو رہی ہیں، مگر انہیں اس کی پروا ہی نہیں ہے۔ وہ اسے ہر روز چھٹی کے وقت ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ وہ پیکنگ کا کام کرتی تھی مگر سلمان صاحب نے اسے شعبہ کا انچارج بنا دیا ہے۔ میرے بات کرنے پر صاحب نے مجھے بری طرح جھڑک دیا ان کا خیال ہے کہ مجھے ان سب چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے۔ مجھے صرف اپنے کام سے کام ہونا چاہئے۔"

الیاس صاحب نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

"آپ اسے بلائیں۔" اس نے ایک بار پھر ان سے کہا تھا۔ انہوں نے بیل بجا کر چپڑاسی کو بلایا اور پھر اسے اس لڑکی کو بلانے کے لیے

بھیج دیا۔

چپڑاسی کے جانے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔

"میں یہاں آپ کی وضاحتوں کے لیے نہیں آئی ہوں، آپ خاموش رہیں۔" اس نے بڑے خشک لہجے میں ان سے کہا تھا۔ وہ سرخ چہرے کے ساتھ سر جھکا کر رہ گئے۔ وہ تیز ہوتی ہوئی دھڑکن کے ساتھ اس لڑکی کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ بے اختیار اپنی سیٹ سے کھڑی ہو کر پیچھے مڑی اور پھر جیسے وہ پتھر کی ہو گئی تھی۔

"سر! آپ نے مجھے بلوایا ہے؟" اس نے ایس صاحب سے کہا تھا۔

"ہاں میڈم تم سے۔"

"اسے بھجوا دیں۔" وہ جیسے کسی پاتال سے بولی تھی۔ سب کچھ دھواں دھواں ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اپنا جسم مفلوج ہوتا ہوا لگا تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے فلک کو دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ سانس روکے بے حس و حرکت کسی مجسمے کی طرح ابھی تک ویسے ہی کھڑی تھی۔

"تم جانتی نہیں وہ کیا ہے۔ میں اگر اسے نہ دیکھوں تو میں کچھ اور دیکھنے کے قابل نہیں رہتا۔ تم نے کبھی کسی چمگادڑ کو دن کے وقت دیکھا ہے۔ میں اس کا چہرہ دیکھے بغیر بالکل ویسا ہی ہو جاتا ہوں۔" اس کے کانوں میں کسی کی آواز آ رہی تھی۔

"یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا فلک! محبت تو رگوں میں خون بن کر بہتی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تو مجھے پتا چلا، یہ کیسے ہوتا ہے۔ وہ قدم اٹھائے تو میرا دل چاہتا ہے۔ میں زمین بن جاؤں تاکہ اس کے پیروں کو بھی اگر کوئی چیز چھوئے تو وہ میرا وجود ہو۔ تم نہیں جانتیں فلک! وہ اگر ایک خنجر لے کر میرے وجود کو کاٹنا شروع کر دے، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسے حق ہے چاہے تو مار دے، چاہے تو کاٹے چاہے تو جلا دے۔ مگر سب کچھ اپنے ہاتھ سے کرے۔" ہر لفظ اس کے چہرے کو تاریک کرتا جا رہا تھا۔

ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے اور ہر ایک خود کو ملک سمجھتا ہے جب تک ٹھوکر نہیں لگتی، جب تک گھٹنوں پر نہیں گرتا اپنی اوقات کا پتا ہی نہیں چلتا۔ وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا بس ذات بھکاری نہیں ہوتی۔ وجود کے مقدر میں مانگنا ہے۔ ذات کا وصف دینا ہے۔ میں کیا تو کیا بی بی! سب بھکاری ہیں۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں، کبھی نہ کبھی تو بھکاری بننا ہی پڑتا ہے۔ مانگنا ہی ہوتا ہے۔ کوئی عشق مانگتا ہے کوئی دنیا اور جو یہ نہیں مانگتا، وہ خواہش کا ختم ہونا مانگتا ہے۔"

اس کا وجود جیسے کسی زلزلے کی زد میں تھا۔

"اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے۔ ہمیشہ رہتا ہے اور اس نظر کو کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی۔"

چھ ماہ پہلے دریا کے کنارے اس فقیر کے کہے گئے لفظ اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

"ہاں ساری بات نظر ہی کی تو ہے جس سے اس نے مجھے محروم کر دیا ہے اور اس عورت کو نواز دیا ہے ورنہ سلمان انصر کبھی اس عورت کو تو نہ چاہتا۔ مگر یہ تو اللہ ہے نا جس نے میرے چہرے سے نظر اٹھا لی ہے پھر سلمان انصر کو کیا نظر آئے۔" وہ بڑبڑانے لگی تھی۔

"میڈم! آپ ٹھیک تو ہیں؟"

اسے ایاس صاحب کی آواز آئی تھی۔ اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا تھا۔ ایاس صاحب کو اس کی آنکھوں میں وحشت کا ایک عجیب عالم نظر آیا تھا۔ وہ نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ وہ چند لمحے کچھ کہے بغیر انہیں دیکھتی رہی پھر کرسی سے اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

"مرد تو دروازہ ہے۔ دروازے کا کام رستہ دینا ہوتا ہے یا رستہ روکنا۔ تیرا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ تیرا ہی کیا ہر عورت کا رستہ اس نے روک دیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ اسے لے کر کیا کرے گی تو۔ یہ کُل نہیں ہے بی بی! یہ کُل نہیں ہے۔ تو کُل کی خواہش کیوں نہیں کرتی وجود کی طلب کیوں ہے تجھے ذات کی چاہ کیوں نہیں ہے۔"

ذہن کی دیوار پر کچھ لفظ بار بار ابھر رہے تھے۔ ایک آواز بار بار گونج رہی تھی وہ چپ چاپ گھر آ گئی تھی۔ کمرے میں آ کر اس نے ایک ایک زیور اتار کر پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ کسی جنونی کی طرح وہ سب کچھ اتارتی گئی تھی۔ کاٹن کا ایک سوٹ پہن کر چہرہ دھو کر وہ واپس واش روم سے کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرے میں ہر طرف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ گھڑی، نیکلس، انگوٹھیاں، بریسلیٹ، چوڑیاں، ایئر رنگز وہ خالی نظروں سے ان سب چیزوں کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر صوفے سے ٹیک لگا کر کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ ٹیوب لائٹس کی روشنی کمرے میں بکھری ہوئی جیولری کو چمکا رہی تھی۔ وہ کسی بت کی طرح ان پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔ وہ نہیں جانتی کتنی دیر وہ اس طرح بیٹھی رہی تھی۔

وہ رات کے وقت واپس گھر آیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر چونکا تھا۔ وہ صوفے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔

"تم آج فیکٹری گئی تھیں؟" اپنا بریف کیس بیڈ پر پھینک کر وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور پیروں سے سر تک اس کے دراز قد وجود کو دیکھا تھا۔

"تم تابندہ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟" اس بار اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ جارحانہ تھا۔

"میں تمہیں اجازت دیتی ہوں سلمان! تم تابندہ سے شادی کر لو۔"

چند لمحے بعد جب وہ بولی تو اس کا جواب سلمان کو حیران کر گیا تھا۔ وہ اب اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں آ گئی۔ فون کا ریسیور اٹھا کر اس نے اپنے گھر کا نمبر ملانا شروع کیا تھا۔

"او فلک! یہ تم ہو۔ اس وقت کس لیے فون کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟ خاموش کیوں ہو؟"

اس کی ممی نے فون اٹھاتے ہی اس کی آواز پہچان لی تھی۔

"ممی! آپ کہتی تھیں۔ آپ نے مجھے زندگی میں سب کچھ سکھایا ہے۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رکھی۔ آپ جھوٹ بولتی ہیں ممی! آپ نے مجھے سب سے بڑی۔ سب سے اہم چیز نہیں سکھائی۔"

وہ بول رہی تھی۔ "کیا ہوا میری جان کیا نہیں سکھایا۔ تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟"

"ممی! آپ نے مجھے اللہ سے، اللہ سے محبت کرنا نہیں سکھایا۔ آپ نے، آپ نے مجھے اس کو ڈھونڈنا نہیں سکھایا۔ آپ نے مجھے کنگال کر دیا ممی آپ نے مجھے بھکاری بنا دیا۔ ایسا کیوں کیا ممی! ایسا کیوں کیا؟"

وہ اب چیخ رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

"آپ نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ ممی! مجھے تو کوئی تھامنے والا ہی نہیں رہا۔ آپ نے مجھے دنیا میں اکیلا کر دیا۔ ممی آپ نے مجھ پر ظلم کیا۔"

وہ پاگلوں کی طرح چیختی جا رہی تھی۔ گھر کے ملازم لاؤنج میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ اس کی چیخوں کی آواز سن کر سلمان بھی لاؤنج میں آ گیا تھا۔ ریسیور اب اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ نیم غشی کے عالم میں اب بھی وہی چلا رہی تھی۔

"مجھے اللہ کی محبت نہیں دی۔ مجھے۔ مجھے، اس کو ڈھونڈنا نہیں سکھایا مجھے گرا دیا۔ اس کی نظر سے گرا دیا۔"

◆

اس نے بہت آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دی تھیں، کمرے میں اس کے بیڈ کے پاس ممی بیٹھی تھیں اور تھوڑی دور کچھ فاصلے پر ایک آدمی پاپا کے پاس کھڑا تھا، وہ اس سے کچھ باتیں کر رہے تھے، اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ذہن ابھی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے اپنے اردگرد کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

"کمرہ۔ یہ کون سا کمرہ ہے۔ ہاں یاد آیا، یہ تو میرا کمرہ ہے۔ اپنے گھر میں یعنی میں سلمان کے گھر میں نہیں ہوں۔"

اس نے آہستہ آہستہ ہر چیز کو پہچاننا شروع کر دیا۔ کسی نے بھی اس کے پاس آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے اعصاب پر ایک عجیب نشہ آور کیفیت سوار تھی۔ تھوڑی دیر بعد پاپا، ور وہ آدمی اس کے پاس آ گئے تھے پھر اس نے اپنے بازو میں ہلکی سی چبھن محسوس کی تھی اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"دس پندرہ منٹ تک یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ آہستہ آہستہ نارمل ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے اب یہ پہلے کی طرح نہیں چیخیں گی۔" اس نے اپنے کانوں میں کسی کی آواز سنی تھی۔ شاید اسی آدمی کی۔ اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ غنودگی بڑھتی جا رہی تھی۔ پلکیں اور بوجھل ہو گئی تھیں۔

دوبارہ جب اسے ہوش آیا۔ تب بھی کمرے میں وہی لوگ تھے۔ ممی، پاپا ور وہ آدمی مگر اب اسے آنکھیں کھلی رکھنے میں دقت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور کچھ دیر سب کو دیکھنے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ممی نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر اس آدمی نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

"یہ اب بالکل ٹھیک ہیں اور اگر اٹھ کر بیٹھنا چاہتی ہیں تو انہیں بیٹھنے دیں بلکہ چلنے پھرنے دیں باہر جانے دیں، اس بستر میں قید کرنے کی کوشش نہ کریں نہیں ایسی کوئی تکلیف نہیں ہے کہ جو چلنے پھرنے یا اٹھنے بیٹھنے سے بڑھ جائے۔"

اس آدمی نے ممی سے کہا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟"

وہ آدمی اب اس سے مخاطب تھا۔ وہ سپاٹ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔ ایک بار پھر سے سب کچھ یاد آنا شروع ہو گیا تھا۔

"میرا خیال ہے، انہیں ابھی فی الحال میری مزید ضرورت نہیں ہے۔ آپ تھوڑی دیر بعد ان کی مرضی پوچھ کر انہیں ہلکا پھلکا کھانا کھلا دیں۔ یہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ میں اب کل صبح انہیں دیکھنے آؤں گا۔"

اس آدمی نے کہا اور پھر وہ ایک بیگ پکڑ کر پاپا کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ ممی اٹھ کر اس کے پاس بیڈ پر آ گئیں۔ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما تھا۔

"اللہ کا شکر ہے، تمہیں ہوش آ گیا ہے۔"

"اب اس ہوش کا کیا فائدہ؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ ممی اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

"مجھے کیا ہوا تھا؟" اس نے ان سے پوچھا تھا۔

"تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے تمہیں ہاسپٹل میں رکھا تھا پھر گھر لے آئے۔ تمہیں جب بھی ہوش آتا تھا، تم چلانے لگتی تھیں۔ تمہیں مسلسل ٹرینکولائزرز پر رکھا ہوا تھا۔ کیا ہوا ہے فلک؟ ایسی کون سی بات ہو گئی تھی جسے تم نے اپنے اعصاب پر اس طرح سوار کر لیا۔ کیا سمان سے کوئی جھگڑا ہوا تھا؟" وہ اب دھیمی آواز میں اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں، کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے باہر لے جائیں۔ باہر لان میں، میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں۔"

وہ ایک دم بیڈ سے اٹھنے لگی تھی۔ اس کی ممی نے اس کا بازو تھام لیا۔ زمین پر قدم رکھتے ہی وہ چکرا گئی تھی۔ ممی نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا۔ چند منٹوں بعد اس نے ایک بار پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی تھی اس بار وہ اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گئی۔ ممی کے ساتھ چلتے ہوئے وہ باہر لان میں آ گئی۔ ممی نے اسے لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اندر جا کر اس کے لیے کچھ پھل اور جوس لے آئیں۔ اس نے جوس کا گلاس خود ہی اٹھا کر پی لیا تھا پھر وہ سیب کی قاشیں کھاتی رہی۔

اب اندر چلیں؟

ممی نے کچھ دیر بعد اس سے پوچھا تھا۔ شام کے سائے بڑھ رہے تھے۔

"نہیں، ابھی مجھے یہیں بیٹھنا ہے۔"

وہ اسی طرح کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ مومنہ اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی تھی۔ وہ پہلے جیسی فلک نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی۔ دودھیا رنگت زردی مائل ہو گئی تھی۔ وہ کسی بت کی طرح پلکیں جھپکائے بغیر سامنے دیوار پر چڑھی ہوئی بوگن ویلیا کی بیل کو دیکھ رہی تھی۔

"ممی!" اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آئی تھی۔ میمونہ چونک گئیں اس نے ایک بار پھر انہیں پکارا۔

"ممی! یہ مرد عورت کے لیے کیا ہوتا ہے؟" میمونہ اس کے سوال کو سمجھ نہیں پائی تھیں۔ وہ ابھی بھی بوگن ویلیا کو گھور رہی تھی۔

"پتا ہے ممی! مرد عورت کے لیے کیا ہوتا ہے۔ دروازہ ہوتا ہے دروازے کا کام رستہ روکنا ہوتا ہے یا رستہ دینا اور ممی اس دروازے نے میرا رستہ روک لیا ہے۔ میرا ہی نہیں ہر عورت کا رستہ روک لیا ہے۔ آگے جانے ہی نہیں دیتا۔ آج تک آگے جانے نہیں دیا۔ اسی لیے تو عورت پیغمبر ہوتی ہے نہ ولی۔ وہ دروازہ کھولنے کی کوشش ہی نہیں کرتی، وہیں اسی دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھی رہتی ہے۔ اسے ہی چومتی رہتی ہے سجدہ کرتی رہتی ہے۔ دروازہ پھر رستہ کیوں نہ روکے۔"

وہ اب بوگن ویلیا کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی اور اس کی باتیں میمونہ کو باہر سے اندر تک ہلا رہی تھیں۔

"فلک! کیا کہہ رہی ہو تم۔ کیوں اس طرح کی باتیں کر رہی ہو؟"

"پتا ہے ممی! عورت بیل کی طرح ہوتی ہے اور مرد دیوار کی طرح۔ بیل ساری عمر دیوار کو ڈھونڈتی رہتی ہے۔ جس کے سہارے وہ اوپر جا سکے نظروں میں آ سکے جہاں تک دیوار جاتی ہے۔ وہ بھی بس وہیں تک جاتی ہے۔ بیل کو لگتا ہے دیوار نہ ہوتی تو وہ زمین پر رلتی رہتی لوگوں کے پیروں تلے آتی، مگر ان کی نظروں میں نہیں آتی۔ وہ ساری عمر دیوار کی مشکور رہتی ہے۔ اسے سایہ دیتی ہے۔ اپنے پھولوں سے سجاتی ہے، مہکاتی ہے، جب سوکھنے لگتی ہے تو بھی ساتھ ہی چپکی رہتی ہے۔ کسی چھپکلی کی طرح۔ ختم ہونے کے بعد بھی اسے دیوار کے علاوہ کسی دوسرے کا سہارا نہیں چاہیے اور دیوار ممی! دیکھیں دیوار کا کتنا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کا وجود بیل ڈھک دیتی ہے۔ اس کے سامنے ایک آڑ بنا دیتی ہے ہر چیز سے اسے محفوظ کر دیتی ہے۔ اسے سایہ دیتی ہے۔ رونق دیتی ہے پھولوں سے سجاتی ہے مہکاتی ہے اور خود ختم ہونے تک اس کی احسان مند رہتی ہے، اور دیوار وہ تو بس سہارا دینے کا فائدہ اٹھاتی ہے بس سہارا دینے کا اور ساری عمر ممی! دیکھیں ساری عمر جب تک بیل ختم نہیں ہو جاتی۔"

"فلک! تم اندر چلو۔"

"پھر جب وہ مرد اسے مل جاتا ہے تو اسے لگتا ہے۔ اسے پوری دنیا مل گئی ہے۔ ہر چیز جیسے اپنے ٹھکانے پر آ گئی ہے۔ سب کچھ جیسے مکمل ہو گیا ہے۔ بس اس کے لیے وہ مرد بس وہ مرد سب کچھ ہوتا ہے۔ ان داتا، مالک، آقا سب کچھ۔ اسے لگتا ہے زندگی میں اب اسے جو کچھ ملتا ہے۔ اسی کے طفیل ملتا ہے۔ اسی کے سہارے ملتا ہے۔ اسی سے ملتا ہے۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد اس کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ وہ دن کو رات کہے تو وہ رات کہتی ہے، وہ آگ کو پانی کہے تو وہ پانی کہتی ہے۔ اسے لگتا ہے دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے حکم سے ہوتا ہے اس کے وجود کی وجہ سے ہوتا ہے اللہ اس کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ بس وہ مرد ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ آنکھ، کان، ناک، منہ، پیر، ہاتھ، دل، دماغ سب کچھ وہی ہوتا ہے۔ اسے لگتا ہے، رزق اللہ نے نہیں دینا اس مرد نے دینا ہے، اور پھر پھر جب وہ مرد اسے چھوڑ دیتا ہے۔ ٹھوکر مار دیتا ہے تو اسے لگتا ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ دنیا میں کچھ رہا ہی نہیں۔ بس دنیا اس ایک مرد کی وجہ سے ہی تو قائم تھی۔ وہ نہیں تو دنیا نہیں یوں جیسے سارا نظام ہی ختم ہو گیا ہو۔ اسے اللہ یاد نہیں آتا۔ اسے یاد ہی نہیں آتا کہ اللہ نے اسے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے مرد کی عبادت کے لیے نہیں، اپنی چاہ کے لیے پیدا کیا ہے۔ مرد کی چاہ کے لیے نہیں اور

عورت تو عورت تو۔۔۔۔ ایک مرد کے لیے مرتی ہے۔ سے مرد سے آگے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اللہ چھوڑ دے اسے پرواہ نہیں مگر وہ ایک مرد چھوڑ دے تو وہ مر جاتی ہے۔ اللہ اس سے محبت نہ کرے تو اسے فکر نہیں مگر وہ مرد محبت کرنا چھوڑ دے تو اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اللہ ناراض ہو جائے تو اسے دھیان نہیں آتا مگر مرد ناراض ہو جائے تو وہ سولی پر لٹک جاتی ہے۔ مرد کو منانے کے لیے وہ دو جہاں ایک کر دیتی ہے ور اللہ کو منانے کے لیے وہ ایک مرد نہیں چھوڑ سکتی۔ مرد کو منانے کے لیے وہ ہر رشتہ چھوڑنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ ماں کا، باپ کا، بہن کا، بھائی کا۔ ہر ایک کا اور اللہ کے لیے۔“

”فلک! اب بس چپ ہو جاؤ۔ کچھ نہ کہو۔ اس طرح کی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں تم نے۔“ میمونہ اب روہانسی ہو گئی تھیں۔

”ممی! میں نے اس سے کہا میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ ہر چیز سے زیادہ محبت۔ اس نے کہا مجھے اس کی پروا نہیں۔ اگر میں اللہ سے یہ کہتی تو کیا وہ بھی یہی جواب دیتا۔ میں نے اس سے کہا میں نے کون سی غلطی کی ہے؟“ اس نے کہا ”میں نہیں جانتا۔“ میں اللہ سے یہ پوچھتی تو کیا وہ میرے سوال کا جواب نہ دیتا؟ میں نے اس سے کہا میں نے تمہارے لیے پچھلے تین سال میں کیا نہیں کیا اس نے کہا۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ اگر میں اللہ کے لیے کچھ کرتی تو کیا اللہ کو بھی پرواہ نہ ہوتی؟ میں نے اس سے کہا۔ میں نے پچھلے تین سال ویسے زندگی گزاری ہے جیسی تم چاہتے تھے۔ اس نے کہا میں کیا کروں۔ میں تین سال اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتی تو کیا اللہ یہ کہتا؟ میں نے اس سے کہا تم مجھے بتاؤ میں کیا کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔ مجھ سے محبت کرنے لگو۔ اس نے کہا مجھے تمہاری ضرورت ہی نہیں ہے۔ مجھے تمہاری کوئی بات، کوئی چیز خوش نہیں کر سکتی۔ میں اللہ سے یہ کہتی تو کیا وہ بھی یہی کہتا؟ ممی! اللہ اور انسان میں یہی فرق ہے۔ اللہ ٹھوکر نہیں مارتا انسان بس ٹھوکر ہی مارتا ہے۔

مرد کو خوش کرنے کے لیے کیا کیا کرتی ہے عورت۔ اندر بدل دیتی ہے، باہر بدل دیتی ہے۔ دل بدل دیتی ہے، وجود بدل دیتی ہے، صرف اس لیے کہ وہ خوش رہے۔ ناراض نہ ہو، اس کی نظر نہ بدلے۔ اللہ کو خوش کرنے کے لیے وہ باطن کیا ظاہر کو بدلنے پر تیار نہیں ہوتی۔ اللہ کہتا ہے۔ سر کو ڈھانپ لو۔ مرد کہتا ہے سر کو مت ڈھانپو۔ میری بیوی کو ماڈرن ہونا چاہیے۔ وہ اللہ کی نہیں سنتی۔ مرد کی سنتی ہے۔ اللہ کہتا ہے اپنے وجود کو ڈھانپو، اپنی زینتوں کو چھپاؤ، مرد کہتا ہے ایسا مت کرنا کہ میرے ساتھ چلتی پھرتی اچھی لگو۔ وہ اللہ کی نہیں سنتی مرد کی سنتی ہے، وہ کہتی ہے مرد کے ساتھ رہنا ہے۔ ساری عمر بسر کرنی ہے، اس کی نہیں مانیں گے تو کس کی مانیں گے۔ مرد کی بیوی ہے، یہ رشتہ تو کبھی بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اللہ کی تو مخلوق ہے یہ رشتہ تو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ وہ دائمی رشتے کی فکر نہیں کرتی۔ ساری عمر عارضی رشتوں کو روتی رہتی ہے۔ ان کی فکر کرتی ہے اللہ نے تو عورت کو غلام نہیں بنایا۔ مجبور نہیں بنایا۔ محکوم نہیں بنایا اس نے خود بنا لیا ہے، اپنا محور ”ذات“ کو نہیں ”وجود“ کو بنا لیا ہے۔“

میمونہ نے اس کے گالوں پر آنسوؤں کو بہتے دیکھا تھا۔

”فلک! فلک: مت روؤ میری جان۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں پھر تم۔“

”ممی! مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں بس رونا چاہتی ہوں۔ آپ نے کبھی کیکڑے کو دیکھا ہے؟“ ممی! مجھے اپنا وجود ایک کیکڑا لگتا ہے محتاج، بے بس، مجبور۔“

اس نے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا ممی چھبیس سال۔ پورے چھبیس سال میں اللہ کے بغیر کیسے رہتی رہی ہوں۔

چھبیس سال اللہ مجھے کیسے برداشت کرتا رہا ہے۔ میرے غرور، میرے فخر، میری انا، میری خود پرستی۔ ممی! کیسے۔۔؟؟ آخر کیسے وہ یہ سب نظرانداز کرتا ہے۔ جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ ان پر آزمائشیں ڈالتا ہے۔ چھبیس سال تک اسے میرا خیال ہی نہیں آیا۔ سب کچھ دیتا رہا بغیر مانگے بغیر چاہے۔ کسی مصیبت، کسی تکلیف، کسی تنگی، کسی آزمائش کے بغیر یعنی چھبیس سال تک میں اللہ کی محبت کے بغیر جیتی رہی اور آپ سب مجھ پر رشک کرتے رہے۔ میرے مقدر پر۔"

وہ گھٹنوں کے بل چہرے کو ہاتھوں میں چھپائے لان میں بیٹھ گئی تھی۔ ایک بار پھر وہ اسی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"میں انسانوں کی محبت پر رشک کر رہی۔ بس انسانوں کی محبت پر۔۔ مجھے اللہ کا خیال ہی نہیں آیا۔ آپ نے ظلم کیا مجھ پر ممی! آپ نے ظلم کیا۔"

میمونہ گم صم اسے بلکتے ہوئے دیکھتی جا رہی تھیں۔ ان کا وجود کسی گلیشیئر کی طرح سرد ہوتا جا رہا تھا۔

◆

سلمان کی تابندہ کے ساتھ شادی دونوں خاندانوں کے لیے دھماکے سے کم نہ تھی۔ فلک کی ذہنی کیفیت کی وجہ اب سب کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ چند ہفتے فلک کی خیریت دریافت کرنے آتا رہا تھا اور پھر یک دم اس نے آنا چھوڑ دیا تھا پھر فلک کے والدین کو اس کی دوسری شادی کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ سلمان کے پاس گئے تھے اور انہوں نے اسے بے نقط سنائی تھیں۔

"میں نے فلک سے دوسری شادی کی اجازت لی ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔"

وہ بے حد مطمئن تھا۔ میمونہ اور شیر افگن جلے بھنے گھر واپس آ گئے تھے۔

"تم نے اسے دوسری شادی کی اجازت کیوں دی؟ تمہیں یہ سب کچھ ہمیں بتانا چاہیے تھا۔ میں دیکھتا وہ کیسے اس عورت سے شادی کرتا ہے۔ میں ان دونوں کو گولی نہ مروا دیتا تو پھر کہتیں تم۔ مگر تم نے اجازت کیوں دی؟"

شیر افگن گھر آ کر اس پر بگڑنے لگے تھے۔ وہ اس خبر پر بالکل نارمل تھی یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

"مجھے کیا فرق پڑتا ہے پاپا! وہ جس سے چاہے شادی کرے۔ میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔" اس کا انداز شیر افگن کو تپا گیا تھا۔

"تم پاگل ہو گئی ہو۔ کیا دنیا میں نہیں رہتی ہو؟"

"میں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے مجھے فرق نہیں پڑتا اس کی دوسری شادی سے۔ اس کی زندگی میں ایک اور عورت آ گئی تو کیا۔"

وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئے تھے۔ جو میلے کچیلے کپڑوں میں ہمیشہ کی طرح کمرہ بند کیے بیٹھی تھی۔

رشنا کو جب اس کے بارے میں پتا چلا تھا تو وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ فلک کو دیکھ کر اسے شاک لگا تھا وہ جیسے ایک پرچھائیں بن کر رہ گئی تھی۔

"کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا فلک؟ اس طرح تو مر جاؤ گی۔" وہ اس کے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارنے لگی تھی۔

"نہیں مروں گی رشنا! میں نہیں مروں گی۔" وہ مسکرائی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ سلمان۔ اس طرح کر سکتا ہے۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتا تھا پھر اسے کیا ہو گیا۔" وہ اس کے پاس کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

"اس کا قصور نہیں ہے رشنا! اس کا کوئی قصور نہیں۔ وہ تو وہی دیکھ رہا ہے جو اللہ اسے دکھا رہا ہے۔ وہی کر رہا ہے جو اللہ کروانا چاہتا ہے۔ مجھے اپنے حسن، اپنے وجود پر بڑا غرور تھا۔ اللہ نے مجھے میری اوقات دکھائی ہے۔"

رشنا نے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔

"جانتی ہو رشنا! میرے ساتھ کیا ہوا۔ میں نے سوچا تھا سلمان کو مجھ سے چھیننے والی مجھ سے بڑھ کر نہیں تو میرے برابر ضرور ہوگی۔ میں یہی سوچ کر اسے دیکھنے گئی تھی فیکٹری، میں نے سوچا تھا اس سے کہوں گی سلمان کے بدلے جتنا روپیہ چاہیے لے اور اگر وہ میری بات نہ مانتی تو میں اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیتی۔ میں نے اسے بلوایا تھا۔ وہ کمرے میں آئی اور میں نے اسے دیکھا۔ جانتی ہو رشنا وہ کیسی تھی، ایک موٹے اور بھدے جسم والی۔ سیاہ رنگت والی عورت۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے ٹیڑھے میڑھے دانت اس کے چہرے کو اور بھی بدصورت کر رہے تھے۔ اس نے اپنے چہرے کو میک اپ کی دکان بنایا ہوا تھا، کوئی بھی مرد اسے دیکھ کر جان سکتا تھا کہ وہ کس کردار کی عورت ہے مگر سلمان کو اس کے چہرے پر کچھ اور نظر آ رہا تھا۔ میں پتھر کی ہو گئی تھی اسے دیکھ کر جان گئی تھی۔ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ساری بات نظر کی ہوتی ہے اور اللہ نے مجھ سے وہ چھین لی تھی۔ مجھے لگا تھا کسی نے پوری دنیا کی گندگی میرے وجود پر اچھال دی تھی۔ مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں رہا تھا نہ سلمان سے نہ تابندہ سے۔ میں جان گئی تھی۔ اللہ کن کہتا ہے تو چیزیں کیسے ہو جاتی ہیں۔ مجھے پتا چل گیا تھا اللہ دل کیسے پھیر دیتا ہے۔ وہ تو عورت تھی۔ بدصورت ہی مگر عورت تھی۔ اللہ چاہتا تو زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کے لیے سلمان کے دل میں وہ عشق ڈال دیتا جو اس کے دل میں میرے لیے تھا۔ اللہ نے بتایا ہے مجھے چھبیس سال تم میرے بغیر رہ سکتی ہو۔ اپنے آقا، اپنے مالک، اپنے معبود کے بغیر تو پھر اس شخص کے بغیر بھی رہ سکتی ہو۔ اگر اللہ کی محبت کے بغیر جی سکتی ہو تو کسی بھی شخص کی محبت کے بغیر جی سکتی ہو۔ ممی پاپا سمجھتے ہیں میرے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔ سلمان کی بے وفائی کی وجہ سے۔ مجھے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر پھرتے ہیں۔ چھبیس سال اللہ کا نام نہیں لیا تو کسی کو خیال نہیں آیا کہ میں ابنارمل ہوں۔ اب چند ماہ سے اللہ کا نام لے رہی ہوں تو ہر ایک کو میں پاگل کیوں لگنے لگی ہوں۔ تم بتاؤ کیا میں پاگل ہوں؟"

رشنا نے سر جھکا لیا۔ فلک کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس نے رشنا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ دوبارہ نہیں بولی۔

⁂

وہ دریا کے کنارے پر وہیں آ گئی تھی۔ جہاں اس نے اس فقیر کو دیکھا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کے دل پر جیسے ایک گھونسہ پڑا تھا۔ پتا نہیں اسے کیوں آس تھی کہ وہ وہاں ہوگا۔ اس کے انتظار میں، اسے کچھ بتانے، اس کے اعصاب پر ایک عجیب سی تھکن سوار ہو گئی تھی۔ وہ گڑھا بھی وہیں تھا اسی طرح پانی اور کیچڑ سے بھرا ہوا۔ وہ اس کے پاس آ کر ریت پر بیٹھ گئی تھی۔

"یہاں کیوں بیٹھ گئی ہو فلک؟ اٹھ جاؤ۔" میمونہ نے اسے بیٹھتے دیکھ کر کہا تھا۔

وہ گڑھے کو گھور رہی تھی پھر اس نے اپنا ہاتھ گڑھے میں ڈال کر کچھ کیچڑ بھرا پانی ہاتھ میں لیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا اس دن وہ فقیر کس طرح کیچڑ اپنے چہرے اور بالوں پر ملنے لگا تھا۔

"دیکھو۔ میں تو کیچڑ سے نہیں ڈرتا، میں تو گندگی سے خوف نہیں کھاتا جانتا ہوں اس کی نظر اس کیچڑ اور گندگی پر نہیں جائے گی وہ صرف

میرے وجود کو دیکھے گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے کیچڑ بھرا ہاتھ اپنے چہرے پر ملنا شروع کر دیا۔ میمونہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی تھیں۔

"کیا کر رہی ہو تم فلک؟" وہ حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے پرس سے ٹشو نکال کر اس کا چہرہ صاف کرنا چاہا تھا۔ اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔

"رہنے دیں ممی! کچھ دیر تو اس کیچڑ سے میرے چہرے کو سجا رہنے دیں۔" اس نے گھٹنوں میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔

"میں جس کی نظر میں ہوں۔ میرے لیے کافی ہے۔ مجھے جس کی محبت چاہیے مل چکی ہے۔ مجھے اور کسی کی محبت کی ضرورت نہیں ہے۔"

اسے یاد تھا۔ اس دن یہاں اس نے یہی کہا تھا۔

"تجھے وجود کی طلب کیوں ہے "ذات" کی چاہ کیوں نہیں ہے؟" کوئی آواز ایک بار پھر لہرائی تھی۔

"اب مجھے ذات کی چاہ ہے تو ذات کیوں نہیں ملتی۔" اس نے اپنے کیچڑ بھرے ہاتھ کو دیکھا تھا۔ اب اسے اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔ اس روز اسے بھکاری کے وجود سے گھن آئی تھی۔ اب اسے پتا چل رہا تھا کہ کب کیچڑ کیچڑ نہیں لگتی۔ گندگی گندگی نہیں رہتی وجود کی طلب کیسے ختم ہو جاتی ہے۔

"ہر ایک کو بھکاری بنا کر رستے میں بٹھایا ہوا ہے۔ ہر ایک خود کو مالک سمجھتا ہے۔ جب تک ٹھوکر نہیں لگتی۔ جب تک گھٹنوں کے بل نہیں گرتا۔ اپنی اوقات کا پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"فلک پھر رونے لگی ہو۔ چلو گھر چلیں۔ میرا خیال تھا تم یہاں آ کر ریلیکس ہو جاؤ گی۔ خوش ہو گی مگر تم یہاں آ کر بھی۔ چلو گھر چلیں۔"

میمونہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا لیا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے ان کے ساتھ چلنے لگی۔ سڑک پر چڑھنے سے پہلے اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔

* * *

اس کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ کوئی سائیکاٹرسٹ اسے نارمل نہیں کر سکا تھا۔ وہ سارا دن جہاں بیٹھتی بیٹھی رہتی جب اذان کی آواز آتی تو کسی معمول کی طرح اٹھ کر نماز پڑھنے لگتی۔ میمونہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتیں، اور اس کی باتیں پھر اسی ایک محور ایک مرکز کے گرد گھومنے لگتیں۔ اللہ، خدا، رب، مالک، آقا، معبود۔ میمونہ کو لگتا وہ جب تک ایسی باتیں نہیں چھوڑے گی تب تک نارمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے سوٹوں سے بھرے ہوئے کپڑے اور جیولری اور میک اپ سے خالی چہرہ انہیں وحشت میں مبتلا کر دیتا۔ انہیں وہ پہلے والی فلک یاد آ جاتی جس کی ایک ایک چیز نفاست کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ اسے بیوٹی پارلر لے جانے کی کوشش کرتیں تو وہ چلانے لگتی۔ وہ اسے کسی فنکشن میں لے جانا چاہتیں تو وہ کمرہ بند کر لیتی۔

"اس طرح کمرے میں بند رہ کر تم مر جاؤ گی فلک! خود کو اس طرح تباہ نہ کرو کہیں آیا جایا کرو کہیں باہر چلو۔"

انہوں نے ایک دن اس سے کہا تھا۔ وہ خالی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"باہر جانے سے کیا ہو گا ممی؟ کیا مل جائے گا باہر؟" کچھ دیر بعد اس نے تھکے تھکے انداز میں ہاتھوں سے چہرہ چھپایا تھا۔

"اندر رہ کر اس طرح گھر میں بند ہو کر کیا مل رہا ہے تمہیں؟"

اس کی امی آج بحث کے موڈ میں تھیں۔

"ہاں، کچھ نہیں مل رہا اندر رہ کر بھی مگر باہر جا کر لوگوں کو دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ میں کہیں چھپ جانا چاہتی ہوں ممی! اس طرح کہ دوبارہ کسی کو نظر آؤں نہ کوئی مجھے دیکھ سکے۔"

اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ میمونہ ہول کر رہ گئی تھیں۔

"سلمان کو بھول جاؤ، دفع کرو اسے۔ اس کے لیے کیا جوگ لے لو گی۔" انہوں نے جیسے اسے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"سلمان! سلمان کو کون یاد کرتا ہے ممی! اس کے لیے کون جوگ لیتا ہے۔ وہ تو انسان ہے انسانوں کے لیے کون جوگ لیتا ہے۔ جوگ تو بس۔۔"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی تھی۔

"تم صبر کیوں نہیں کر لیتیں فلک! سب کچھ بھول کیوں نہیں جاتیں؟" وہ ایک ٹک ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"آپ کو کیا پتا ممی! ہر چیز پر صبر نہیں آتا ہر نقصان صبر کرنے والا نہیں ہوتا۔ آپ کو کیا پتا میرے پاس کیا نہیں رہا۔ میرے پاس ایک تنکا تک نہ رہے، اور لوگوں کو پوری دنیا مل جائے تو مجھے پروا نہیں پر جب سوچتی ہوں کہ لوگوں کو، ممی لوگوں کو، اللہ مل رہا ہے تو مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ صبر آ ہی نہیں سکتا اور میرے علاوہ اس وقت سب کے پاس اللہ ہے کوئی محروم ہے تو میں ہوں خالی ہاتھ ہوں تو میں ہوں بدقسمت ہوں تو میں ہوں۔"

وہ ایک بار پھر بچوں کی طرح زار و قطار رو رہی تھی۔ میمونہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ جانتی تھیں اب وہ کئی گھنٹے اسی طرح بلند آواز سے روتی رہے گی۔ بال بکھرائے، سر پر ہاتھ رکھے، بھیگے گالوں، لرزتے وجود، بلند سسکیوں اور آنکھوں میں لہراتی وحشت کے ساتھ وہ فلک کا صرف سایہ لگ رہی تھی۔ ایک پرانا اور بدصورت سایہ۔

اس دوپہر سائیکاٹرسٹ کے کلینک سے واپسی پر ممی نے گاڑی کا رخ برٹی کی طرف موڑ لیا تھا۔ انہیں کچھ ضروری چیزیں خریدنی تھیں۔ پارکنگ میں گاڑی پارک کرنے کے بجائے انہوں نے باہر ہی سڑک کے ایک کنارے پر گاڑی پارک کر دی تھی۔

”نہیں، مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔“ اس نے ممی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”میں گاڑی میں ہی بیٹھتی ہوں۔ آپ کو جو لینا ہے لے آئیں۔“

ممی گاڑی سے اتر کر چلی گئی تھیں۔ وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر سڑک پر چلتی ہوئی ٹریفک کو دیکھتی رہی، سڑک پر گاڑی کا ایک ہجوم تھا وہ بے تاثر آنکھوں سے کسی روبوٹ کی طرح انہیں دیکھتی رہی۔ پھر اچانک اس نے دس بارہ سال کے چھوٹے سے قد اور دبلے پتلے وجود کے ایک بچے کو پھٹے پرانے کپڑوں اور ٹوٹی ہوئی چپل پہنے بازو پر کچھ اخبار لٹکائے اپنی گاڑی کی طرف آتے دیکھا تھا۔ وہ بچہ پاس آ کر ایک اخبار ہاتھ میں پکڑ کر کھڑکی کے شیشے پر دستک دینے لگا۔ اسے کسی اخبار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وہ اس طرح راستے میں اخبار لیا کرتی تھی۔ مگر آج بے اختیار اس نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا تھا۔

”اخبار لے لیں باجی!“ اس بچے کی آواز بھی اس کے وجود ہی کی طرح نحیف تھی، وہ اخبار اس کے سامنے لہرا رہا تھا مگر اس کی نظریں گاڑی کے اندر ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔

فلک کو کوئی عجیب سا احساس ہوا تھا۔ ڈیش بورڈ کے ایک کونے میں اس نے کچھ روپے پڑے دیکھے تھے۔ ممی اکثر اپنی گاڑی میں اوپر تھوڑی بہت رقم اس طرح گلوکمپارٹمنٹ اور ڈیش بورڈ کے اوپر ضرور رکھتی تھیں۔ اس نے وہ روپے اٹھا کر اسے بچے کے ہاتھ میں تھما دیئے اس نے کچھ حیرانی سے فلک کو دیکھا تھا یوں جیسے اسے فلک سے یہ توقع نہیں تھی۔

”یہ روپے رکھ لو، مجھے اخبار کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس نے نرم آواز میں اس بچے کو مخاطب کیا تھا۔

”مگر یہ تو بہت زیادہ ہیں۔“ بچے کی آواز میں کچھ گھبراہٹ تھی۔

”پھر بھی رکھ لو۔“

اس نے روپے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے تھے۔ اس بچے کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے ایک چمک ابھری تھی پھر وہ سو کا نوٹ جیب میں ڈال کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ فلک نے ایک بار پھر گاڑی کا شیشہ اوپر چڑھا دیا۔ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اس بچے کو دور جاتا دیکھتی رہی۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ نے اس کے پورے وجود کو پسینے سے شرابور کیا ہوا تھا۔ اسے اس بچے پر ترس آیا تھا، پتا نہیں کون سی مجبوری اسے اس عمر میں یوں خوار کر رہی تھی۔ بچہ بہت دور چلا گیا تھا مگر اس کی نظریں ابھی بھی اس پر مرکوز تھیں پھر اچانک اس نے بچے کو بھاگ کر سڑک کراس کرنے کی کوشش کرتے دیکھا اور پھر بائیں سمت سے آنے والی گاڑی نے اسے بہت زور سے چند فٹ اوپر اچھال دیا تھا فلک کے حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ وہ اب اسے نظر نہیں آ رہا تھا سڑک پر گزرنے والی ٹریفک نے اسے اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ اس نے چند گاڑیوں کو اس جگہ رکتے دیکھا جہاں

وہ گر رہا تھا، پھر فٹ پاتھ پر چلنے والے کچھ لوگ بھی تقریباً بھاگتے ہوئے اس جگہ کی طرف گئے تھے۔ اس نے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔

"کیا بات ہے فلک؟ کہاں جا رہی ہو؟" ممی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہی تھیں۔

"وہاں ممی! وہاں ایک بچے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

اس نے ہاتھ اٹھا کر گاڑی کے کھلے دروازے سے دور اس جگہ کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں اب رش بڑھتا جا رہا تھا۔ ممی اپنی سیٹ سنبھال چکی تھیں۔

"ایسے ایکسیڈنٹ ہوتے رہتے ہیں۔ تم بھلا وہاں جا کر کیا کرو گی؟" انہوں نے ڈور ہینڈل کو پکڑ کر اس کی طرف والا دروازہ بند کر دیا تھا۔

"ممی وہ بچہ [illegible] بچا نہیں وہ۔"

آواز اس کے حلق میں اٹک گئی تھی۔ ممی نے کار سٹارٹ کر لی تھی۔

"اتنے لوگ ہیں وہاں، لے جائیں گے اسے ہاسپٹل۔ ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں وہاں جا کر، اور ویسے بھی مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔ مسز انور کے گھر جانا ہے ان کے بوتیک کا افتتاح ہے۔"

وہ بے یقینی سے ممی کے چہرے کو دیکھتی رہی، گاڑی اب سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

"کیا انہیں کچھ محسوس نہیں ہوا؟ کچھ بھی نہیں؟ آخر کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں تھا۔"

ممی اس کی سوچوں سے بے خبر اپنی باتوں میں مصروف تھیں۔ اس نے اپنے اندر خلا کو ایک بار پھر پھیلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ "یہ بے حسی ہمارے وجود، ہماری کلاس کا حصہ کیوں بن گئی ہے؟ چوٹ کھانے والا پٹھان ہو تو کیا اسکی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ میری کلاس مینرز کی بات کرتی ہے، ایٹی کیٹس کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، کیا انسانی ہمدردی مینرز سے باہر کی کوئی چیز ہے کیا زندگی گزارنے کے لیے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کا طریقہ آنا ہی کافی ہے؟" سوالات کی ایک بھرمار نے اسے نئے سرے سے گھیر لیا تھا۔

"اور پھر اللہ اتنا دور لگتا ہے تو ہمیں اس بات کا شکوہ کرنے کا کیا حق ہے۔"

اس نے اپنی ماں کے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی مسلسل بول رہی تھیں۔ اس کی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اس بچے کا چہرہ آ گیا تھا۔ گاڑی کے ساتھ ٹکرانے کے بعد اچھلتا ہوا اس کا وجود اور ہوا میں لہراتے ہوئے اخبارات اس نے اپنے وجود کو ریت کا ڈھیر بنتے محسوس کیا تھا۔

"ممی! چپ ہو جائیں۔ فار گاڈ سیک چپ ہو جائیں۔ بند کر دیں یہ ساری باتیں میرا دم گھٹ رہا ہے، بس خاموش ہو جائیں۔ یہ سب کچھ مجھے نہ بتائیں۔"

وہ پاگلوں کی طرح کانوں پر ہاتھ رکھ کر یک دم چیخنے لگی تھی۔ میمونہ کچھ خوفزدہ ہو کر خاموش ہو گئی تھیں۔

"ابھی تو سائیکاٹرسٹ کے ساتھ سیشن کروا کر آ رہی ہوں اور پھر بھی آدھے گھنٹے بعد ہی اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔" میمونہ نے بے بسی سے سوچا تھا۔

اگلے کئی دن تک وہ گم صم اپنے کمرے میں قید رہی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اس بچے کو اپنے ذہن سے محو نہیں کر سکی تھی۔ وہ جیسے اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ ”پتا نہیں اسے کتنی چوٹ آئی تھی پتا نہیں وہ زندہ بھی ہوگا یا۔“

وہ آگے کچھ نہ سوچ پاتی۔ اس دن عصر کی نماز پڑھنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی کھڑکیوں کے پاس رکھی ایزی چیئر کے اوپر آ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے باہر لان میں مدھم آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے آواز کو پہچاننے کی کوشش کی تھی پھر اس نے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ آواز اس کے ڈرائیور کی بیٹی رضیہ کی تھی۔ جو ٹوٹے پھوٹے تلفظ کے ساتھ انگلش کا کوئی سبق دہرا رہی تھی۔

”ابو بن ادھم ایک عابد و پرہیزگار شخص تھے۔ ایک رات کو اچانک ان کی آنکھ کھل گئی۔ ان کا کمرہ نور سے روشن تھا۔ انہوں نے ایک فرشتے کو دیکھا جو اپنی سنہری کتاب میں کچھ لکھ رہا تھا۔“

بہت آہستگی سے فلک نے اپنی بند آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی سماعتیں اب کھڑکی کے باہر گونجنے والی آواز پر مرکوز تھیں۔ رضیہ تقریباً ہر لفظ کو بہت برے طریقے سے ادا کر رہی تھی مگر وہ پھر بھی لفظوں کو پہچان رہی تھی۔

”ابو بن ادھم نے فرشتے سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے تو اس نے کہا کہ ان لوگوں کے نام لکھ رہا ہوں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں۔“ فلک اب سانس تک روک چکی تھی۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ رضیہ اب لڑکھڑاتی آواز کے ساتھ رک رک کر بول رہی تھی۔

”ابو بن ادھم نے پوچھا کیا اس فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہے؟ فرشتے نے نفی میں جواب دیا تو ابو بن ادھم نے درخواست کی کہ ان کا نام ان لوگوں میں شامل کر لیا جائے جو اپنے ساتھی انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔

فلک کو اپنی آنکھوں میں کچھ کرچیوں سی چبھتی محسوس ہوئی تھیں۔

”فرشتے نے ابو بن ادھم کا نام لکھا اور غائب ہو گیا۔ اگلی رات فرشتہ پھر آیا اور اس نے ابو بن ادھم کو ان لوگوں کی لسٹ دکھائی جن سے اللہ محبت کرتا ہے۔

ابو بن ادھم کا نام اس لسٹ میں سب سے اوپر جگمگا رہا تھا۔“

رضیہ ایک بار پھر اپنے سبق کو شروع سے پڑھنے میں مصروف تھی اور فلک اندر کسی پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی تھی۔ گالوں پر پھسلتا ہوا گرم پانی اس کی گود میں رکھے ہوئے ہاتھوں پر گر رہا تھا۔

”اور میں تم تک کسی انسان کے لیے کچھ کیے بغیر ہی پہنچنا چاہتی تھی پھر تم رستہ کیسے دکھاتے؟ اور اب اگر میں لوگوں کے ذریعے تم تک آؤں تو کیا تم مجھے مل جاؤ گے؟ کیسے لوگ ہوتے ہیں، اللہ جن سے تو محبت کرتا ہے، جنہیں تو چاہتا ہے، جنہیں تو مل جاتا ہے؟ کیا ابو بن ادھم جیسے لوگ؟ وہ ان کی طرح کیسے بنا جاتا ہے؟ اللہ تو بتا ان میں کیا خاص چیز ہوتی ہے؟“

اس کا ذہن جیسے کسی گرداب میں پھنسا ہوا تھا۔

"باجی! یہ گھر ہے اس کا۔" بالآخر ایک گھر کے سامنے پہنچ کر وہ لڑکا رک ہی گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک جھگی کے دروازے پر دستک دی تھی فلک طائرانہ نظروں سے اس خستہ حال جھگی کا جائزہ لیتی رہی۔ چند لمحوں بعد سترہ اٹھارہ سال کی ایک لڑکی نے دروازہ کھولا تھا۔

"یہ باجی ماجد سے ملنا چاہتی ہیں۔" اس کے ساتھ آنے والے بچے نے جیسے اس کا تعارف کروایا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر تعجب اور سراسیمگی اکٹھی ابھری تھی، وہ بچہ چلا گیا تھا۔

"تم ماجد کی بہن ہو؟" فلک نے اس سے پوچھا۔

"ہاں!" اس لڑکی کا جواب مختصر تھا۔

"میں اندر آ جاؤں؟" فلک نے اس سے اجازت طلب کی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

فلک دروازہ پار کر کے اندر آ گئی تھی۔ جھگی کی ہر چیز اپنے مکینوں کی خستہ حالی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اندر عجیب سی گھٹن اور حبس تھا یوں جیسے وہاں ہوا کا گزر کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔ فلک کو بے اختیار اپنا چھ کنال کا گھر یاد آیا تھا۔ اس کا باتھ روم بھی اس کمرے سے زیادہ بڑا تھا۔ لڑکی کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کہاں بٹھائے۔ سادہ لباس میں ملبوس ہونے کے باوجود وہ اپنے چہرے اور حلیے سے اسے کوئی معمولی عورت نہیں لگی تھی۔ اس نے کچھ بوکھلاہٹ کے بعد ایک جھلنگا سی چارپائی اس کے سامنے بچھا دی تھی۔ فلک چارپائی پر بیٹھنے کے بجائے مٹی سے لیپے ہوئے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ لڑکی جیسے سکتہ میں آ گئی تھی۔ پھر کچھ ہچکچاہٹ کے بعد وہ خود بھی فلک کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گئی تھی۔

"تمہاری امی کہاں ہیں؟" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھا تھا۔

"وہ کچھ گھروں میں کام کرتی ہیں، وہاں گئی ہوئی ہیں۔"

"اور ابو؟"

"انہیں مرے دو سال ہو گئے ہیں۔"

فلک ایک لمحے کو چپ ہو گئی تھی۔ "کتنے بہن بھائی ہو؟"

"تین بہنیں اور دو بھائی۔" اس نے لڑکی کے چہرے پر ایک سائے کو گزرتے دیکھا تھا۔

"ماجد کے مرنے کا مجھے بہت افسوس ہوا۔ دوسرا بھائی کیا اس سے بڑا ہے؟"

"نہیں، وہ سات سال کا ہے۔"

"تم سب سے بڑی ہو؟"

"ہاں، باقی دو اماں کے ساتھ لوگوں کے گھر کام کرنے جاتی ہیں۔ میں گھر پر ہوتی ہوں۔ کپڑے سیتی ہوں مقتے بناتی ہوں اور بھی بہت سے کام کرتی ہوں، تمہیں کوئی کام کروانا ہے کیا؟"

فلک گم صم اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی آس تھی۔ یوں جیسے فلک نے اپنا بیگ کھولا تھا پھر ایک پیکٹ

نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کچھ روپے ہیں، تم اپنی امی کو دے دینا۔ میں دوبارہ آؤں گی۔ تم لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا وہ لڑکی کو ہکا بکا چھوڑ کر وہاں سے نکل آئی تھی۔

اس دن وہ اس بچے کے بارے میں پوچھنے کے لیے اسی سڑک پر آئی تھی۔ سڑک پر اخبار بیچنے والے بچوں سے اس نے اس بچے کے بارے میں پوچھا تھا اور یہ جان کر وہ دل گرفتہ سی ہو گئی تھی کہ وہ بچہ مر چکا ہے۔ "کیا تم مجھے اس کا پتا بتا سکتے ہو؟" فلک نے ایک بچے سے کہا تھا وہ بچہ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد اسے اس علاقے میں لے آیا تھا جہاں جھگیوں اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں کا پورا جہاں آباد تھا اور پھر وہ جد کے گھر پہنچ گئی تھی۔

اپنے گھر واپس آتے ہوئے، اسے پہلی بار اپنے گھر کے در و دیوار مانوس نہیں لگ رہے تھے، اسے آدھے گھنٹے پہلے دیکھی ہوئی وہ جھگی یاد آ گئی تھی۔ اسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اسے حلق سے دبوچ لیا تھا۔

"لوگ کن کن چیزوں کے بغیر رہ رہے ہیں اور میں۔ مجھے لگتا ہے کہ دنیا میں کسی پر قیامت ٹوٹی ہے تو وہ میں ہی ہوں۔ چھ کنال کے بنگلے میں رہ کر، آٹھ آٹھ لاکھ کی گاڑیوں میں پھر کر، اپنے وجود کو آسائشوں سے سجا کر اور اپنے پیٹ کو دنیا کی ہر نعمت سے بھر کر آخر مجھے کس اللہ کی تلاش ہے۔ وہ آخر مجھ پر نظر کرے تو کیوں کرے۔ مجھ سے محبت کرے تو کیوں کرے۔ مرد محبت کرے تو تحائف کا ڈھیر عورت کے سامنے لگا دیتا ہے۔ اس کے لیے بے تحاشا روپیہ خرچ کرتا ہے اسے ہوٹلز میں لے کر جاتا ہے۔ وہ کسی چیز کی طرف اشارہ کرے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ اسے خرید کر نہ دے۔

عورت مرد سے محبت کرتی ہے تو اس مرد کے اشارے پر چلتی ہے۔ وہ اس سے روپیہ مانگے تو وہ سو جھوٹ بول کر ہر قیمت پر اسے روپیہ دیتی ہے۔

اللہ سے انسان محبت کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اللہ بھی اس سے محبت کرے مگر محبت کے لیے وہ کچھ دینے کو تیار نہیں۔ اللہ کے نام پر وہی چیز دوسروں کو دیتا ہے جسے وہ اچھی طرح استعمال کر چکا ہو یا پھر جس سے اس کا دل بھر چکا ہو۔ چاہے وہ لباس ہو یا جوتا۔ وہ خیرات کرنے والے کے دل سے اتری ہوئی چیز ہوتی ہے اور اس چیز کے بدلے وہ اللہ کے دل میں اترنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اس پرانے لباس، گھسی ہوئی چپل یا ایک پلیٹ چاولوں کے بدلے، اسے جنت میں گھر مل جائے۔ اللہ اس کی دعائیں قبول کرنا شروع کر دے۔ اس کے بگڑے کام سنورنے لگیں۔ وہ جانتا ہے، اللہ کو دلوں تک سرنگ بنانا آتا ہے پھر بھی وہ اللہ کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور میں، میں فلک شیر افگن صرف آنسو بہا کر، مصلے پر بیٹھ کر، صرف اللہ کا نام لے کر اللہ کی محبت حاصل کرنا چاہتی ہوں اس کی نظر چاہتی ہوں مگر اس کے لیے کرنا کچھ نہیں چاہتی۔"

کوئی اس کے دل کو جیسے مٹھی میں لے رہا تھا۔ لاؤنج کے اندر جانے کے بجائے وہ باہر دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔ سامنے نظر آنے والا وسیع و عریض لان جیسے اسے ہولا رہا تھا۔ اس نے اپنی قمیص کے دامن کو پکڑ کر دیکھا۔ لباس سادہ تھا مگر قیمتی تھا۔ اسے یاد تھا چند ماہ پہلے اس نے کراچی سے سلمان کے ساتھ گرمیوں کے ملبوسات کی شاپنگ کی تھی تب بھی وہ واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اسے اس کپڑے کی قیمت یاد نہیں تھی مگر یہ یاد تھا کہ وہ قیمت ہزاروں میں تھی۔

"یہ توکل ہے؟ یہ قناعت ہے؟ یہ صبر ہے؟ یہ عاجزی ہے؟ اور مجھے چاہیے اللہ۔"

اس کا دل ڈوب گیا تھا۔ قمیص کو اس نے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ پاؤں میں پہنے جوتے پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اس نے دائیں پیر کا جوتا اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا آج وہ جس علاقے سے ہو کر آئی تھی۔ وہاں اس نے بہت سی عورتوں اور بچوں کے پیروں میں معمولی سی چپل تک نہیں دیکھی تھی ورنہ اس جوتے کی قیمت بھلا کیا ہوگی؟ اس نے سوچنے کی کوشش کی تھی۔ اسے یاد نہیں آیا۔ وہ ہر بار شاپنگ پر جانے پر دو چار جوتے ضرور لیا کرتی تھی اور مہینے میں چھ سات بار وہ شاپنگ پر چلی جایا کرتی تھی۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ یہ جوتا اس نے کب خریدا تھا مگر وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ اس کا کوئی جوتا بھی ایک ہزار سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے جوتا گر گیا تھا۔ وہیں دیوار کے ساتھ پیشانی ٹیک کر اس نے سسکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا تھا۔ شاید کسی ملازم نے اندر جا کر اس کی ممی کو اطلاع دی تھی وہ تقریباً بھاگتی ہوئی باہر آئی تھی۔

"فلک! تم واپس آ گئیں؟ کیا ہوا ہے میری جان؟ کیوں اس طرح رو رہی ہو؟" انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔

"ممی! آپ کو پتا ہے مجھے اللہ کیوں نہیں مل سکتا۔ میرے اور اللہ کے درمیان خواہشوں کی دیوار ہے۔ آسائشوں کی دیوار ہے۔ میں نے اپنے ارد گرد دنیا کی اتنی چیزیں اکٹھی کر لی ہیں کہ اللہ تو میرے پاس آ ہی نہیں سکتا۔ ابو بن ادھم کو اس کی محبت کی چاہ تھی۔ اسے اس نے اپنی محبت دے دی۔ میری تمنا یہ چیزیں تھیں۔ آسائشات تھیں، سامان تھا۔ مجھے اس نے بس یہ سب کچھ ہی دیا جسے وہ اپنی محبت دے دیتا ہے، اسے پھر اور کسی چیز کی خواہش ہی نہیں ہوتی اور جسے دنیا دیتا ہے اس کی خواہش بھوک بن جاتی ہے۔ کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ ممی ابو بن ادھم جیسے لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں اور میرے جیسے لوگ۔"

وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

"کون ابو بن ادھم؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ممی اب پریشان ہو رہی تھیں۔

"ممی! مجھے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کچھ بھی نہیں۔ جن لوگوں کی سمجھ میں آ جاتا ہے، انہیں سب کچھ مل جاتا ہے۔ میرے جیسے لوگ تو ساری زندگی سمجھنے کی کوشش ہی کرتے رہ جاتے ہیں۔"

"تمہیں پھر دورہ پڑ گیا ہے پھر وہی جنون سوار ہو گیا ہے۔" اس کی ممی نے ایک گہری سانس لے کر کہا تھا۔

"یہ جنون نہیں ہے۔ ممی! یہ جنون نہیں ہے۔" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

"یہ جنون ہے۔" اس نے زمین پر پڑا ہوا جوتا انہیں دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ ایک عجیب سی وحشت اس پر سوار ہو گئی تھی۔

"یہ جنون ہے۔" اب وہ اپنی قمیص پکڑ کر انہیں دکھا رہی تھی۔

"یہ لاکھوں کی گاڑیاں جنون ہے۔" اس نے پورچ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "یہ کروڑوں کے گھر جنون ہیں۔ آئیں میں آپ کو دکھاؤں اور کیا کچھ جنون ہے۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی انہیں گھر کے اندر لے گئی۔ "یہ کارپٹ جنون ہے جس پر چلتے ہوئے ہمیں لوگوں کے پیروں میں چبھتے ہوئے پتھر اور کانٹے محسوس نہیں ہوتے۔ یہ عالی شان اور قیمتی فرنیچر جنون ہے جس پر بیٹھ کر ہمیں اپنا وجود بھی اتنا ہی عالی شان اور قیمتی لگنے لگتا ہے۔"

وہ لاؤنج میں آ کر چلانے لگی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے فلک" ممی اب گھبرا رہی تھیں۔

"ہاں ممی! میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔ میرے اور آپ جیسے سارے لوگ پاگل ہی تو ہوتے ہیں ہم لوگوں نے چیزوں سے اتنا عشق کیا ہے کہ اس دنیا میں رہنے والے انسانوں کی زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ ہم سب پاگلوں نے مل کر۔ آئیں میں دکھاؤں مجھے کن چیزوں نے پاگل بنایا ہے۔ وہ ایک بار پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے بیڈروم میں لے آئی۔ روتے ہوئے اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے پرفیوم ان کی طرف اچھالنے شروع کر دیے تھے۔"

"یہ بھی جنون ہے ممی! میرے اور آپ جیسے لوگ اپنے اندر کی بدبو کو چھپانے کے لیے یہ پرفیوم خود پر انڈیلتے ہیں۔ اپنے چہرے اور وجود کو میک اپ سے رنگتے رہتے ہیں۔" اس نے اب اپنی وارڈروب کھول کر کپڑے باہر پھینکنے شروع کر دیے تھے۔

"یہ ہے جنون ممی! یہ ابو بن ادھم جیسے لوگ لباس سے جسم کو چھپانے کا کام لیتے ہیں۔ ہمارے جیسے لوگ جسم کو دکھانے کا۔ یہ مہنگے کپڑے پہن کر ہمیں چیتھڑوں میں پھرنے والے لوگ جانور لگتے ہیں۔" اس کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔

"یہ جنون ہے ممی۔" اب اس نے اپنی دراز کھول کر زیور کمرے میں اچھالنے شروع کر دیے تھے۔ "یہ جنون ہے۔ یہاں کتنے لوگ ہیں ممی جو ایک وقت کے کھانے کے لیے صبح سے شام تک جانوروں کی طرح کام کرتے ہیں پھر بھی بہت دفعہ نہیں کچھ کھانے کو نہیں ملتا جو رات کو سوئیں تو انہیں یہ بھی یقین نہیں ہوتا کہ صبح تک جھگی کی اڑتی ہوئی چھت ان کے گھر کو گھر رہنے دے گی۔ یا ملبے کا ڈھیر بنا دے گی۔ ماجد جیسے بچوں کے لیے کوئی بچپن سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ ان کی زندگی پیدائش سے مرنے تک صرف بڑھاپا ہوتا ہے اور میرے جیسے لوگ روپیہ صرف زندگی کی بنیادی ضروریات پر ہی خرچ نہیں کرتے پھر انہیں اپنے وجود پر زیور بنا کر ٹکا بھی لیتے ہیں۔ جسم کے ہر حصے پر، پاؤں میں انگلیوں میں۔ کلائیوں میں، کانوں میں، ناک میں، گردن میں، ماتھے پر، سر پر، کیا حق پہنچتا ہے ممی! مجھے اور آپ جیسے لوگوں کو یہ ظلم کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ پھر ڈاکے کیوں نہ پڑیں ہم جیسے لوگوں کے گھروں پر دن دہاڑے سڑک پر ہمارا زیور کیوں نہ لوٹا جائے۔"

وہ بلک رہی تھی۔ اس کی ممی دم بخود سے دیکھ رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر بیڈروم ریفریجریٹر کھول دیا تھا۔

"یہ چیزیں ہیں ممی! جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ ان چیزوں کو کھانے کے بعد ہمیں روٹی کے سوکھے ٹکڑوں سے پیٹ بھرنے والے کیڑے لگتے ہیں، انسان نہیں۔"

"یہ سب خدا کی رحمت ہے۔ اس کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہے دے۔ ہمیں دیا ہے تو ہمیں اسے خرچ کرنے کا حق ہے، تمہیں شکر کرنا چاہیے کہ خدا نے تمہیں ان سب چیزوں سے محروم نہیں کیا۔"

میمونہ پہلی بار بالآخر ہمت کر کے بولی تھیں۔

"ممی! دولت فضل نہیں ہے آزمائش ہے۔ کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا یہ فریج رحمت نہیں ہو سکتا، کپڑوں سے بھری ہوئی یہ وارڈروب

رحمت نہیں ہو سکتی، جیولری سے بھرے ہوئے یہ دراز اور روپے سے بھرا ہوا یہ لاکر بھی رحمت نہیں۔ یہ گاڑیاں، یہ بنگلے، یہ سب کچھ رحمت نہیں ہے۔ فضل نہیں ہے ممی اسراف ہے، کمینگی ہے، خود غرضی ہے، ذلالت ہے۔ آپ کے اور میرے پاس یہ رحمت اور فضل ہے تو اس گھر کے نوکر ہماری اترن کیوں پہنتے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے کوارٹروں میں کیوں رہتے ہیں۔ اس رحمت اور فضل کی حفاظت کے لیے جو گارڈ گیٹ پر کھڑے ہیں۔ وہ ٹوٹی ہوئی سائیکلوں پر کیوں جاتے ہیں۔ اس گھر میں رہنے والے نوکروں کے بچے چیزوں کے لیے کیوں ترستے ہیں، ہم نے اللہ کی رحمت اور فضل میں سے انہیں کیا دیا؟ اپنی اترنیں، بچا ہوا کھانا، جھڑکیاں، تنخواہوں میں سے کٹوتی۔ آپ نے کبھی نوکروں کے بچوں سے پوچھا کہ وہ اسکول کس طرح جاتے ہیں۔ گر پیدل جاتے ہیں تو آپ نے کبھی اپنی ان دس گاڑیوں میں کسی ایک پر چند گھنٹوں کے لیے انہیں سفر کرنے دیا۔ اگر اسکول نہیں جاتے تو آپ نے کبھی جاننے کی کوشش کی کہ کیوں نہیں جاتے۔ میں سوچتی ہوں، کاش اللہ مجھے کچھ نہ دیتا پھر میں اس سے یہ سب کچھ، مانگتی، مانگنے کا ہی سہی مگر اس کے اور میرے درمیان کوئی رشتہ تو ہوتا، چھبیس سال میں ایک بار ہی سہی کبھی میں اس سے کچھ مانگتی تو اور پھر وہ مجھے وہ چیز دے دیتا تو میں خوش ہو کر اسے اور یاد کرتی۔ اس کا شکر یاد کرتی اور، اگر وہ میری دعا قبول نہ کرتا تو بھی میں شکر کرتی۔ اس کی رضا پر خوش رہتی اور یہ شکر گزاری، یہ صبر اسے کتنا خوش کرتا۔ ممی! یہ لوگ جو ہمیں کیڑے اور جانور لگتے ہیں، یہ خدا کے نزدیک کیا ہیں کاش آپ کو بھی پتا چل جاتا۔“

وہ اب کارپٹ پر گھٹنوں کے بل گرے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ میمونہ بے بسی سے اس کے پاس کھڑی تھیں۔ اس عمر میں، اکلوتی اولاد کو اس طرح خوار ہوتے بھی دیکھنا تھا۔ انہیں بے اختیار رونا آیا تھا۔

* * *

اگلے تین ہفتے وہ ہاسپٹل رہی تھی۔ ایک بار پھر وہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی تھی۔ اس بار پچھلی بار کی نسبت اس کی کیفیت زیادہ خراب تھی۔ جب تک وہ ٹرینکولائزرز کے زیر اثر رہتی۔ سب کچھ ٹھیک رہتا، مگر جب بھی وہ ہوش میں آتی، چیخنے چلانے لگتی۔ اس کے سر میں درد ہوتا، وہ دم گھٹنے کی شکایت کرتی۔ اس کی بھوک پیاس ختم ہو گئی تھی۔ تین ہفتے بعد آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی گئی تھی۔ شیر افگن ڈاکٹر سے مشورہ کے بعد اسے گھر لے آئے تھے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے امریکہ بھجوا دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ ماحول کی تبدیلی اس کی ذہنی حالت کو بہتر کر دے گی۔

اس صبح میمونہ نے اسے کمرے سے کچھ بیگز کے ساتھ نکلتے دیکھا تو وہ ہول گئی تھیں۔ ”کہاں جا رہی ہو فلک؟“

”تھوڑی دیر میں آ جاؤں گی ممی۔“ وہ آج خلاف معمول بہت پرسکون لگ رہی تھی۔

”مگر جا کہاں رہی ہو اور ان بیگز میں کیا ہے؟“ میمونہ کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔

”میری چیزیں ہیں، کسی کو دینے جا رہی ہوں۔“

”کس کو دینے جا رہی ہو؟“

”جن کو ضرورت ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں ممی! ان چیزوں کے بغیر کیسے رہا جاتا ہے۔ کل رات میں نے ایک کتاب میں پڑھا کہ جن کا

دل مومن ہوتا ہے۔ وہ خدا کے نام پر کچھ بھی دے سکتے ہیں۔ کسی بدل کے بغیر، میں دیکھنا چاہتی ہوں ممی! کیا میرا مومن کا دل ہے۔ کیا اپنی بہترین اور پسندیدہ چیزیں دوسرے کو دینے پر مجھے درد ہوتا ہے؟“ میمونہ اسے روکنا چاہا تھا مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی تھیں۔ وہ چلی گئی تھی۔

”وہ جو کرتی ہے، اسے کرنے دو۔ اگر یہ سب کرنے سے وہ ٹھیک ہو سکتی ہے تو یہ سب کچھ مہنگا نہیں ہے۔ دے دینے دو جو دینا چاہتی ہے۔“

اس کے جانے کے بعد انہوں نے گھبرا کر شیر افگن کو فون کیا تھا اور انہوں نے اسے یہ جواب دیا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

پھر یہ سب کئی ہفتے ہوتا رہا تھا۔ اس نے اپنی تقریباً تمام چیزیں مختلف اداروں کو عطیہ کر دی تھیں۔ وہ روز صبح گھر سے پیدل نکل جاتی، کبھی ایس او ایس ولیج جا کر پورا دن وہاں بچوں کو پڑھاتی رہتی یا پھر چھوٹے بچوں کو سنبھالتی، کبھی فاؤنٹین ہاؤس جا کر شیزوفرینیا کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے ویگنوں میں سفر کرنا سیکھا تھا۔ لوگوں کے ہجوم میں دھکے کھاتے ہوئے سکڑتے سمٹتے ہوئے اپنے لیے جگہ بناتے ہوئے اس نے اس تکلیف کو محسوس کیا تھا، جو اس کے اردگرد نظر آنے والے عام لوگوں کا مقدر تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے چیزیں خریدنے ان معمولی بازاروں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں جانے لگی تھی پہلے جن کے تصور سے بھی اس کا دم گھٹتا تھا۔ اپنے وجود کو سر سے پاؤں تک ایک سیاہ چادر سے چھپائے وہ لوگوں کے چہرے حسرت سے دیکھتی ہر چہرے کو دیکھ کر اسے یوں لگتا جیسے اللہ اس سے ہی محبت کرتا ہوگا۔

اس دن اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے اسے اچانک کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے سڑک پر چلتے ہوئے اچانک پیروں سے چپل اتار کر پیدل گرم سڑک پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ گرم سڑک اور اس پر پڑے ہوئے پتھر اس کے پیروں کے تلووں کو جھلسانے لگے تھے۔ سڑک پر اکا دکا ٹریفک آ رہی تھی۔ وہ گیلی آنکھوں اور جلتے تلووں کے ساتھ دور تک چلتی رہی پھر جب تکلیف اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے چپل پیروں میں پہن لی۔

”اور جب حضور ﷺ اپنے صحابیوں رضوان اللہ علیہم کو ہدایت دیتے تھے کہ وہ آسائش کو عادت نہ بنائیں اور کبھی کبھار ننگے پاؤں بھی چلیں تو وہ انہیں اس تکلیف سے مانوس کرنا چاہتے تھے جسے میں برداشت نہیں کر سکی اور جو بہت سے لوگوں کا مقدر ہوتی ہے۔“

اسے اپنے پیروں میں اب بھی جلن محسوس ہو رہی تھی اور اب اسے ان لوگوں کے گندے اور ننگے پیروں سے گھن نہیں آ رہی تھی جو کسی جوتے سے بے نیاز سامان کندھوں پر اٹھائے ادھر ادھر جاتے اسے نظر آتے تو اسے وحشت ہوتی۔ گھر آ کر اس نے الماری میں پڑے ہوئے چند آخری جوتے بھی نکال لیے تھے۔

”امینہ! یہ لو یہ جوتے تم پہن لینا۔“ وہ جوتے لے کر گھر کے پیچھے سرونٹ کوارٹر گئی تھی اور وہاں اس نے اپنی نوکرانی کے پیروں میں اتنی عقیدت اور عاجزی سے جھک کر وہ جوتے رکھے تھے کہ وہ گھبرا گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی مالکہ سے کچھ کہتی، وہ وہاں سے آ گئی تھی۔

”بی بی کے دماغ کو واقعی کچھ ہو گیا ہے۔“

امینہ نے نئے جوتے چھوتے ہوئے ہمدردی سے اپنی مالکہ کے بارے میں سوچا تھا۔

اس دن وہ اچھرہ بازار میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان پر گئی تھی۔

”مجھے وہ سوٹ دے دیں جو بہت سستا ہو پھر بھی ہر کوئی اس میں نقص نکال کر ناپسند کرتا ہو اور خریدنے سے انکار کر جائے۔“

دکاندار نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ اس کی اس بات سے اسے اس لڑکی کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا۔ مگر اس کی شکل و صورت اسے اپنا خیال بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ کچھ ہچکچاتے ہوئے اس نے ایک سوٹ پیس اس کے سامنے رکھ دیا تھا اس نے کچھ کہے بغیر قیمت ادا کی اور کپڑا اٹھا کر باہر نکل آئی۔

میمونہ اور شیر افگن نے جیسے اس کے حال پر صبر کر لیا تھا۔ ان کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح معمولی باتوں پر روتی تھی نہ اس پر ڈپریشن کے دورے پڑتے تھے۔ وہ صبح گھر سے نکلتی اور سہ پہر کو مقررہ وقت پر گھر آ جاتی۔ پھر خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھ کر قرآن پاک کا انگلش ترجمہ پڑھتی رہتی۔ ان کا خیال تھا آہستہ آہستہ وہ نارمل ہوتی جائے گی اور پھر وہ سلمان سے طلاق لے کر اسے باہر بھجوا دیں گے۔ انہوں نے اس کے منہ سے یہاں آنے کے بعد کبھی سلمان کا ذکر نہیں سنا تھا۔ اس سے کوئی شکوہ اس کی کوئی شکایت اپنا کوئی پچھتاوا وہ انہیں کچھ بھی نہیں بتاتی تھی۔

رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ رمضان کے پہلے جمعے کو وہ صلوٰۃ التسبیح پڑھنے شہر کے وسط میں واقع ایک جامع مسجد میں آئی تھی۔ ویگن سے اترنے کے بعد مسجد کی طرف آتے ہوئے اس نے فٹ پاتھ پر ایک درخت کے نیچے ایک بوڑھے آدمی کو کچھ روپے گنتے دیکھا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر اس آدمی سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ آدمی مختلف مالیت کے مڑے تڑے اور میلے کچیلے نوٹ اور سکے فٹ پاتھ پر گن گن کر رکھتا جا رہا تھا۔ ایک بار گننے کے بعد اس نے دوبارہ روپے گننے شروع کر دیئے تھے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آ رہا تھا۔ وہ وہیں کھڑی اسے بار بار روپے گنتے دیکھتی رہی۔ وہ یا تو بار بار گنتی بھول رہا تھا یا پھر اس کے روپے کم تھے۔ فلک بے اختیاری اس پاس آ گئی تھی۔

”کیا بات ہے بابا؟“ بوڑھے آدمی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا پھر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”بیس روپے کہیں گر گئے ہیں میری کل کی دیہاڑی میں سے۔“

فلک نے چند لمحے اس بوڑھے آدمی کے جھکے ہوئے سر کو دیکھا تھا اور پھر اپنی چادر کے پلو کو کھول کر اس میں بندھے ہوئے روپے نکال لیے تھے پچاس کا نوٹ تڑوا کر اس نے دس روپے ویگن والے کو کرائے کے طور پر دیئے تھے۔ باقی چالیس روپے اس نے پلو میں باندھ لئے تھے۔ اب وہ چالیس روپے اس نے جھک کر اس بوڑھے آدمی کے سامنے رکھ دیئے تھے۔

”یہ لیں بابا“ وہ دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے مسجد کی طرف بڑھ گئی تھی۔ آج وہ پہلی بار بالکل خالی ہاتھ تھی۔ لیکن اسے کوئی رنج نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی واپسی پر اسے چار میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہو گا۔ وہ بھی روزے کی حالت میں۔ مگر وہ اس چیز کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی۔

صلوٰۃ التسبیح کی نماز پڑھنے کے بعد وہ مسجد سے باہر نکل رہی تھی۔ جب اچانک بغیر کسی وجہ کے اس کا دل بھر آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گھر جانے کو نہیں چاہا تھا۔ وہ سیڑھیوں کے ایک کنارے پر بیٹھ گئی۔ عورتیں مسجد کے اس مخصوص دروازے سے نکل کر جا رہی تھیں وہ گھٹنوں میں سر چھپائے وہیں بیٹھی رہی۔

”تجھے کیا ہوا ہے؟“ کسی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو اس کے سامنے سیڑھی پر کھڑی تھی۔

”پتا نہیں اماں۔“ اس نے کہا تھا۔

”کس کے ساتھ آئی ہے؟“ اس عورت نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا تھا۔

”پتا نہیں۔“

”روتی کیوں ہے؟“ اس عورت کی نظر اب اس کے چہرے پر تھی۔

”یہ بھی پتا نہیں۔“

”کوئی بیماری لگ گئی ہے؟“ اس عورت کی آواز میں اب تشویش تھی۔

”بیماری نہیں اماں! روگ۔“

”ہائے ہائے اس جوانی میں روگ لگ گیا۔“ اب اس کی آواز میں ہمدردی تھی۔

”یہ روگ جوانی میں ہی لگتے ہیں اماں۔“

”گھر کیوں نہیں جاتی؟“

”گھر ہو تو جاؤں۔“

”گھر چاہیے؟“

”نہیں“

”تو پھر؟“ وہ عورت اب حیران تھی۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس عورت کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تمہیں کیا بتاؤں اماں کیا چاہیے؟“

”تو بتا تو سہی۔“ عورت نے اصرار کیا۔

”بتانے سے مل جائے گا کیا؟“

”سب کچھ بتانے سے ہی ملتا ہے۔ نہ بتانے سے کیسے ملے گا۔ مانگنا پڑتا ہے۔ کہنا پڑتا ہے۔ منت کرنی پڑتی ہے، وجود کے نصیب میں ہے بھکاری ہونا بس ذات بھکاری نہیں ہو سکتی۔“

وہ سن ہو گئی تھی۔ ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سے گزر گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر بوڑھی عورت کا چہرہ دیکھا تھا۔

”وجود کے مقدر میں منگتا ہے۔ ”ذات“ کا وصف دینا ہے۔ کوئی عشق منگتا ہے، کوئی دنیا، اور جو یہ نہیں منگتا وہ خواہش کا نہ ہونا مانگتا ہے۔“

اس نے بے اختیار اس بوڑھی عورت کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے پوری طاقت سے یوں جیسے وہ غائب ہو جائے گی۔

”تو بتا، تجھے کیا چاہیے؟“ پچھلے ایک سال سے جو فقرے رات دن اس کے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ وہ انہیں سننے میں غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ پورے دو سال بعد اس نے ایک بار پھر وہی کلمات اس عورت کے منہ سے سنے تھے جو دریا کے کنارے بیٹھے ہوئے اس فقیر نے کہے تھے۔

”ہاں تو بتا، تجھے کیا چاہیے؟“ عورت ایک بار پھر سے اس سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا پورا وجود کسی پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

”مجھے کُل چاہیے۔ مجھے ذات چاہیے۔ مجھے اللہ چاہیے، صرف اللہ چاہیے۔“

وہ کسی ننھے بچے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کر بلکنے لگی تھی۔

”اس سے کہو۔ مجھے دیکھے اس سے کہو۔ مجھ پر نظر کرے۔ ایک بار ایک لمحہ کے لیے، میں دیکھنے کے قابل نہیں ہوں پر اس سے کہو مجھے دیکھے اسے کہو میرے گندے وجود پر بھی ایک بار اپنی نظر کرے۔ اسے تو ٹھوکر مارنا نہیں آتا۔ اسے تو دھتکارنا نہیں آتا۔ وہ تو فرق نہیں کرتا۔ وہ تو آس نہیں توڑتا۔

اس نے اب عورت کا ہاتھ چھوڑ کر اس کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”تجھے بنایا ہے اس نے تو کیا تجھے چھوڑ دے گا؟ کبھی ماں میلے میں بچے کی انگلی چھوڑتی ہے۔ گر چھوٹ بھی جائے تو بچہ اتنا بے قرار نہیں ہوتا جتنی ماں ہوتی ہے۔ پھر اللہ انسان کو کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ اس کی نظر میں جو ایک بار آ جاتا ہے ہمیشہ رہتا ہے۔“

اس نے اس عورت کے منہ سے ایک بار پھر وہی لفظ سنے تھے۔ اس نے سیڑھی سے ٹیک لگا لی۔ ایک عجیب سی ٹھنڈک اسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔ بہت گہرا سکون اس کے اندر اترتا جا رہا تھا اس کے آنسو تھم گئے تھے۔

”گھر جا، اب اور کیا چاہیے تجھے؟“

اس عورت نے ایک بار پھر اس سے کہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”چلی جاؤں گی اماں! اب واقعی اور کیا چاہیے۔“

بڑبڑاتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول دیں، سامنے سیڑھی پر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ عورت غائب ہو چکی تھی۔ وہ پرسکون انداز میں وہیں بیٹھی رہی اس نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

* * *

وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے وجود کو دیکھا تھا۔ ایک سال نے کتنی بہت سی تبدیلیاں کر دی تھیں۔ ہر چیز میں، باطن میں، ظاہر میں اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے دائیں ہاتھ سے چہرے کے ہر حصے کو چھوا تھا۔ آج کچھ بھی دلفریب نہیں لگ رہا تھا۔ آج پہلے کی طرح اپنا وجود آئینے میں دیکھ کر اس پر سحر نہیں ہو رہا تھا۔ اسے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہو رہا تھا۔ پورے ایک سال بعد وہ آج بیوٹی پارلر گئی تھی۔ ممی کے ساتھ وہ بہت خوش تھیں اس کے نارمل ہو جانے پر ممی نے اس کا فیشل کروایا تھا۔ پلکنگ، تھریڈنگ، بیچنگ وہ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ اس نے پہلے کی طرح بیوٹیشن کے کام میں بار بار مداخلت نہیں کی تھی نہ ہی کوئی اعتراض کیا تھا۔

بیوٹی پارلر سے نکلتے ہوئے اس نے جسم کے گرد لپٹی ہوئی چادر کو ایک بار پھر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا۔ میمونہ کے ماتھے پر کچھ شکنیں ابھری تھیں۔

"کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گی۔" انہوں نے خود کو دل ہی دل میں سمجھایا تھا۔

"تم نے اپنی اسکن کا ستیاناس کر لیا ہے۔"

گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے فلک سے کہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک پرسکون مسکراہٹ ابھری تھی۔

"اللہ نے میرے دل کے داغ صاف کر دیے ہیں، چہرے کی مجھے فکر نہیں ہے۔"

میمونہ خاموش رہی تھیں وہ نہیں چاہتی تھیں۔ وہ دوبارہ پہلے جیسی باتیں کرنے لگے۔

اور اب وہ آئینے کے سامنے کھڑی دیکھ رہی تھی اسی وجود کو جس سے اسے عشق تھا، فخر تھا اور اب سب کچھ جیسے دھواں بن کر اڑ چکا تھا۔ عشق بھی فخر بھی، وہ ایک گہری سانس لے کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔

"فلک! فلک! سلمان آیا ہے۔"

ایک دم میمونہ اس کے کمرے میں آئی تھیں، خوشی ان کے پور پور سے چھلک رہی تھی اس نے ایک لمحے کو نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا پھر نظر ہٹا لی۔

"جانتی ہوں ممی! کہ وہ آ گیا ہے۔ جانتی تھی کہ وہ آ جائے گا۔"

"وہ اس عورت کو طلاق دے آیا ہے۔ معافی مانگی ہے اس نے، کہتا ہے تمہیں لینے آیا ہے۔" میمونہ نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔

"برا کیا اس نے۔" چند لمحے ماں کا چہرہ دیکھنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

"ٹھیک کیا اس نے بالکل ٹھیک کیا۔ اس عورت کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ تمہیں کیا پتہ اس نے کس طرح دونوں ہاتھوں سے اس کا روپیہ لٹایا ہے۔ تم تو......"

میمونہ اشتعال میں بول رہی تھیں اس نے ہاتھ اٹھا کر بڑی ملائمت سے ان کی بات کاٹی تھی۔

"ممی! بس آپ چپ ہو جائیں۔ کچھ نہ کہیں نہ اس عورت کے بارے میں نہ روپے کے بارے میں نہ سلمان کے بارے میں۔"

"وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میمونہ نے اس سے کہا تھا۔

"بھیج دیں اسے۔" وہ اب بھی اسی طرح پرسکون تھی۔ میمونہ مسکرا کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔

پورے ایک سال بعد دروازے سے وہ وجود اندر آیا تھا جسے دیکھ کر اس کی دھڑکن رک جایا کرتی تھی۔ جس کے چہرے سے وہ کوشش کے باوجود نظر نہیں ہٹا سکتی تھی۔ جس کی آواز اس کے ذہن میں نہیں دل میں گونجتی تھی۔ جس سے چند لمحوں سے زیادہ نظریں ملائے رکھنا اس کے لیے بہت دشوار ہو جاتا تھا۔ آج۔۔۔ آج ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ دل دھڑکنا بھولا تھا نہ اس سے نظر ملانی مشکل ہوئی تھی۔ وہ پرسکون انداز میں اسے کمرے میں آتا دیکھتی رہی۔ وہ شرمندہ تھا یہ اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

"السلام علیکم!" گفتگو میں پہل اس نے کی تھی۔ وہ چونکا تھا۔ وہ ہمیشہ ہیلو کہہ کر مخاطب ہوتی تھی اب چند لمحوں کے لیے وہ کچھ نہیں بول سکا پھر اس نے کچھ جھجکتے ہوئے وعلیکم السلام کہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ کسی معمول کی طرح صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔

"کیسے ہو؟" وہ اب حیران ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟" اس نے جواباً پوچھا تھا۔

"بہت اچھی ہوں۔"

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، سیاہ کاٹن کے لباس میں ملبوس وہ سیاہ ہی رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ وہ بہت دیر تک اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔ اس کا چہرہ خلاف معمول میک اپ سے عاری تھا اور کوئی بہت ہی خاص کیفیت لیے ہوئے تھا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ جانتا ہوں۔ میں یہ بات کہنے کا حق نہیں رکھتا مگر پھر بھی تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ اس سب کے لیے جو میں نے کیا۔ میں نہیں جانتا، میں نے یہ سب کیسے کیا ہے؟ مگر میں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا تھا۔

"تمہاری جدائی نے مجھے جس چیز سے نوازا ہے۔ اس کے آگے میرے لیے سلطان نصیر یا کسی کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ چھبیس سال کے بعد میں نے ایک سال اللہ کے ساتھ گزارا ہے اور اس پورے سال میں میرا دھیان کسی اور طرف گیا ہی نہیں۔ تمہاری طرف بھی نہیں۔ مجھے کوئی دکھ، کوئی افسوس نہیں ہے کہ ایک سال کے لیے تم نے مجھے جو کچھ دیا وہ چھبیس سال نہیں دے سکے۔ میں نے تو اس پورے سال تمہارے بارے میں سوچا ہی نہیں ہے۔ تم کس کے ساتھ تھے۔ کیوں تھے اس سب کا خیال نہیں آیا پھر تم کیوں شرمندہ ہو؟"

وہ بہت دیر تک کچھ بول نہیں سکا تھا۔ صرف اس کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔

"میرے ساتھ چلو فلک! میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" فلک نے اسے دیکھا تھا۔

"کیا میرے لیے اس شخص کی اہمیت اس کمرے میں لٹکے ہوئے پردوں، کارپٹ، صوفہ، بیڈ، فریج جیسی نہیں ہو گی۔ چیزیں ہیں تو ہیں نہ ہوں تو

نہ کی ور میں ... میں کسی زمانے میں اس شخص سے اتنا عشق کرتی تھی کہ اس کے علاوہ مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور اب مجھے یہ شخص نظر نہیں آ رہا۔"

اس نے سوچا تھا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

"میں چلوں گی لیکن تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں جس فلک سے تم نے چار سال پہلے شادی کی تھی۔ وہ مر چکی ہے۔ آج تم جسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ وہ کوئی اور ہے۔ اس فلک کے لئے سب کچھ تم تھے۔ میرے لئے سب کچھ اللہ ہے۔ اس فلک کے پاس صرف ظاہر تھا۔ میرے پاس صرف باطن ہے۔ وہ تماشہ دیکھنا بھی پسند کرتی تھی، بننا بھی۔ مجھے یہ دونوں چیزیں پسند نہیں ہیں۔ وہ سوسائٹی میں زندگی گزارتی تھی۔ مجھے گھر کے اندر گزارنا ہے اسے نہ عیب چھپانا آتا تھا نہ جسم میں دونوں کو چھپانا چاہتی ہوں تم اگر ان سب باتوں کے باوجود مجھے ساتھ لے جانا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ واپس چلے جاؤ اپنی اور میری زندگی تباہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

وہ باری باری اپنے سارے مہرے آگے بڑھاتی گئی تھی۔

"مجھے تمہاری کسی بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف تم میرے ساتھ چلو۔"

اس نے سمان کو کہتے سنا تھا اور وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سمان نے ایک انگلش کیسٹ لگا دی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ فلک نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ ایک انسان سے محبت ہو جائے تو پھر اس کے بعد بندے کے دل میں کچھ اور نہیں آ سکتا اور اگر اللہ سے محبت ہو جائے تو پھر انسان کسی اور سے محبت کرنے کے قابل رہتا ہے؟ وہ بھی کسی انسان سے؟ وجود سے؟ ذات کی چاہ کے بعد وجود کی طلب ختم ہو جاتی ہے اور میرے ساتھ بیٹھا ہوا یہ شخص یہ بات کبھی نہیں جان سکتا کہ اب میرے لئے اس کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہو گیا ہے۔

میں نے ذات کو چاہا تھا۔ ذات کے بعد وجود کا کوئی رنگ آنکھوں کو بھاتا ہے نہ دل کو قید کرتا ہے۔

اس شخص کو گمان ہے سب کچھ پھر پہلے کی طرح ہو جائے گا۔

اللہ کے آنے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پہلے میں اس کے ساتھ زندگی جیتی تھی۔ اب زندگی بسر کروں گی اور یہ شخص ساری عمر اس خوش فہمی میں رہے گا کہ پہلے کی طرح اب بھی میرے لئے یہی سب سے اہم ہے۔ مگر اسے کیا پتا، میں نے دروازے کو ست رو کے نہیں دیا کم از کم ایک عورت کا تو۔"

وہ گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

جدائی۔

بے بسی۔ تنہائی۔

آنسو۔

کسی کی آس۔

خواہش

عشق کا حاصل
یہ سب کیا ہے؟
جنوں کے راستے اور
بے نشاں منزل۔

سلمان، نصراب گانے کی دھن کے ساتھ ساتھ سیٹی بجا رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر سڑک کو دیکھتے ہوئے فلک کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگنے لگا تھا۔

✱

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening ,or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or

send message at
0336-5557121

کوئی لمحہ خواب نہیں ہوتا

"میں وہاں دوبارہ کبھی نہیں جاؤں گی کبھی نہیں۔" اسے یاد آیا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے اس گھر سے جانے کے بعد اس نے خود سے وعدہ کیا تھا اور اب اس نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ گاڑی گیٹ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

"تو تمہیں آخر کار یاد آ ہی گئی ہے ہماری۔ دو فون کیے تھے اور تم پھر بھی تب آئی جب پاپا لینے گئے ہیں۔"

فری نے اسے دیکھتے ہی گلے لگا لیا تھا اور پھر شکوے شروع کر دیے تھے۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ کندھے پر جھولتے ہوئے سیاہ سلکی بال اب قدرے لمبے ہو گئے تھے۔

مومی دھیرے سے مسکرائی تھی۔ فری اب اس کی بہنوں اور امی سے ملنے لگی تھی۔ مایوں کے کپڑوں میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ اسے ساتھ لے کر وہ اوپر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرہ اس کی دوستوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے مومی کا تعارف کروایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ثمین بھی آ گئی تھی وہ بھی اس سے گلے ملی تھی۔ فری کی دوستیں ڈھولک بجانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ گھر میں مہمانوں کی چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ شام سات بجے نیچے ہال میں آ گئے تھے۔ ڈھولک بجنی شروع ہو گئی تھی۔ وہ کافی دیر تک تالیاں بجاتی رہی پھر وہ تھک گئی تھی تو اٹھ کر باہر لان میں آ گئی۔ لان میں موجود لائٹس آن تھیں کچھ لوگ وہاں بھی موجود تھے مگر وہاں اندر جیسا شور نہیں تھا۔ اسے سکون محسوس ہوا تھا۔

ڈیڑھ سال پہلے جب اس نے یہاں ایک سال گزارا تھا تب بھی وہ اسی طرح اکثر لان میں آ کر بیٹھا کرتی تھی خاموشی میں تنہائی میں۔ ہر چیز پہلے ہی کی طرح تھی۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ لان میں موجود پھولوں اور پودوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ درخت پہلے سے کچھ بڑے ہو گئے تھے۔ ہاں اور بیلیں بھی تو زیادہ پھیل گئی ہیں اس نے عمارت کے اوپر چڑھتی ہوئی بیلوں کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ پھر اس نے دائیں جانب والی عمارت پر نظر دوڑائی اور بہت دیر تک وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ ہاں یہ بھی ویسی ہی ہے جیسی ہمیشہ نظر آتی تھی۔ اس عمارت میں بھی لائٹس آن تھیں اور چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

"واقعی سب کچھ ویسا ہی تو ہے۔ بدلا کیا ہے اور میں کس چیز کو بدلا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔"

وہ ایک نسبتاً تاریک کونے میں آ کر بیٹھ گئی۔ یہاں سے جانے کے بعد پچھلے ڈیڑھ سال میں اس نے دن میں کئی بار اس جگہ کو یاد کیا تھا۔ اس جگہ کا ایک نقش بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی بھی آنکھیں بند کر کے بتا سکتی تھی کہ کس جگہ پر کون سی چیز موجود ہے۔

فری نے تین ہفتے پہلے فون کر کے اسے اپنی شادی کی تاریخ طے ہونے کی اطلاع دینے کے ساتھ آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے چند دنوں بعد اس نے ایک بار پھر فون کیا تھا۔ مگر وہ پھر بہانہ بنا کر ٹال گئی تھی مگر صبح تایا کے جانے کے بعد اس کے پاس کوئی بہانہ نہیں رہا تھا۔ وہ آنا نہیں

چاہتی تھی مگر امی اور باقی بہنیں آنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں اور پھر وہ کسی صورت گھر پر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ لوگ تایا کے ساتھ ہی آ گئے تھے اور اب وہ یہاں بیٹھی ہوئی تھی اپنے اس عہد کے باوجود۔

رات دیر تک سب لوگ ڈھولک بجاتے رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ سارے مہمان رخصت ہو گئے وہ بھی اوپر آ کر سو گئی تھی۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر نیچے آ گئی تھی۔ لاؤنج میں نبیلہ آنٹی بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ انہیں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ وہ امی اور تائی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ واپس اوپر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ مگر انہوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔

”آؤ موی! کیسی ہو؟ میں ابھی تمہاری امی سے تمہارا ہی پوچھ رہی تھی۔“ ان کے لہجے میں وہی نرمی تھی۔

وہ ان کے پاس چلی آئی۔ انہوں نے اسے گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جب فراز اندر آیا تھا۔

”ولید کا کیا بنا، اسے سیٹ مل گئی؟“ اس نے آتے ہی نبیلہ آنٹی سے پوچھا تھا۔

موی کا دل ایک دم جیسے ٹھہر گیا۔ ”نہیں سیٹ کہاں ملی ہے کہہ رہا ہے اب پرسوں آؤں گا۔ صبح فون آیا تھا، اچھی بھلی اس نے بکنگ کروائی ہوئی تھی ایک ہفتے پہلے کی فلائٹ میں، مگر تمہارے ماموں نے کسی کانٹیکٹ سے ملنے کے لیے کینیڈا بھجوا دیا ورنہ وہ کئی دن پہلے آ جاتا۔ اب میں تو دعا کر رہی ہوں کہ کم از کم پرسوں والی فلائٹ کو کچھ نہ ہو۔“ انہوں نے فراز سے کہا تھا۔

”تو وہ یہاں نہیں ہے، اچھا ہے وہ نہ ہی آئے، اس کی فلائٹ مس ہو جائے یا اس کی سیٹ کینسل ہو جائے۔ کاش میرا دوبارہ اس سے سامنا نہ ہو۔“ اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری تھی، وہ وہاں سے اٹھ گئی۔

وہ دو دن اس نے بڑے سکون سے گزارے۔ اس کا سامنا کرنے کا خوف اس کے دل سے ختم ہو گیا تھا۔ تیسرے دن صبح نو بجے وہ ناشتہ کرنے کے بعد کچن سے چائے کا کپ لے کر نکل رہی تھی۔ جب لاؤنج میں سے آنے والی ایک آواز نے اس کے قدموں کو روک دیا تھا۔ وہ کچن کے دروازے سے واپس کچن میں آ گئی تھی۔

”فلائٹ کچھ لیٹ ہو گئی تھی۔ اس لیے سات بجے یہاں پہنچا۔ ناشتہ کرنے کے بعد سویا نہیں، سیدھا یہیں آیا ہوں۔“

پورے ڈیڑھ سال بعد اس نے وہ آواز سنی تھی اور اس نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ اب قدرے آہستہ آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔ پہلے کی طرح بلند اور تیز تیز نہیں بول رہا تھا۔ اس نے چائے کا مگ ٹیبل پر رکھ دیا مگ سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو اس نے ہاتھ سے محسوس کرنے کی کوشش کی تھی۔ لاؤنج میں سے آنے والی آوازیں اب کم ہو گئی تھیں شاید وہ اوپر گیا تھا۔ فری اور ثمین سے ملنے وہ کرسی کھینچ کر خاموشی سے بیٹھ گئی مہندی والی شام فری اور ثمین کی دوستوں اور کزنز کے ساتھ وہ بھی مہندی کی پلیٹ ہاتھ میں لیے نبیلہ آنٹی کے گھر داخل ہو رہی تھی۔ جب پورچ میں عثمان اور کچھ دوسرے لڑکوں کے ساتھ سفید شلوار قمیص میں ملبوس ولید کو اس نے دیکھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے عثمان سے باتیں کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ان لوگوں پر نظر دوڑا رہا تھا۔ اس نے ابھی اسے نہیں دیکھا تھا، وہ باقی لڑکیوں سے پیچھے تھی حواس باختگی کے عالم میں اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”تم کچھ دیر کے لیے میری پلیٹ پکڑ لو، میں ابھی آتی ہوں۔“

اس نے اپنے ساتھ چلتی ہوئی ایک لڑکی سے کہا اور پھر واپس چلی گئی۔ واپس فری کے گھر آ کر وہ لان میں گئی اور دونوں گھروں کے درمیان باؤنڈری وال میں موجود چھوٹے سے لکڑی کے دروازے کا کنڈا اتار کر وہ نبیلہ آنٹی کے لان میں داخل ہو گئی۔ سامنے جانے کے بجائے وہ گھر کی عقبی سمت گئی اور پھر کچن کا عقبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ کچن میں چند ملازم موجود تھے انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ مگر کچھ کہا نہیں تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر ہال کی طرف آ گئی تھی۔ ہال سے ڈھولک اور گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے ہال میں داخل ہونے سے پہلے دروازے میں رک کر ایک نظر اندر ڈالی تھی۔ ہال میں موجود لڑکوں میں وہ نہیں تھا۔ وہ اطمینان کی سانس لے کر اندر داخل ہو گئی۔ ثمین نے اسے دیکھتے ہی اشارہ کیا تھا۔ وہ اس کے پاس چلی گئی۔ "تم کہاں چلی گئی تھی۔ میں تمہیں ہی تلاش کر رہی تھی۔"

"مجھے ایک کام یاد آ گیا تھا میں گھر گئی تھی۔" ثمین نے کام کی نوعیت نہیں پوچھی تھی وہ بھی سب لڑکیوں کے ساتھ تالیاں بجانے لگی۔

"لڑکے کے بھائیوں کو بلاؤ۔ وہ کہاں فرار ہو گئے ہیں۔" فری کی ایک دوست نے ایک گانا شروع کرنے سے پہلے کہا تھا۔ وہ تالیاں بجاتے بجاتے رک گئی۔ وہ ایک بار پھر حواس باختہ ہو گئی تھی۔ پھر کوئی عثمان اور وحید کو اندر بلا لایا۔ ان کے اندر آتے ہی سیٹیوں اور نعروں سے ان کا استقبال ہوا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ لڑکیوں نے ایک بار پھر گیت گانے شروع کر دیے تھے۔ وہ باری باری لڑکے کے پورے خاندان کی مٹی پلید کر رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے تالیاں بجاتی رہی تھی۔ اس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کہاں کھڑا تھا اور اس نے اسے دیکھا تھا یا نہیں آدھ گھنٹہ تک گانے گانے کے بعد کھانا کھانے کا اعلان ہوا۔ آہستہ آہستہ سب ہال سے نکلنے لگے تھے۔ پچھلے لان میں باربی کیو کا انتظام تھا اور اب باہر سے اسٹیریو پر گانوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"موئی اور واصف بھائی کا کمرہ دیکھنے چلتے ہیں۔" عثمان کہہ رہا تھا۔ کچھ فلورل اریجمنٹس کروائی ہیں۔ دیکھتے ہیں کیسا ہے کمرہ۔" ثمین نے اچانک اس کے کان میں کہا تھا اس نے سر ہلا دیا۔

"سائرہ! تم بھی چلو گی؟" اس نے اپنی خالہ کی بیٹی سے پوچھا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں"

"تو بس ٹھیک ہے، چلو خاموشی سے چلتے ہیں۔ پتا چل گیا تو سب پہنچ جائیں گے وہاں۔" ثمین نے اٹھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ وہ ان کے ساتھ چل پڑی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ثمین کو یاد آیا۔

"کمرہ تو لاکڈ ہوگا۔ موئی تم ٹھہرو۔ میں اور سائرہ واصف بھائی سے چابی لے کر آتے ہیں۔"

ثمین سائرہ کو لے کر واپس اتر گئی۔ وہ اوپر چڑھنے لگی۔ واصف کے کمرے کے دروازے تک پہنچنے کے بعد اس نے غیر محسوس طور پر ناب گھمائی۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔

"ثمین فضول میں ہی نیچے گئی۔" اس نے سوچا۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہو گئی اسے حیرانی کا جھٹکا لگا تھا۔ کمرہ ویل ڈیکوریٹڈ تھا۔ مگر وہاں کوئی فلورل اریجمنٹ نہیں تھی۔ اس نے کندھے جھٹکے تھے۔ وہ کسی طور پر بھی شادی والا کمرہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ثمین کا انتظار کرنے لگی۔ پھر وہ اسٹڈی

کے دروازے تک آئی تھی اور اس نے اسٹڈی کا دروازہ کھول دیا۔ سب کچھ بالکل پہلے ہی کی طرح تھا۔ کتابیں اسٹڈی ٹیبل اور اس پر موجود کمپیوٹر مگر اب وہاں پڑی ہوئی چیزوں میں پہلے جیسی بے ترتیبی نہیں تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر دروازہ بند کر دیا۔ ثمین ابھی تک نہیں آئی تھی اسے کچھ بے چینی ہونے لگی تھی۔

تب ہی اچانک کوئی دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ وہ ساکت ہو گئی۔ وہ ولید تھا اس کے پیچھے اس کا کوئی دوست تھا۔ اس نے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی سی محسوس کی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر اس پر نظریں جمائے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے ہوا تھا۔

"یہ واصف کا کمرہ نہیں ہے۔" بہت سرد آواز میں اس سے کہا گیا تھا وہ سن ہو گئی تھی۔

"یہ واصف بھائی کا کمرہ ہے۔" اس نے اپنی بات پہ زور دینے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں یہ واصف کا نہیں میرا کمرہ ہے۔" اس بار اسے اپنے پیروں تلے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی تھی۔

"مگر یہ اسٹڈی تو۔" اس نے بے یقینی سے ہاتھ سے اسٹڈی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"یہ میری اسٹڈی ہے۔ واصف کا کمرہ اگلے کمرے کے ساتھ ہے۔" اس نے ایک نظر اسٹڈی کے دروازے پر ڈالی اور پھر سر جھکا کر غیر متوازن قدموں سے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ولید نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ چند لمحے باہر دروازے کو دیکھتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا ثمین اور سائرہ اندر کھڑی تھیں۔

"تم کہاں تھیں؟ کب سے انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔ ذرا دیکھو اچھا ڈیکوریٹ کیا گیا ہے۔"

اس نے موحی پر نظر پڑتے ہی کہا تھا۔ وہ کہیں اور پہنچی ہوئی تھی اسے یاد تھا، وہ ہمیشہ اسی اسٹڈی میں جایا کرتی تھی جہاں وہ کچھ دیر پہلے گئی۔ مگر واصف کا کمرہ اور اسٹڈی یہ تھے وہ کمرے میں کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہی تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ثمین اور سائرہ کمرے میں چل پھر رہی تھیں۔

"چلو اب نیچے چلتے ہیں۔" ثمین نے کچھ دیر بعد کہا۔

"ابھی کھانا بھی کھانا ہے اور تم ایک بات یاد رکھو خبردار تم لوگوں نے اب کوئی گانا ولید کے خلاف گایا یا کسی میں اس کا ذکر کیا۔ میں نے پہلے برداشت کر لیا اب نہیں کروں گی۔ عثمان کو بے شک گھسیٹو مگر ولید کو کچھ مت کہنا۔"

دروازے سے نکلتے ہوئے ثمین نے سائرہ سے کہا تھا۔ اس نے جواباً قہقہہ لگایا۔ "بڑی پرواہ ہے اپنے منگیتر کی۔ تم یوں بات کر رہی ہو جیسے ہمارا تو کوئی رشتہ ہی نہیں رہ گیا۔ اس سے تمہاری نسبت طے ہونے کے بعد۔" وہ ان دونوں کے پیچھے چل رہی تھی، ایک دھچکے سے وہ ٹھٹک گئی تھی آج انکشافات کا دن تھا۔

"ثمین اور ولید۔" اس نے زیر لب کہا تھا۔

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے، وہ تو؟" ثمین اور سائرہ سیڑھیاں اتر گئی تھیں۔ وہ ان سے پیچھے رہ گئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تھکے تھکے قدموں سے وہ سیڑھیاں اتر گئی۔

◆

"یار تمہیں پتا نہیں ممی کتنی پابندیاں لگاتی ہیں اور کیسی کیسی پابندیاں لگاتی ہیں۔ بعض دفعہ مجھے لگتا ہے، میں لڑکا نہیں لڑکی ہوں۔ سوتیلا ہونا بھی بڑا عذاب ہے۔ سوتیلے ہونے سے بندہ مجرم بن جاتا ہے۔" اندر سے آتی ہوئی آواز نے اس کے قدم روک دیئے۔

"ہر وقت ہدایات دیتی رہتی ہیں۔ یہ کرو یہ نہ کرو، یہاں جاؤ وہاں مت جاؤ، ہر بات میں نکتہ چینی کرتی رہتی ہیں۔ باقی دو میں انہیں کوئی خامی نظر نہیں آتی اور مجھ میں بھولے سے بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں اس زندگی سے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ جو کوئی بھی تھا۔ مسلسل بول رہا تھا اس نے پیر سے دروازے پر ہلکی سی ٹھوکر لگائی پھر اس عمل کو دو تین بار دہرایا۔ اندر یک دم خاموشی چھا گئی۔

"یہ تمہارے گھر میں دستک دے کر اندر آنے والا کون پیدا ہو گیا ہے؟" ٹرے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوتے اس نے پھر وہی حیرت بھری آواز سنی تھی۔ سر اٹھا کر اس نے پہلی بار بولنے والے کو دیکھا۔ بلیک جینز اور شرٹ میں ملبوس وہ جوگرز سمیت صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا فراز گلے میں تولیہ لٹکائے واش روم سے نکلا۔

"آؤ یہ چائے ٹیبل پر رکھ دو ولید! یہ مومنہ ہے۔ بدر چچا کی بڑی بیٹی یہاں رہنے کے لیے آئی ہوئی ہے اور مومی! یہ ولید ہے ارمغان ماموں کا بیٹا ہے۔ یہ ساتھ والا گھر ان ہی کا ہے یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ یہ جب بھی یہاں آئے چائے لے آیا کرو پوچھے بغیر کیونکہ یہ چائے پیئے بغیر نہیں جاتا اور بہت مائنڈ کرتا ہے اگر اس سے چائے پانی کا نہ پوچھا جائے کیونکہ اس کا خیال ہے۔ مسلمان وہ ہے جو دوسرے مسلمان کو دیکھتے ہی جو کچھ اس کے گھر میں ہے، لا کر رکھ دے اور مجھے تو یہ مسلمان بھی نہیں مومن سمجھتا ہے اور اس کے بقول مومن کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔"

فراز تیزی سے اس کا تعارف کروا کر چہرے پر آفٹر شیو لوشن لگاتا ہوا دوبارہ واش روم میں گھس گیا۔ وہ کچھ ہونق سی بنی وہیں کھڑی رہی اسے اس قسم کے تعارف کی امید نہیں تھی۔

"پلیز یہ ٹرے تو رکھ دیں۔ مجھے صبح سے کسی نے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا۔ بہت بھوک لگی ہوئی ہے مجھے۔"

وہ اس کے جملے پر چونکی تھی اور اس نے ٹرے ٹیبل پر اس کے سامنے رکھ دی۔ کمرے میں آنے سے پہلے وہ اس کو جس بے چارگی کی حالت میں دیکھنے کی متوقع تھی وہ ویسا نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر کہیں اس بے چارگی کا ظہور نہیں ہو رہا تھا۔ جیسا اس کی آواز سے ہو رہا تھا۔ اس کی شرٹ پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کے جاگرز بھی خاصی بوسیدہ حالت میں تھے اس نے چند لمحوں میں اس کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ اب ناشتہ کرنے میں مصروف تھا۔ مومی دبے قدموں کمرے سے باہر آ گئی۔ اس کا ذہن مسلسل ولید میں الجھا ہوا تھا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ چھٹی کے دن کوئی بھی اتنی جلدی نہیں اٹھتا تھا۔ عام دنوں میں بھی وہاں آٹھ ساڑھے آٹھ سے پہلے کوئی بیدار نہیں ہوتا تھا۔ صرف وہ تھی جو یہاں آنے کے بعد صبح فجر کی نماز پڑھنے کے بعد بلا مقصد گھر میں پھرتی رہتی۔ آج بھی وہ اسی طرح لاؤنج میں آ کر بیٹھی ہوئی تھی جب فراز وہاں آیا تھا۔

"مومی ادھر آؤ، دو آدمیوں کے لیے ناشتہ تو بنا دو۔ مجھے میچ کھیلنے جانا ہے۔ پلیز جلدی کرنا اور میرے کمرے میں دے جانا۔" وہ ہدایت دیتا ہوا تیزی سے غائب ہو گیا تھا۔

وہ پہلے تو اسے اتنی صبح دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔ وہ عام طور پر آفس جانے سے صرف پندرہ منٹ پہلے اٹھتا تھا اور آج وہ صبح سویرے ہی باہر لان کا ایک چکر لگا آیا تھا۔ تب اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ اس کے کمرے میں کوئی اور بھی ہے لیکن شاید وہ صبح اسے لینے کے لیے باہر نکلا تھا۔ اسے یاد آیا تھا۔ گھر کے ارد گرد پھیلا ہوا وسیع لان تایا کے بھائی کے لان سے متصل تھا۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی دیوار تھی اور اس دیوار میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دونوں گھروں میں زیادہ آنا جانا اسی دروازے سے ہوتا تھا کیونکہ بیرونی گیٹ سے جانے میں زیادہ وقت لگتا تھا۔ تایا کو اس گھر میں شفٹ ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا اور جب سے وہ یہاں منتقل ہوئے تھے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر فراز کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کا وہاں کافی آنا جانا تھا۔ وہ قدرے حیران ہو کر ناشتہ بناتی رہی۔

"دو آدمیوں کے لیے ناشتہ؟ کیا فراز بھائی دو آدمیوں کا ناشتہ کر کے میچ کھیلنے جائیں گے؟"

ناشتہ بناتے ہوئے اس کا ذہن اسی سوال میں اٹکا رہا۔ مگر کمرے سے آتی ہوئی آواز سن کر اس کی یہ حیرانی دور ہو گئی تھی۔

"تو فراز بھائی کے کوئی دوست آئے ہیں۔" اس نے سوچا۔ "پتا نہیں مجھے ان کے سامنے جانا چاہیے یا نہیں مگر فراز بھائی نے کہا تھا کہ میں کمرے میں آ جاؤں۔" اسے یاد آیا۔

اسے یہاں آئے دو دن ہوئے تھے اور وہ تایا کے گھر کا ماحول دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ان کے مقابلے میں تایا کا گھرانا بہت آزاد خیال تھا۔ دو دن سے وہ کئی لوگوں کو یہاں آتے جاتے دیکھ رہی تھی اور ہر ایک اسی طرح یہاں آتا تھا جیسے وہ بہت عرصے سے وہاں آ رہا ہو۔ اسے کچھ الجھن ہو رہی تھی مگر وہ جانتی تھی اسے اب وہیں رہنا تھا اور الجھن وہ سب کچھ ذہن سے جھٹک دینا چاہتی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آنے کے بعد دوبارہ لاؤنج میں آ گئی۔

"مجھے صبح سے کسی نے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔" ایک آواز اس کے کانوں میں دوبارہ ابھری۔ اس کا دل ایک دم جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔

"سوتیلے ہونے سے مر جانا زیادہ بہتر ہے۔" کسی نے پھر کہا تھا۔ اسے یاد آیا جب وہ اپنے ننھیال سے پہلی بار اپنے گھر آئی تھی تو کئی دنوں تک وہ بھی سہمے، ندرا اتنی ہمت پیدا نہیں کر پائی تھی کہ ممی سے کھانے کے لیے کچھ مانگ سکے۔ وہ کھانے کے وقت بھی خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھی امی کے بلانے کا انتظار کرتی رہتی اور بعض دفعہ وہ انتظار ہی کرتی رہ جاتی۔ امی کو اسے بلانا یاد ہی نہیں رہتا تھا یا پھر شاید اور جب اسے کھانے کی ٹیبل پر بلایا بھی جاتا تھا تو وہ وہاں بہت سہمی ہوئی بہت محتاط رہتی جو امی اس کی پلیٹ میں ڈال دیتیں، وہ اسی سے پیٹ بھر لیتی۔ دوبارہ کوئی چیز مانگنے کا حوصلہ اس میں نہیں ہوتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی جھجک ختم ہونے لگی تھی۔ وہ بھوک لگنے پر امی سے کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ مانگ لیا کرتی تھی۔ امی کچھ کہے بغیر ایک خاموش نظر کے ساتھ اس کی ضرورت پوری کر دیا کرتی تھیں سو اس کو وہ خاموش نظر کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ پھر جب بڑی ہوتی گئی تو کھانا پکانے اور سرو کرنے کی ذمہ داری خود بخود ہی اس کے کندھوں پر آ گئی۔ تب بھی وہ منتظر ہی رہتی تھی کہ کبھی امی اسے اپنے دوسرے بچوں کی طرح اصرار کر کے کھانا کھلائیں اس سے کہیں کہ وہ فلاں چیز بھی کھائے کیونکہ یہ اس کے لیے بچا ہو گا مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا تھا۔ امی کے پاس اس

کے لیے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی تھی یا پھر شاید۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے کھانے کے بارے میں لاپرواہ ہوتی گئی تھی۔ کیا کھاتا ہے، کس وقت کھاتا ہے؟ اس کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ یہ سوچنے کی ضرورت ہی کبھی نہیں پڑی اور آج جب ولید نے یہ سب کہا تھا تو اسے بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ اسے اس سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

"فراز بھائی نے کہا تھا کہ وہ ارمغان ماموں کا بیٹا ہے تو کیا اس کی ممی کی بھی ڈیتھ ہو چکی ہے اور اگر ممی کی ڈیتھ نہیں ہوئی تو پھر وہ یہاں کیوں ہے اپنی امی کے پاس کیوں نہیں چلا جاتا۔ اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے یہاں اپنی سوتیلی امی کے پاس رہ کر، وہ تو مرد ہے۔ وہ تو مجبور نہیں ہے پھر وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا کیوں نہیں جاتا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کیوں رہ رہا ہے؟"

اس کے ذہن میں بار بار سوال آ رہے تھے اور ان سوالوں کے ساتھ ولید کے ابو اور امی کی ہولناک شکلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اچانک اس کی نظر وال کلاک پر پڑی اس وقت چھ بج رہے تھے۔

"مجھے صبح سے کسی نے کچھ کھانے کے لیے نہیں دیا بہت بھوک لگی ہے مجھے۔" اسے ایک بار پھر اس کی بات یاد آئی تھی۔

"صبح سے مگر وہ تو شاید یہاں ساڑھے پانچ بجے آ گیا تھا پھر صبح سے کسی نے۔" وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ بہت دیر تک وہ وہیں لاؤنج میں بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

* * *

شام کو وہ فری کے ساتھ لان میں بیٹھی ہوئی تھی جب وہ فراز بھائی کے ساتھ آیا تھا۔ فری کو لان میں دیکھ کر وہ سیدھا وہیں آ گئے تھے۔

"یہاں تو عیش ہو رہے ہیں بھئی۔ چائے چل رہی ہے۔" فراز نے پاس آتے ہی کہا تھا۔

"آپ بھی عیش کریں۔ میں دو کپ اور منگوا لیتی ہوں۔" فری نے پودوں کو پانی دیتے ہوئے ملازم کو بلایا تھا۔

"کیا بنا آپ کے میچ کا؟ آج تو صبح ہی چلے گئے تھے۔" ملازم کے جانے کے بعد فری نے پوچھا تھا۔

"کیا بننا تھا۔ بھئی پچھلی دفعہ وہ جیت گئے تھے، اس دفعہ ہم ہار گئے۔" ولید نے پلیٹ سے بسکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور پھر بھی تم لوگ ہر ہفتہ میچ کھیلنے جاتے ہو۔" فری نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

"ویسے بھی ہم جیتنے تھوڑی جاتے ہیں۔ ہم تو کھیلنے کے لیے جاتے ہیں۔ انجوائے منٹ کے لیے۔" اس بار فراز نے کہا تھا۔

"ہاں دوسری ٹیم کی انجوائے منٹ کے لیے کیپ اٹ اپ۔"

فری نے کیوٹکس ایک دفعہ پھر سنبھال لی تھی۔ ملازم نے کپ لا کر ٹیبل پر رکھ دیے۔ موی نے اپنا کپ ٹیبل پر رکھ دیا اور ان دونوں کے لیے چائے بنانے کے لیے کپ اٹھایا تھا، جب فراز نے اسے روک دیا۔

"ڈونٹ بی سو فارمل موی! یہاں یہ سب کچھ نہیں چلتا۔ تم اپنی چائے پیو۔ ہم اپنے خود بنا لیں گے۔" اس نے کچھ جھینپ کر اپنا کپ اٹھا لیا۔

"ہاں، ان لوگوں کو مینرز آتے ہیں نہ ہی اب یہ سیکھنے کے قابل رہے ہیں۔ اب تو جہاں ہیں جیسے ہیں کی بنیاد پر انہیں ٹریٹ کرنا چاہیے۔" فری نے کیوٹکس ناخنوں پر لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"اور تم ولید! تم ذرا اپنا حال دیکھو۔ بڑا شوق ہے تمہیں میچز کھیلنے اور کرکٹر بننے کا اور تمہیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ کٹ میں میچ کھیلنے جایا کرو۔ ایسے ہی چلے جاتے ہو منہ اٹھا کر۔ حلیہ دیکھو ذرا اپنا لگتا ہے باہر کسی سڑک پر جھاڑو دیا کرتے ہو۔" اب فری اسے ڈانٹ رہی تھی۔

موی نے ایک نظر اس پر دوڑائی۔ اس کے کپڑے واقعی گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ بالوں پر بھی، اچھی خاصی دھول نظر آ رہی تھی اور پسینے اور مٹی نے مل کر اس کے چہرے پر بھی ٹھیک ٹھاک میک اپ کر دیا تھا۔ فراز کا حلیہ اس سے بہت بہتر تھا۔ ولید پر فری کے تبصرے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح پرسکون انداز میں چائے اور بسکٹ کھاتا رہا۔

"جس دن میرا پرائز بانڈ نکلے گا، اس دن میں کٹ خرید لوں گا۔ بہرحال مشورہ نوٹ کر لیا ہے۔"

"کٹ خریدنے کے لیے تمہیں کون سے خزانے کی ضرورت ہے۔ مہنگی نہیں تو سستی سہی، چار پانچ ہزار کی تو بات ہے ویسے تو تم۔"

ولید نے ایک چیخ کے ساتھ اس کی بات کاٹی تھی۔

"چار پانچ ہزار اور یہ چار پانچ ہزار آئیں گے کہاں سے؟ تم جانتی ہو، میں ابھی ایک ایک روپے کے لیے ترستا ہوں۔ میرے پاس چار پانچ ہزار ہوں تو میں کٹ کے بجائے ایک اچھا سوٹ نہ لے لوں۔ دو چار سستی شرٹس نہ لے لوں۔ ایک عدد جینز یا ایک اچھا ہیئر برش نہ لے لوں۔ کیسے منہ اٹھا کر کہہ دیا ہے تم نے کہ صرف چار پانچ ہزار کی تو بات ہے۔" اس کی آواز میں موی کو خفگی محسوس ہوئی تھی مگر فری پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"معاف کرو بابا! میں بھول گئی تھی کہ دنیا میں ایک واحد غریب تم ہی تو رہ گئے ہو۔ جس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ بہرحال آنٹی ٹیرس پر کھڑی اشارے کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے۔ تمہیں بلا رہی ہیں۔ صبح سے غائب ہو اب ذرا جا کر وضاحتیں پیش کرو۔"

فری نے بات کرتے کرتے سامنے اشارہ کیا تھا۔ ولید نے فوراً پلٹ کر دیکھا پھر کھڑا ہو گیا موی نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔ ولید کے گھر کے ٹیرس پر ایک عورت کھڑی تھی۔ ولید کو کھڑے ہوتے دیکھ کر وہ وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔

"اب تو بھی اٹھ جا فراز اور میرے ساتھ چل کر اس رسوائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ جو مستقبل کے اسٹار بیٹسمین کو اپنی سوتیلی ماں کے ہاتھوں برداشت کرنی پڑے گی۔" اس نے فراز کو کندھے سے کھینچا تھا۔ موی نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"شرم کرو ولید! تم بات کیسے کرتے ہو؟" فری نے اسے گھورا تھا مگر اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔

"کیوں سچ نہ کہوں کیا۔ کیا رسوا نہیں کرتیں ممی جوتے مارتی ہیں سو الگ۔ اب جاتے ہی لمبے چوڑے سوال ہوں گے۔ کہاں گئے تھے؟ کس سے پوچھ کر گئے تھے؟ اتنی دیر کہاں لگائی؟ واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ نئے دوستوں کے پاس کیوں نہیں رہ گیا جن کے پاس گیا تھا؟ اٹھ فراز! اب میرے ساتھ چل کر ذرا جھوٹ بھی بول، تیری ضد پر ہی صبح کھڑکی کے راستے نکل کر آیا تھا۔ اب تو ساتھ چل کر بتا کہ زندگی کے رہنما اصولوں پر کون سا سیمینار اٹینڈ کر کے آئے ہیں۔"

وہ فراز کو بازو سے کھینچتا ہوا لے گیا تھا۔ فری مسکرا رہی تھی۔ موی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"ان کی امی سوتیلی ہیں؟" اس نے کچھ دیر بعد فری سے پوچھا تھا۔ وہ ایک بار پھر کیوٹیکس لگانے میں مصروف ہو چکی تھی۔

"ان کی؟ اچھا اس ولید کی۔ ہاں اس کی امی سوتیلی ہیں۔" وہ موی کے سوال پر کچھ چونکی تھی پھر اس نے کہا تھا۔

"ڈیتھ ہو گئی ہے ان کی امی کی؟" اس نے آہستہ آواز میں پوچھا تھا۔ "نہیں بھئی ڈیتھ کہاں؟ اصل میں یہ ارمغان ماموں کی دوسری بیوی کا بیٹا ہے۔ اس کی امی کسی بینک میں منیجر تھیں۔ ارمغان ماموں کا کافی آنا جانا تھا وہاں سنا ہے وہ کافی خوبصورت تھیں۔ یہ ولید بھی تو ان ہی کی طرح ہے۔ ماموں کو محبت ہو گئی تھی ان سے۔ پہلے سے شادی شدہ تھے انہوں نے دوسری شادی چھپ کر کی، شروع میں تو نبیلہ آنٹی کو پتا ہی نہیں چلا پھر بعد میں جب پتا چلا تو انہوں نے بڑا ہنگامہ کیا مگر ارمغان ماموں نے دوسری بیوی کو طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ نبیلہ آنٹی کے تب دو بچے تھے۔ ظاہر ہے، وہ گھر چھوڑ کر تو نہیں جا سکتی تھیں۔ اس لئے بے چاری رو دھو کر چپ ہو گئیں۔ تین سال تک ماموں کی دوسری شادی چلتی رہی پھر پتہ نہیں کیا وجہ ہوئی۔ لیکن ان کی دوسری بیوی نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ ماموں نے ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا۔ ولید شروع میں اپنی ماں کے پاس ہی تھا۔ ماموں نے اسے لینے کی کوشش نہیں کی پھر کچھ عرصہ کے بعد اس کی امی نے دوسری شادی کر لی اور ولید کو ماموں کے پاس بھیج دیا تب تین سال کا تھا یہ۔ تب سے اب تک یہیں ہے ماموں کے پاس۔" فری آہستہ آہستہ اسے تفصیل بتاتی گئی۔

"اپنی امی کے پاس نہیں جاتے یہ؟" اسے ولید سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔

"امی کے پاس کیسے جا سکتا ہے۔ وہ تو امریکہ میں ہیں۔ ان کے اپنے بچے ہیں۔ پاکستان تو شاید وہ بہت کم ہی آتی ہیں اور انہوں نے کبھی ولید

سے رابطہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کریں بھی تو ولید تو مشکل سے ہی جائے گا اور وہ اگر جانے پر تیار ہو بھی جائے تو نبیلہ آنٹی تو اسے مار ہی دیں۔ وہ تو کبھی اس کے۔“

”فری بی بی! آپ کا فون آیا ہے۔“ ملازم نے آ کر اسے اطلاع دی تھی۔

”میرا فون۔ اچھا بھئی میں اندر جا رہی ہوں۔“ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر کیوٹکس اٹھا کر اندر چلی گئی تھی۔ وہ گم صم سی وہیں بیٹھی رہی۔

”اور اس کی سوتیلی امی اسے بخشنے پر تیار کیسے ہوں گی؟ اس کی امی کی وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی تباہ ہوتے ہوتے رہ گئی اور ولید کو وہ اس عورت کی نشانی سمجھتی ہوں گی جس نے ان کے شوہر پر ڈورے ڈالے اور ان کا گھر تباہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس میں ولید کا کیا قصور ہے۔ وہ تو بے گناہ ہے وہ تو پہلے سے ہی مظلوم ہے۔ کیا اس کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ وہ اپنی امی سے ملے۔ ان کے پاس رہے مگر اس کی امی اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھتیں۔ کیا اسے اس بات سے تکلیف نہیں ہوتی ہوگی اور اس کی سوتیلی امی یہ باتیں سمجھتی ہی نہیں۔ اسے تنگ کرنے سے کیا ہوگا لوگ ماں باپ کی سزا اولاد کو دینے کی کوشش کیوں کرتے ہیں اور ولید کے ابو، وہ کیوں ان کو ایسی حرکتوں سے نہیں روکتے۔ نبیلہ آنٹی کا نہ سہی مگر ان کا تو وہ سگا بیٹا ہے پھر ان کو اس کی پرواہ کیوں نہیں ہے۔“ وہ سوچنے لگی تھی۔

”اور مجھے لگتا تھا دنیا میں سب کچھ صرف میرے ساتھ ہی ہوا ہے باقی ساری دنیا تو بہت خوش ہے۔“

اس کی امی بھی اس کی پیدائش کے ایک سال بعد ایک حادثے میں وفات پا گئی تھیں۔ اس کے ابو نے امی کی وفات کے آٹھ ماہ بعد دوسری شادی کر لی تھی۔ مومنہ کو نانی نے اپنے پاس ہی رکھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ابو نے بھی دوسری شادی کے بعد اسے لینے پر اصرار نہیں کیا۔ کیونکہ تب وہ بہت چھوٹی تھی اور ان کا خیال تھا کہ مومنہ ننھیال میں ایڈجسٹ ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ نانی کے پاس ہی رہی پھر نانی کی وفات ہو گئی۔ ایک دفعہ پھر ماموؤں کے ساتھ اس کے باپ کی میٹنگ ہوئی تھی اور آخر میں طے پایا تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس چلی جائے کیونکہ اسے مستقل طور پر رکھنے پر کوئی تیار نہیں تھا حالانکہ مومنہ کا خیال تھا کہ اس نے کبھی کسی کو تنگ نہیں کیا وہ ایک بہت بے ضرر سی مخلوق تھی۔ خاموش، فرمانبردار، تعاون کرنے والی۔ پھر بھی اس کے لیے ننھیال میں جگہ نہیں بن پائی۔

”دیکھو، تمہاری امی بہت اچھی ہیں۔ بہت پیار کرنے والی ہیں۔ تم انہیں بالکل تنگ مت کرنا۔ ان کی ہر بات ماننا پھر وہ تم سے بھی بہت پیار کریں گی۔ تم سب سے بڑی ہو۔ اس لیے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم تو بہت سمجھدار ہو نا۔“

اسے ابھی تک یاد تھا پہلی بار ننھیال سے اپنے گھر لے جاتے ہوئے ابو سارا راستہ اسے سمجھاتے رہے تھے کہ اسے گھر میں کس طرح رہنا ہے کس طرح بات کرنا ہے کس طرح چلنا ہے۔ دوسروں کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے۔ وہ ان کی ہر بات پر سر ہلاتی گئی۔ اس کے لئے یہ سب کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس کی تربیت تو ننھیال میں نانی پہلے ہی اسے دے چکی تھیں۔ دس سال وہ ننھیال میں اسی تابعداری اور خاموشی کے ساتھ رہی تھی جس کی تلقین اس کے ابو اسے کر رہے تھے۔ گھر پہنچنے پر گاڑی سے اترنے کے بعد ابو نے اس کا ہاتھ اور بیگ پکڑا تھا اور پھر اندر گئے تھے۔ وہاں پہلی بار اس نے اپنی ماں سے ملاقات کی تھی۔

"یہ مومنہ ہے ثمینہ! امی کو سلام کرو مومی۔" اس کے ابو نے ایک عورت سے اس کا تعارف کروایا تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں سلام کیا تھا۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس عورت کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اس نے مومنہ کے سر پر ہاتھ پھیر تھا۔

"ہاں! آپ کپڑے چینج کر لیں۔ میں چائے لاتی ہوں۔"

وہ عورت پھر فوراً اس کے ابو کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ اس کے ابو نے اس کا بیگ وہیں رکھ دیا اور پھر خود ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اس کی امی بھی ان کے پیچھے چلی گئی تھیں۔ مومنہ خاموشی سے اپنے بیگ کو پکڑ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی امی چند منٹ بعد دوبارہ نمودار ہوئی تھیں اور ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے ایک دوسرے کمرے میں غائب ہو گئی تھیں۔ مومنہ کو بعد میں پتا چلا کہ وہ کچن ہے۔ پندرہ منٹ بعد اس کے ابو دوبارہ آئے تھے۔

"آؤ تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں مومنہ۔"

انہوں نے ایک بار پھر بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ پھر وہ اسے ایک کمرے میں لائے تھے جہاں پہلے ہی دو بستر لگے ہوئے تھے۔

"یہاں تمہاری بہنیں رہتی ہیں۔ تم بھی یہیں رہو گی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد تمہاری امی تمہارا بستر بھی یہاں لگا دیں گی۔"

انہوں نے اس کا بیگ ایک کونے میں رکھتے ہوئے کہا۔ اس رات وہ سو نہیں پائی تھی۔ اسے ہمیشہ سے نانی کے ساتھ سونے کی عادت تھی۔ نانی کی وفات کے بعد وہ بڑے ماموں کی بیٹیوں کے پاس سوتی رہی تھی اور اب یہاں وہ خود کو بالکل اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ اس کی دونوں بہنیں اس کے پاس نہیں آ رہی تھیں نہ ہی اس سے بات کرتی تھیں اور مومنہ کے لیے کسی سے خود بات کرنا تو ہمیشہ سے ہی مشکل تھا اور پھر یہ صرف اس رات پر منحصر نہیں تھا، اگلے بارہ سال بھی وہ اس گھر میں اسی طرح گم صم رہی تھی۔

وہ کبھی بھی اس گھر کو اپنا گھر نہیں سمجھ سکی تھی۔ وہ بار بار اپنے ننھیال جانا چاہتی تھی۔ مگر وہاں بھی چند دن رہنے کے بعد واپس آ جاتی اور پھر اگلے کئی ہفتے اپنے گرد و پیش سے بے خبر رہتی۔ اس نے ابو کو اپنے رویے سے کوئی شکایت نہیں ہونے دی تھی۔ وہ وہاں بالکل ویسے ہی رہتی تھی جیسے وہ چاہتے تھے۔ فرمانبردار، خاموش اور تعاون کرنے والی لیکن جو فاصلہ اس نے پہلے ہی دن اپنے اور امی کے درمیان محسوس کیا تھا، وہ کبھی کم نہیں ہو سکا تھا۔ امی بہت ریزرو رہتی تھیں اور اس کے سامنے تو وہ اور بھی سنجیدہ اور لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی یہ خاموشی درمیان والی دیوار کو اور اونچا کرتی گئی تھی۔

◆

"یار! دے دو کچھ روپے۔ تم جانتے نہیں، مجھے ان کی کتنی ضرورت ہے۔" وہ اب مبشر سے کہہ رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں، تمہیں کس لیے ضرورت ہے۔ اسی لیے تو نہیں دے رہا۔" مبشر ہنوز اسے نظر انداز کرنے میں مصروف تھا۔

"یار! میں واپس کر دوں گا۔" اس نے اب دوسرا حربہ استعمال کیا تھا۔

''آج تک کبھی واپس کیے ہیں؟''

''نہیں مگر اس بار ضرور کروں گا تم دیکھ لینا اگر واپس نہ کیے تو آئندہ مت دینا۔''

وہ اب التجاؤں میں مصروف تھا۔

''میں دیکھ دیکھ کر تنگ آ چکا ہوں۔ اس لیے میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ تم کوئی اور در کھٹکھٹاؤ۔''

مبشر پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ سوی نے اسے دیکھا وہ بے حد مایوس نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی وہاں آیا تھا اور آتے ہی وہ فراز سے کچھ روپے مانگنے لگا۔ مگر فراز نے صاف انکار کر دیا تھا اور اب وہ باری باری سب سے مدد طلب کر رہا تھا مگر سب اسے نظر انداز کیے ہوئے وی سی آر پر [illegible] دیکھنے میں مصروف تھے۔

''دیکھ فراز! دے دے دو ہزار ہی کی تو بات ہے تو لے لینا۔ یار! دیکھ تجھے دوستی کا بھی احساس نہیں۔'' وہ ایک بار پھر فراز سے مخاطب تھا۔

''دوستی کا احساس ہے اسی لیے تو نہیں دے رہا۔ تو نے سنا نہیں کہ دوستی میں روپے پیسے کو نہیں آنا چاہیے۔ ورنہ ویسے بھی مہینے کے آخری دن ہیں۔ میں خود کھینچ تان کر گزارا کر رہا ہوں۔ تمہیں کیسے دے دوں۔ تم پر ویسے بھی میرا بہت سا قرض ڈیو ہے اگر کہو تو یاد کرا دوں۔'' فراز نے اپنی جیب سے پاکٹ ڈائری نکال لی تھی۔

''رہنے دے اگر تو کچھ دے نہیں سکتا تو لینے کی بات بھی نہ کر۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا تھا۔

''لے کون رہا ہے میں تو پناہ ہی مانگ رہا ہوں۔''

''فری! تم ہی دے دو کچھ۔'' اس نے فراز کی بات مکمل طور پر ان سنی کر دی تھی۔ اب وہ فری سے مخاطب تھا۔

''دیکھو ولید! مجھ سے مانگتے ہوئے تمہیں ویسے ہی شرم آنی چاہیے۔ میں زیادہ سے زیادہ تمہیں وہ کیک دے سکتی ہوں جو میں نے دوپہر کو بنایا تھا۔ اس کے علاوہ مجھ سے کچھ امید مت رکھو۔ تمہیں زیادہ ضرورت ہے تو نبیلہ آنٹی سے مانگو یا پھر ماموں سے کہو۔ اب وہ ایسے بھی نہیں ہیں کہ تمہاری ضرورت پوری نہ کریں۔''

فری ایزی چیئر پر جھولتی ہوئی اس سے کہہ رہی تھی۔

''ممی سے کیسے مانگوں = وہ تو پاکٹ منی بڑی مشکل سے دیتی ہیں ان کا بس چلے تو وہ اسے بھی بند کر دیں اور پاپا وہ تو بات ہی نہیں سنتے اور اگر سنیں گے تو جوتا پہلے اتاریں گے۔ مدد کا بعد میں سوچیں گے اگر مجھے گھر والوں سے مدد کی توقع ہوتی تو میں تم لوگوں کے آگے ہاتھ کیوں پھیلاتا۔''

وہ اب بالکل بے بس نظر آ رہا تھا۔

''تم اپنے اخراجات پر قابو کیوں نہیں پاتے۔ جتنی پاکٹ منی تمہیں ملتی ہے، وہ بھی خاصی ہوتی ہے بلکہ چاہو تو بچا بھی سکتے ہو۔'' ثمین نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔

''تمہیں کیا پتا کہ میں کس طرح اپنے اخراجات پورے کرتا ہوں۔ یونیورسٹی کے اخراجات ہوتے ہیں اور کئی قسم کی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ یہ

سب میں پاکٹ منی سے ہی پوری کرتا ہوں۔"

"ہوں پاکٹ منی سے اور وہ جو تم جاب کرتے ہو، اس کے روپے کہاں جاتے ہیں؟"

اس بار مبین کا لہجہ روکھا ہو گیا تھا۔

"وہ بھی اپنی تعلیم پر ہی خرچ کر رہا ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ فیس اور کتابوں پر کتنے روپے لگ جاتے ہیں۔ گھر بیٹھ کر باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔"

موی اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ وہ اندر ابھی تک روپے مانگنے میں مصروف تھا۔ مگر آج جیسے سب نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اسے خالی ہاتھ ہی بھیجنا ہے۔ اس لیے کسی نے بھی سخاوت دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تھک ہار کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیک تو کھاتے جاؤ ولید۔" دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے فری کو کہتے سنا تھا۔

"اسے بھی اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دو شاید اس پر بھی تمہیں پرافٹ ملنے لگے۔" وہ خفگی سے کہتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ اپنے پیچھے اس نے فری کا قہقہہ سنا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ جب اس نے اپنے پیچھے ایک آواز سنی۔

"ایک منٹ ذرا رک جائیں۔" وہ چونک کر پیچھے مڑا تھا۔

"میرے پاس کچھ روپے تھے فالتو پڑے تھے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے آپ کو ضرورت ہے آپ لے لیں۔"

موی نے نروس ہو کر اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا تھا۔ وہ چند لمحے حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔

"تھینک یو۔ لیکن میں بہت جلد یہ رقم واپس کر دوں گا۔" اس نے روپے جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں واپس لینے کے لیے نہیں دے رہی ہوں مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ آئندہ بھی نہیں ہو گی آپ انہیں رکھ سکتے ہیں۔"

وہ تیزی سے اندر چلی آئی اس کا دل جیسے بلیوں اچھل رہا تھا خوشی کا ایک عجیب سا احساس اس کے اندر بیدار ہو رہا تھا۔

"اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی، اب اسے کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑے گا۔ کسی سے کہنا بھی نہیں پڑے گا۔ پتا نہیں اسے کس چیز کے لیے روپے چاہیے تھے اور یہ سب لوگ کیوں انکار کر رہے تھے جب وہ جانتے بھی تھے کہ وہ اپنے گھر والوں سے یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ اس کی مدد کریں گے پھر بھی وہ اس طرح کر رہے تھے۔"

وہ ایک بار پھر سوچ رہی تھی۔ لاؤنج میں سب فلم دیکھنے اور اس پر تبصرہ کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اندر آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گئی چور نظروں سے اس نے سب کا جائزہ لیا کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے کسی کو شک نہیں ہوا۔" اس نے سوچا بھی تھا۔

* * *

"موی! میں پینٹنگز کی ایک نمائش دیکھنے جا رہی ہوں PC میں، چلو گی؟" فرح نے چہرے پر بلش آن لگاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا بھئی، ایسا کیا پوچھ لیا میں نے؟" فری نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ایک لمحے کو اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔

"میں پہلے کبھی نہیں گئی۔" وہ کچھ جھینپ گئی تھی۔

"پہلے تو تم نے اور بھی بہت کچھ نہیں کیا ہوگا۔ اب کرو گی بس تم چل رہی ہو میرے ساتھ۔ اصل میں واصف نے مدعو کیا ہے مجھے۔ وہ بھی لنچ کے بعد ادھر ہی آ رہا ہے۔" اس نے موی کو بتایا تھا۔

"میں کپڑے چینج کر لوں؟" چند منٹ سوچنے کے بعد اس نے فری سے پوچھا۔

"خدا کا خوف کیا کرو موی! کیا ایسے کاموں کے لیے بھی اجازت لیتے ہیں بھئی ظاہر ہے۔ باہر چل رہے ہیں تو گھر کے کپڑوں میں تو نہیں جائیں گے۔ کپڑے بدل کر ہی جائیں گے اور اس کام کے لیے مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ جا کر کپڑے چینج کرو۔"

فری نے قدرے ناگواری سے کہا۔ وہ کچھ شرمندہ ہو کر اس کے کمرے سے نکل آئی۔ دس منٹ بعد جب وہ واپس فری کے کمرے میں گئی تھی تو وہ بالکل تیار کھڑی تھی۔

"آئی رائٹ لپ اسٹک۔ اسے صاف کرو اور یہ والی لپ اسٹک لگاؤ۔"

اس نے موی کو دیکھتے ہی حکم جاری کیا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کرنے لگی۔

"لاؤ تھوڑا سا بلش آن بھی لگا دوں۔"

اس نے قریب آ کر اس کے چہرے پر اپنے ہاتھ چلانے شروع کر دیے تھے۔

"بس اب ٹھیک ہے چلو چلیں۔"

چند منٹوں بعد فری نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا تھا وہ فری کے پیچھے چلتی ہوئی باہر آ گئی۔

"سارا دن گھر میں بند مت رہا کرو کہیں چلی جایا کرو۔ کوئی مصروفیت ڈھونڈو اپنے لیے۔ میں تو سارا دن مصروف رہتی ہوں مگر ثمین تو ہوتی ہے۔ تم اس کے ساتھ جا سکتی ہو یا پھر فراز اور مبشر میں سے کسی سے کہا کرو، وہ تمہیں کہیں لے جایا کریں۔ کوئی لائبریری جوائن کر لو۔ کلب جایا کرو اور کچھ نہیں تو جم ہی چلی جایا کرو۔ تم ویسے بھی بہت کمزور ہو رہی ہو آج کل۔"

فری گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مسلسل اسے ہدایات دے رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

"مگر میرا دل نہیں چاہتا۔" ساری باتیں سننے کے بعد اس نے دھیمی آواز میں صرف ایک جملہ بولا تھا۔

"یہ دل کیا ہوتا ہے بھئی دنیا میں سارے کام دماغ کی مدد سے کرنے چاہئیں۔"

موی نے اس کے چہرے پر نظر دوڑائی۔ وہ گاڑی میں بجنے والے میوزک پر ہونٹوں سے ڈسنگ کر رہی تھی۔ موی نے مزید کچھ نہیں کہا۔

کار پارک کرنے کے بعد دونوں نیچے اتر آئی تھیں۔ واصف انہیں ہال کے دروازے پر ہی مل گیا تھا۔

"اچھا موی! میں اب آدھے گھنٹے بعد تم سے ملوں گی۔ تم یہیں ملنا۔"

اس نے ہال میں داخل ہوتے ہی موی سے کہا تھا اور پلک جھپکتے ہی واصف کے ساتھ آگے چلی گئی۔ ہال میں بہت سے لوگ پھر رہے تھے۔ ان میں فارنرز کی تعداد زیادہ تھی۔ وہ خاموشی سے اسی جگہ کھڑی ہو گئی جہاں فری سے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ہال کی دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں پر نظر دوڑانے کی کوشش کی۔ دور سے گیلری کی دیواروں پر لٹکتے ہوئے فریم ہی نظر آ رہے تھے یا پھر اپنے سامنے کھڑے لوگوں کی پشتیں۔ تصویریں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اسے تصویروں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اسے شاید کسی بھی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

گھر سے باہر آنا جانا اس کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ وہ صرف کالج یا اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا کرتی تھی اور وہاں سے واپس آ کر وہ دوبارہ کہیں بھی جانے کی خواہش مند نہیں ہوتی تھی۔ جب ابو شام کو باقی گھر والوں کے ساتھ اسے بھی پارک یا کہیں اور سیر و تفریح کے لیے لے کر جاتے تو وہ وہاں جا کر بھی باقی بچوں کی طرح کھیلنے کی بجائے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھی رہتی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس نے گھر والوں کے ساتھ باہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ اس کی موجودگی کی وجہ سے ماحول میں ایک عجیب سی ٹینشن رہتی تھی کوئی بھی ٹھیک طرح سے کچھ بھی انجوائے نہیں کر پاتا تھا نہ ممی ابو نہ دوسرے بہن بھائی۔ وہ جیسے ان کی فیملی میں مس فٹ تھی اور اس احساس نے آہستہ آہستہ اسے گھر میں بند کر دیا تھا اور اب فری چاہتی تھی کہ وہ ان کے ساتھ باہر آیا جایا کرے اور یہ بہت مشکل تھا اسے دنیا میں مکس اپ ہونا ناممکن لگ رہا تھا۔ مگر تایا کے گھرانے میں بہت سی روایات عجیب تھیں۔ وہ لوگوں سے بہت ملتے جلتے تھے۔ فنکشنز میں جاتے تھے اپنے گھر بھی فنکشنز کرواتے تھے اور وہ آہستہ آہستہ اس ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر آج وہ پہلی بار اس طرح کسی ایسی جگہ پر آئی تھی جہاں بہت سے لوگ تھے۔

فری آدھے گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے کے بعد آئی تھی۔ موی کو دیکھ کر وہ مسکرائی۔ "سوری بھئی مجھے کچھ دیر ہو گئی مگر ایسی جگہوں پر دیر ہو ہی جاتی ہے۔ خیر کیسی لگی تمہیں یہ نمائش؟" اس نے موی کے ساتھ باہر نکلتے ہوئے کہا تھا۔

"پتا نہیں؟"

"کیا مطلب؟ تصویریں اچھی نہیں لگیں؟"

"میں نے تصویریں دیکھیں ہی نہیں۔ میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی وہاں کھڑے ہو کر۔" فری نے ٹھٹھک کر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"کیا مطلب؟ تم ایک گھنٹہ وہیں کھڑی رہیں؟"

"ہاں"

"فری نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ I can't believe it (مجھے یقین نہیں آ رہا) تم سے کس نے کہا تھا کہ تم وہیں کھڑی ایک گھنٹہ میرا انتظار کرتی رہو۔"

"فری کو اب غصہ آ رہا تھا۔ واصف بھی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے کہا تھا کہ میں۔"

فری نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "میں نے کہا تھا کہ میں آدھ گھنٹہ کے بعد تم سے یہیں ملوں گی تو اس کا مطلب تھا کہ آدھ گھنٹہ تک تم بھی ادھر اُدھر پھر کر تصویریں دیکھ سکتی ہو۔" وہ اب کچھ نہیں بولی۔

"کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے ویسا، اب میں تو آفس جا رہا ہوں۔"

واصف نے معاملہ رفع دفع کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ فری کے ساتھ اس کی گاڑی کی طرف آ گئی۔ فری نے کار میں بیٹھتے ہی ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تم بھی عجیب چیز ہو موی! اس طرح کیسے رہو گی لوگوں کے ساتھ؟"

وہ چپ رہی تھی۔ فری اسے ایک آئس کریم پارلر پر لے گئی تھی اور وہاں اس نے اپنے اور اس کے لیے آئس کریم منگوائی۔ آئس کریم کھانے کے دوران بھی فری اپنے ذہن سے گیلری والی بات نکال نہیں پائی۔ شام کو ولید آیا تھا اور اس کے آنے پر فری نے ایک بار پھر وہی قصہ دہرانا شروع کیا تھا۔

"اب دیکھو نا، یہ آج موی نے کیا کیا۔ میں اسے اپنے ساتھ۔"

پورے دن میں پہلی بار موی کا چہرہ خجالت سے سرخ ہوا اور پہلی بار اسے فری بری لگی تھی۔ ولید نے پورا قصہ سن کر ایک نظر اس پر ڈالی۔ سر جھکائے کرسی کے ہتھے کو انگلیوں کے ناخنوں سے رگڑتی ہوئی وہ خاموش بیٹھی تھی۔ وہ کچھ کہنے لگا تھا پھر کہتے کہتے رک گیا۔

"ویسے کیسی تھی نمائش؟ کون سے آرٹسٹ کی تصویریں تھیں؟" اس نے یک دم موضوع بدل دیا۔

"نمائش تو اچھی ہی تھی این سی اے کے کچھ لوگوں کی پینٹنگز تھیں اور کچھ اور آرٹسٹ تھے۔ مگر کوئی بھی مشہور یا بڑا نام نہیں تھا۔ سارے ہی نئے لوگ تھے، بعض کی تو میرا خیال ہے، یہ پہلی ہی نمائش تھی۔" وہ اسے تفصیلات بتانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ موی نے سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر فری اور فراز سے گفتگو میں مصروف رہا تھا پھر خلافِ معمول اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے۔ آج اتنی جلدی کس بات کی ہے؟" فراز نے اس سے پوچھا تھا۔

"نہیں کسی چیز کی جلدی نہیں ہے۔ بس گھر جانا ہے۔" وہ اس وقت بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"کیوں شام کا کوئی پروگرام طے کر رکھا ہے؟"

فری کا لہجہ معنی خیز تھا موی نے چونک کر پہلے اسے اور پھر ولید کو دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"نہیں، کوئی پروگرام نہیں ہے۔ بس گھر پر ہی تھوڑا کام ہے۔"

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ موی الجھی ہوئی نظروں سے فری کو دیکھتی رہی جو دوبارہ فراز سے باتوں میں مصروف ہو گئی تھی۔

✻

اس دن کے بعد سے وہ کبھی کبھار فرح اور شثین کے ساتھ باہر جانے لگی تھی۔ مارکیٹ، لائبریری، تھیٹر، کلب شثین کی زندگی ان چار چیزوں کے گرد گھومتی تھی۔ وہ انگلش میں ماسٹرز کر رہی تھی اور یونیورسٹی سے واپس آنے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت انہی جگہوں پر گزرتا تھا۔ زیادہ تر اس کی فرینڈز اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ مگر اب وہ موسیٰ کو بھی ساتھ لے جایا کرتی تھی اور موسیٰ کسی دو سال کے بچے کی طرح اس کی انگلی تھامے اس کے ساتھ ساتھ چلتی جاتی۔ لائبریری میں جانا اسے اچھا لگتا تھا کیونکہ وہاں کتابیں ہوتی تھیں اور کتابیں اسے ہمیشہ سے ہی اٹریکٹ کرتی رہی تھیں۔ مگر باقی تمام جگہوں پر وہ خود کو کسی پیراسائٹ کی طرح محسوس کرتی جو خود سے کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوتا تھا۔

فرح سائیکالوجی میں ایم ایس سی کرنے کے بعد آج کل کسی این جی او کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اس کا سارا دن وہیں گزرتا تھا۔ شام کو گھر آنے کے بعد بھی کمپیوٹر پر رپورٹس بناتی رہتی اور جس دن چھٹی ہوتی تھی اس دن بھی اس کی اپنی ہی سرگرمیاں ہوتی تھیں۔ فراز ہاؤس جاب کرنے میں مصروف تھا اور اس کے کوئی طے شدہ اوقات نہیں تھے۔ بعض دفعہ وہ پورا دن گھر پر رہتا اور بعض دفعہ پوری رات غائب رہتا۔ مبشر LUMS سے ایم بی اے کرنے میں مصروف تھا اور وہ صرف شام کے ہی گھر لوٹا کرتا تھا پھر وہ کہیں نہ کہیں چلا جایا کرتا تھا۔ تائی کا اپنا سوشل سرکل بہت وسیع تھا۔ انہوں نے بھی سوشل ورک کے لیے ایک این جی او جوائن کر رکھی تھی۔ وہ فری جتنی مصروف نہیں تھیں مگر پھر بھی وہ تقریباً سارا دن نہیں تو شام کو ضرور کہیں نہ کہیں چلی جایا کرتی تھیں اور تایا ہمیشہ دس بجے کے بعد ہی گھر آتے تھے۔ سارا دن پورا گھر نوکروں کے سر پر رہتا تھا اور موسیٰ بے مقصد پورے گھر کے چکر لگاتی رہتی۔ اپنے گھر کے برعکس یہاں اس کے سر پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ ہر کام کے لیے ملازم موجود تھا۔ وہ کبھی کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا پھر گھر میں آنے والے اخبارات اور میگزینز کا مطالعہ کرتی۔

اس دن بھی وہ صبح سب کے جانے کے بعد لان میں نکل آئی تھی۔ سردیوں کے اوائل کے دن تھے۔ لان میں ہلکی ہلکی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ لان میں پھرتی رہی پھر وہاں چلتے پھرتے وہ ولید کے گھر کے لان کی طرف چلی گئی تھی۔ لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ اس نے دروازے کے اوپر سے ہاتھ ڈال کر اسے کھول لیا۔ دوسری طرف بھی اتنا وسیع و عریض لان تھا جتنا اس کے تایا کا تھا۔ وہ پہلی بار اس طرف آئی تھی۔ لان میں کوئی نہیں تھا۔ گھر میں بھی خاموشی تھی۔ وہ جانتی تھی اس وقت وہ سب بھی اپنے اپنے آفس میں ہوں گے۔ ہاں بس ولید کی امی گھر پر ہوں گی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر کے عقب میں آ گئی تھی اور وہاں اُس نے چند بڑے بڑے کچھ پنجرے اور خرگوش کا ڈربہ دیکھا تھا وہ پاس چلی گئی۔ سات فٹ اونچے ایک چوڑے سے پنجرے میں اس نے آسٹریلین طوطے دیکھے تھے۔ پاس پڑے ایک اور پنجرے میں کچھ تیتر تھے اور اس کے پاس ڈربے میں کچھ خرگوش چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ باری باری ہر پنجرے کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر دوبارہ آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے پاس آ گئی تھی کچھ طوطے پنجروں کے اندر لگے ہوئے تار پر جھول رہے تھے کچھ پنجرے کے اندر اڑ رہے تھے۔ اس نے انہیں گننے کی کوشش کی تھی، وہ تعداد میں نو تھے۔ اس کے لیے ان کی سرگرمیاں بہت دلچسپ تھیں۔ وہ وہیں کھڑی پنجرے کی جالی کے سوراخوں میں انگلیاں پھنسائے ماتھا جالی سے ٹکائے انہیں دیکھتی رہی وہ جب اڑتے ہوئے اس کے سامنے والی جالی کے پاس سے گزرتے تو ان کے پروں کی ہوا وہ اپنے چہرے پر محسوس کرتی

پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا ایک طوطا اچانک اس کی انگلیوں پر جھپٹا۔

مومی کے حلق سے چیخ نکلی تھی اس نے پھرتی سے اپنی انگلیوں کو جالی کے سوراخوں سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ طوطا اب اڑ کر واپس جا چکا تھا۔ اس نے خوف زدہ ہو کر اپنے ہاتھ کو دیکھا دائیں ہاتھ کی درمیان والی انگلی کے ناخن کے پاس سے کچھ گوشت غائب تھا۔ اس کی انگلی میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے انگلی کو دبا کر خون بند کرنے کی کوشش کی تھی اور تب ہی اس نے ایک آواز سنی تھی۔

"کیا ہوا مومی؟" اس نے چونک کر دیکھا وہ کچھ دور برآمدے کے عقبی دروازے میں کھڑا تھا۔ اب وہ اور آگے آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے مومی نے نبیلہ آنٹی کو نکلتے دیکھا تھا اب وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔ مومی نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ وہ اب دوبارہ اپنی ایک اور حماقت کی وجہ سے موضوع گفتگو بننا نہیں چاہتی تھی۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ اب اس کے پاس آ گیا تھا۔ مومی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کچھ نہیں بس ایسے ہی۔"

"چیخی کیوں تھیں؟"

"وہ۔" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ولید کی تیز نظریں فرش پر پڑے ہوئے خون کے قطروں کو دیکھ چکی تھیں۔

"یہ ہاتھ جو پیچھے کیا ہوا ہے، یہ دکھاؤ ذرا۔" اس نے ایک گہرا سانس لے کر ہاتھ آگے کر دیا تھا ولید نے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگلی کا معائنہ کیا تھا۔ پھر جیب میں رومال دیکھنے کی کوشش کی تھی۔

"لاؤ تمہارے ہاتھ پر کچھ لگا دوں۔" وہ رومال نہ ملنے پر اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگا تھا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔ میں خود۔" اس نے روکنے کی کوشش کی تھی۔

"کوئی بات نہیں میں لگا دیتا ہوں۔" اس کا لہجہ بالکل حتمی تھا۔ وہ بے بسی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ نبیلہ آنٹی وہیں برآمدے میں کھڑی تھیں۔ اسے دیکھ کر انہوں نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"کیا ہوا ہے مومنہ؟"

"کچھ نہیں ممی! انگلی پر زخم لگ گیا۔ شاید طوطے نے کاٹا ہے۔" ولید نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا تھا نبیلہ آنٹی نے ایک گہری سانس لی۔

"میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ پتا نہیں کیا ہوا ہے"

وہ ان کی بات پر کچھ شرمندہ ہو گئی۔

"زیادہ کاٹ لیا ہے؟" انہوں نے مومی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ہاں کچھ زیادہ ہی کاٹ لیا ہے۔ میں بینڈیج کر دیتا ہوں۔ میرا ناشتہ ادھر لاؤنج میں ہی لے آئیں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے اندر سے آ گیا تھا۔ وہ کچن کا عقبی دروازہ تھا جو برآمدے میں کھلتا تھا۔ وہ اسے ساتھ لیے کچن سے گزر کر اندر لاؤنج میں آ گیا تھا۔

"بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ اسے وہیں بٹھا کر غائب ہو گیا تھا چند منٹوں کے بعد وہ فرسٹ ایڈ باکس کے ساتھ نمودار ہوا تھا وہ اتنی دیر دائیں ہاتھ سے انگلی کو دبا کر خون روکنے میں مصروف رہی۔ اس نے دو منٹ سے بھی کم وقت میں بڑے ماہرانہ طریقے سے اس کا ہاتھ صاف کر کے بینڈیج کر دی تھی۔ "یہ سامنے واش روم ہے وہاں جا کر ہاتھ دھو لو۔"

اس نے فرسٹ ایڈ باکس بند کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ کسی معمول کی طرح واش روم میں چلی گئی۔ بڑی احتیاط سے اس نے اپنے خون آلود ہاتھ دھوئے، جب وہ واپس آئی تو وہ ایک بار پھر فرسٹ ایڈ باکس کے ساتھ غائب ہو چکا تھا اور نبیلہ آنٹی وہاں ناشتے کی ٹرے کے ساتھ موجود تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔

"آ جاؤ ناشتہ کر لو۔" انہوں نے اسے آفر کی تھی۔

"نہیں، میں ناشتہ کر چکی ہوں۔"

"تو پھر چائے پی لو۔ آ جاؤ۔" انہوں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر چائے بنانا شروع کر دی تھی۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

انہوں نے چائے کا کپ اسے تھما دیا تھا۔ وہ چائے کا پہلا سپ لے رہی تھی جب وہ آ گیا تھا۔ سامنے صوفہ پر بیٹھ کر ناشتے کی ٹرے ٹیبل پر اپنی طرف کھینچ کر اس نے ناشتہ کرنا شروع کر دیا تھا۔

"ولید کو آج بخار تھا، اس لیے یونیورسٹی نہیں گیا۔ دیر سے اٹھا تھا۔"

موی کو یاد آیا، اس کا ہاتھ بہت گرم تھا۔

"یہ ابھی کچن میں گیا تھا اور میں نے ناشتہ بنانا شروع کیا تھا کہ تمہاری چیخ کی آواز سنی۔ مجھے تو پتا نہیں تھا کہ چیخ کس کی ہے مگر ولید فوراً پہچان گیا۔ میں تو بڑی پریشان ہو گئی تھی کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ خیریت ہی رہی۔"

نبیلہ آنٹی آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک پلیٹ میں فروٹ کیک پیس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

"نہیں میں بس چائے پیوں گی۔" اس نے انکار کیا تھا۔

"یہ کیک میں نے خود بنایا ہے، ولید کو بہت پسند ہے، تم کھا کر تو دیکھو۔"

نبیلہ آنٹی نے پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اس نے کچھ حیرانی سے ولید اور نبیلہ آنٹی کو دیکھا تھا پھر وہ کیک کھانے لگی۔ نبیلہ آنٹی سے چند دن پہلے بھی اس کی ملاقات ہو چکی تھی۔ تب وہ اس کی تائی کے ساتھ کسی فنکشن پر جانے کے لیے آئی تھیں۔ اسے تائی کی نسبت وہ بہت سادہ مزاج لگی تھیں۔ لیکن پھر چائے پینے کے بعد وہ نبیلہ آنٹی سے اجازت لے کر باہر نکل آئی تھی۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ رات میں

سے گزر رہی تھی جب اس نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ وہ پیچھے مڑی تھی۔ ولید اس کی طرف آ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں آواز دی تھی تم نے سنا نہیں۔"

اس نے اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا تھا۔ قریب آ کر اس نے جیب سے اپنا والٹ نکالا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی پھر اس نے کچھ نوٹ اس کی جانب بڑھا دیے۔

"یہ تمہارا قرض ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ جلد واپس کر دوں گا۔"

ایک عجیب سی مایوسی نے مومی کو اپنے حصار میں لے لیا۔

"مگر میں نے آپ سے کہا تھا کہ۔"

ولید نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں مجھے یاد ہے تم نے کیا کہا تھا۔ مگر کوئی بات نہیں۔ میں دوبارہ تم سے لوں گا۔ مجھے ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے، ایک بار واپس کروں گا تو پھر ہی دوبارہ مانگ سکوں گا۔ اب پکڑ لو ناں۔"

اس نے اتنے حتمی انداز میں کہا تھا کہ اس نے روپے پکڑ لیے۔

"ایک بار پھر سے شکریہ۔" وہ مسکراتا ہوا کہہ کر اندر چلا گیا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنے لان میں آ گئی۔

نبیلہ آنٹی اسے کہیں سے بھی سخت گیر سوتیلی ماں نہیں لگی تھیں اور ابھی کچھ دیر پہلے وہ جس طرح ولید کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ اس سے بھی ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ولید کو ناپسند کرتی ہیں اور خود ولید کا رویہ بھی بہت نارمل تھا مگر ویسے وہ کہتا ہے کہ۔"

اس کا ذہن ایک بار پھر سوچنے میں مصروف تھا۔

"مگر ہو سکتا ہے نبیلہ آنٹی دوسروں کے سامنے کچھ دکھاوا کرتی ہوں۔ ظاہر ہے وہ ہر ایک کے سامنے تو اس کے لیے اپنی ناپسندیدگی اور نفرت ظاہر نہیں کریں گی۔" اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا تھا۔

"خود میری ممی بھی تو یہی کرتی تھیں۔ دوسروں کے سامنے جتاتی تھیں کہ وہ مجھ میں اور اپنی بیٹیوں میں کوئی فرق نہیں کرتیں۔ انہیں میری بھی اتنی ہی پرواہ رہتی ہے جتنی اپنی بیٹیوں کی اور ہر ایک ان کی بات پر یقین کر لیتا تھا۔ کسی نے بھی کوئی سوال کرنے کی کوشش ہی نہیں کی نہ اس سے پوچھنے کی کوشش کی تھی اور اگر کبھی کوئی اس سے پوچھنے کی کوشش کرتا تو وہ بھی ولید کی طرح سچ نہیں بتا سکتی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس کی تھکن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ انگلی میں اب بھی درد ہو رہا تھا۔

* * *

اسے وہاں آئے دوسرا مہینہ ہونے والا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اکیلی بھی گھر سے باہر جانے لگی تھی۔ گھر کے پاس موجود پارک میں۔ قریبی مارکیٹ میں۔ لائبریری میں کبھی وہ خود ہی پیدل وہاں چلی جاتی اور بعض دفعہ ڈرائیور اسے وہاں چھوڑ آتا تھا۔ اس کی زندگی کا کینوس آہستہ آہستہ وسیع ہونے لگا تھا۔

پہلے کی طرح اب اسے کہیں جانے کے نام پر گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی۔

اس شام وہ سب ایک بار پھر اکٹھے تھے۔

"تم نے ایک چیز نوٹ کی ہے فراز؟" فری نے ولید کو دیکھتے ہوئے کچھ عجیب سے انداز میں کہا تھا۔

"کون سی چیز؟"

"یہ اس ماہ ولید کی تیسری نئی شرٹ ہے، اور دیکھو جاگرز بھی نئے ہیں کیا بات ہے ولید صاحب! کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔"

مومنہ نے ولید کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"بس میرے پاس کچھ روپے آ گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ چلو اور کچھ نہیں تو اس ماہ کچھ شرٹس اور جاگرز ہی لے لیتا ہوں۔"

اس بار مومی نے بے اختیار اسے دیکھا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر جھول رہا تھا۔

"بڑی حیرانی کی بات ہے ولید صاحب کہ آپ کو بھی یہ خیال آ گیا شرٹس اور جاگر ایک بار خریدو اور ہمیشہ استعمال کرو والے آئٹم میں سے نہیں ہیں۔ اب باقی چیزیں بھی لے ہی لینا جن کی تمہیں کئی سالوں سے اشد ضرورت ہے۔" اس بار فراز نے اسے مشورہ دیا تھا۔

"مثلاً؟"

"مثلاً چند عدد جرابوں کے جوڑے، کچھ رومال، پرذاتی شیونگ کٹ، ایک اچھا اور ذاتی ہیئر برش، چند ٹائیاں، کچھ بیلٹس۔" فراز نے ایک لمبی لسٹ گنوا دی تھی۔ ولید بڑی سنجیدگی سے کرسی پر جھولتا ہوا اسے دیکھتا رہا۔

"اس سے کیا ہو گا؟"

"اس سے یہ ہو گا عالی جاہ! کہ مجھے ہر دس دن بعد نئی شیونگ کریم اور ریزر نہیں خریدنا پڑے گا اور ہر ماہ میرے کمرے سے کوئی ہیئر برش اور ٹائی چوری نہیں ہو گی اور میری وارڈ روب میں میری حق حلال کی کمائی سے خریدی ہوئی کچھ اشیاء ضرور پائی جائیں گی۔"

فری نے فراز کی بات پر قہقہہ لگایا تھا۔ مومی نے ولید کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خجالت کے کوئی آثار نہیں تھے۔

"میرے پاس اگر ان چیزوں کو خریدنے کے لیے فالتو روپے ہوں تو میں کبھی تمہاری گھٹیا اور تھرڈ کلاس چیزیں استعمال نہ کروں، لیکن مجبوری ہے، تم لوگ تو میرے حالات جانتے ہی ہو، میں کتنی مشکل سے گزر بسر کرتا ہوں۔ یہ جاننے کے باوجود تم اس طرح میرا مذاق اڑا رہے ہو، تمہیں شرم آنی چاہیے فراز۔"

اس نے فراز کو جھڑکا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم کتنی مشکل سے گزر بسر کرتے ہو اور کہاں سے گزرتے ہو اور کہاں بسر کرتے ہو، یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لیے مجھے تمہاری اس ٹریجڈی پر کوئی ترس نہیں آ رہا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تمہارے یہ جذباتی مکالمات سن کر میں یا دوسرے پھوٹ پھوٹ کر روئیں گے اور تمہیں گلے لگا کر تسلی دیں گے تو اس کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لیے تم اپنے حالات زندگی کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھو۔" فراز نے بڑی

بے رخی سے اس سے کہا تھا۔

"چنگیز خان جب مرا ہو گا تو فراز جمیل پیدا ہوا ہو گا۔" اس بار وسیمہ نے اس سے کہا۔

"تعریف کا شکریہ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ چنگیز خان میری پسندیدہ شخصیت ہے ہسٹری میں۔" فراز کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"ویسے آج کل بائیک پر کیوں آ جا رہے ہو؟ گاڑی کو کیا ہوا؟" فراز کی بات پر مومنہ ایک بار پھر چونکی تھی۔

"شکر کرو، بائیک پر آ جا رہا ہوں پیدل نہیں۔ یہ سب ممی کی کرامات ہیں۔ انہوں نے گاڑی کی چابی واپس لے لی۔ میں نے بھی مانگنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کھٹارا کا احسان میں دوبارہ اپنے کندھے پر کیوں لوں۔ اچھا ہے رکھ لیں اپنے پاس۔ میرے پاس تو پہلے بھی پٹرول کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ مجھے سفید ہاتھی پال کر کیا کرنا تھا۔" اس نے کرسی پر جھولتے ہوئے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں پٹرول کے لیے تمہارے پاس روپے نہیں ہوتے، ہوٹلنگ کے لیے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کو تحفے تحائف دینے کے لیے ہوتے ہیں اچھا ہے۔ آنٹی نے گاڑی لے لی ہے۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تمہیں گاڑی تو کیا بائیک بھی دی جائے۔"

ثمین نے کافی اکھڑے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ مومی سن ہو گئی تھی۔ وسیمہ نے کرسی جھلانا بند کر دیا۔

"بس یہی خرابی ہے تم لڑکیوں میں جب اور کچھ کہہ نہیں سکتیں تو فوراً الزام لگانے پر آ جاتی ہو۔ شک کرتی ہو۔ کل لاکھ صفائیاں دے مگر تم تو کبھی ماننے پر تیار ہی نہیں ہوتیں۔ تمہاری بات تو جیسے پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ میرے جیسے بندے کے پاس لڑکیوں کے لیے وقت کہاں ہوتا ہے اور لڑکیاں وہ بھی تو بندہ دیکھتی ہیں۔ مجھ میں ایسا ہے کیا کوئی مجھ سے دوستی کرے گی۔"

مومی کو اس پر ترس آیا۔

"تم جیسا بندہ اور بے چارہ۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں۔ ابھی کل شام کو بھی نبیلہ آنٹی تمہارے کارنامے سنا رہی تھیں ممّا کو۔"

"ممی کی بات مت کرو۔ انہیں تو مجھے بدنام کرنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔ ہر ایک کے پاس جا کر میرے ہی قصے سناتی رہتی ہیں، کبھی واصف اور عثمان کا ذکر سنا ہے تم نے۔"

"ان دونوں کا تو تم نام نہ ہی لو ان کا ذکر وہ کیوں کریں وہ تمہارے جیسے کام نہیں کرتے۔" اس بار فری نے بگڑ کر کہا تھا۔

"دیکھا تمہارے میاں کا نام لیا تو کس طرح کرنٹ لگا ہے تمہیں۔ کتنا اندھا اعتماد ہے تمہیں واصف پر۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں ہے کیونکہ مجھے اس کا اچھی طرح پتا ہے اور اس بار اس سے ملوں گی تو تمہاری پوری گفتگو سناؤں گی۔" فری نے اسے دھمکایا تھا۔

"تم تو ہمارے گھر آنے سے پہلے ہی مجھے وہاں سے نکلوا دینا چاہتی ہو۔"

"تم اپنی حرکات ٹھیک کر لو تو ایسی نوبت نہیں آئے گی ورنہ وہی ہو گا جو تم کہہ رہے ہو۔"

فری اسے مسلسل دھمکا رہی تھی۔ مومی کا دل اچاٹ ہوتا گیا وہ اٹھ کر باہر لان میں آ گئی تھی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔

جب امی نے بڑے ہوتے ہی معمولی باتوں پر روک ٹوک شروع کر دی تھی۔ چھت پر مت جاؤ، دروازے پر کیوں گئی تھی۔ کالج سے اتنی دیر کیوں ہوئی؟ یہ رسالہ کیوں پڑھ رہی ہو؟ شروع میں وہ بہت حیران ہوتی تھی اس کے لیے ان سوالوں کی نوعیت نئی تھی۔ اگر چھت پر جاؤں گی تو کیا ہوگا۔ ان کا گھر جس کالونی میں تھا وہاں گھر کافی فاصلے پر تھے اور کثر اوقات ویرانی سی رہتی تھی۔ چھتوں پر کوئی تب ہی چڑھتا تھا جب کوئی کام ہوتا ورنہ لوگ زیادہ تر اپنے گھروں میں ہی مقید رہتے تھے۔ وہ سردیوں میں کبھی کبھار دوپہر کے وقت چھت پر چلی جایا کرتی تھی اور اس چیز نے امی کو بہت ناراض کر دیا تھا۔

ایک بار ڈانٹ کھانے کے بعد اس نے کبھی چھت کا رخ نہیں کیا۔ وہ امی سے خوفزدہ ہو گئی۔ وہ ہر روز کالج سے آنے کے بعد بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا کرتی تھیں۔ یوں جیسے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ نظریں چرانے لگی تھی۔ اس پر وہ گھبرا جاتی تھی اور اس گھبراہٹ نے امی کے دل میں شکوک کو اور تقویت دی تھی۔ ان کے سارے اعتراضات صرف اسی کے لیے ہوتے تھے۔ اس کی باقی چار بہنوں کے لیے نہیں۔ وہ چھت پر بھی جایا کرتی تھیں۔ کالج سے واپسی پر اکثر اوقات دوستوں کے گھر بھی چلی جایا کرتی تھیں۔ اپنی مرضی کے میگزینز بھی پڑھا کرتی تھیں۔ ان پر کس طرح کی کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی تھی شاید امی مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں۔ وہ ہر بار سوچ کر بجھ جاتی تھی۔

اسے یاد تھا، وہ اپنے ماموں کے بیٹے کی شادی پر گئی ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اس کی امی اور ابو کو بھی بلوایا ہوا تھا۔ خلاف توقع اس کی امی وہاں جانے پر تیار ہو گئی تھیں۔ اسے حیرانی ہوئی تھی کیونکہ امی آج تک کبھی اس کے ننھیال نہیں گئی تھیں، مگر وہ خوش تھی۔ وہاں جا کر بھی اس کی خوشی کم نہیں ہوئی تھی۔ ماموں نے شادی پر اس کے لیے بھی کپڑے سلوائے ہوئے تھے اور وہ تینوں دن وہی کپڑے پہنتی رہی تھی اس کے ننھیال میں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ سب کزنز آپس میں بہت بے تکلف تھے۔ وہ شادی کی تقریبات کے دوران اس سے بھی چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔ ولیمہ کی تقریب سے واپس آنے کے بعد اس کی امی بہت خاموش تھیں۔ وہ ان کا خراب موڈ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اسے اس کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ اگلے ہفتے ماموں نے اسے بلایا تھا وہ ایک چھوٹی سی دعوت کر رہے تھے۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی۔

”آئندہ تم کبھی اپنے ننھیال نہیں جاؤ گی۔ تمہاری امی کو وہ لوگ پسند نہیں آئے۔ بہت چھچھورے لوگ ہیں اور تم اب چھوٹی نہیں ہو، بڑی ہو گئی ہو۔ تمہاری امی نہیں چاہتیں کہ تم وہاں جا کر خراب ہو۔“

اجازت مانگنے پر اس کے ابو نے بڑے واضح لفظوں میں اسے بتا دیا تھا۔ وہ بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتی رہی۔ اسے لگا تھا کسی نے اس کا گلا دبانا شروع کر دیا تھا اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ ماموں کے دوبارہ فون کرنے پر ابو نے ان سے بھی یہی کہا تھا۔ انہوں نے دوبارہ فون نہیں کیا۔

اس کے بی اے کرنے کے بعد ابو نے اسے آگے پڑھنے سے روک دیا تھا۔ وہ اس کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ اس نے آگے پڑھنے پر اصرار نہیں کیا۔

ان ہی دنوں اس کے ابو اپنے کسی دوست کے بیٹے کا رشتہ اس کے لیے لائے تھے۔ لڑکا انجینئر تھا اور فیملی بہت اچھی تھی۔ وہ لوگ اسے پسند کرنے کے بعد انگوٹھی پہنا گئے تھے۔ اس کے بعد گھر میں عجیب قسم کی ٹینشن پیدا ہو گئی۔ امی نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر ابو سے جھگڑنے لگتیں۔ مومنہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا دو ہفتے کے بعد ابو کچھ شرمندہ شرمندہ اس کے پاس آئے تھے۔

"اب ان کا ارادہ بدل گیا ہے، وہ تمہاری بجائے روبینہ کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ رشتہ بہت اچھا ہے اور تمہیں پتا ہے تمہاری چار بہنیں اور ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ روبینہ کی شادی وہاں کر دیں۔" اس کے ابو نے اسے بتایا تھا۔ اس نے خاموشی سے انگوٹھی اتار کر انہیں تھما دی۔

"اگر صرف اتنی سی بات سے گھر کا سکون بحال ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے۔"

اس نے سوچا تھا۔ دو ماہ کے بعد روبینہ کی شادی ہو گئی۔ شادی پر تایا کی فیملی بھی آئی ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد جب وہ واپس جانے لگے تو مومنہ کو پتہ چلا تھا کہ اسے بھی ان کے ساتھ جانا ہے کیونکہ امی چاہتی ہیں، وہ کچھ عرصہ ماحول کی تبدیلی کے لیے وہاں رہ آئے۔ وہ اپنا سامان پیک کرنے کے بعد بہت شرمندگی کے عالم میں ان کے ساتھ لاہور آ گئی تھی۔

تایا اور تائی کی طرح باقی سب کا سلوک بھی اس کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ کسی نے اس سے کچھ بھی کریدنے، کچھ بھی پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے گھر میں بہت جگہ تھی اور اس کے آنے سے کسی کی زندگی اور معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہر ایک نے اس کے بے ضرر وجود کو قبول کر لیا تھا اور اب اسے یہاں آئے تین ماہ ہونے والے تھے اور ہر چیز آج بھی جیسے نئی لگ رہی تھی۔ ہر ماہ اسے اپنے ابو کی طرف سے چند ہزار روپے مل جاتے تھے۔ کچھ روپے اسے تایا بھی دے دیتے تھے اور وہ آج کل اپنے بے مصرف وجود کو کسی کام میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بہت دیر تک وہ لان میں بیٹھی اپنے ماضی کے بارے میں سوچتی رہی پھر عشاء کی اذان ہونے پر اندر آ گئی۔

◆

"تم نے کبھی اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے ولید! کہ تم Physically کتنے ان فٹ ہو۔ سٹیمنا تمہارا اچھا نہیں ہے۔ باڈی تم Stretch نہیں کر سکتے۔ اچھا جمپ تم نہیں لگا سکتے اور دعوے تم بڑے بڑے کرتے ہو۔"

اس سہ پہر فراز اس کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے مسلسل بول رہا تھا۔ موی نے ولید کا جائزہ لیا۔ واقعی اس کی حالت خاصی خراب تھی۔ اس کی شرٹ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا لیکن ریکٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔

"ابھی بھی ہار مان جا میرے یار! ابھی بھی وقت ہے، واک اوور دے دو مجھے مبشر کے ساتھ گیم کرنے دو۔"

"ایسے ہی کرنے دو، میں کوئی فوت تو نہیں ہوا۔ جب تک زندہ ہوں میدان نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

"کتنے جنازے اٹھائے گا اپنی کورٹ سے شٹل کاک کے۔ شرم کرو ولید! چھوڑ دے ریکٹ۔ میں ہوں نا تیرا دوست تیرا ساتھی حساب بے باق کرنے کے لیے۔ دیکھ میں بھی اسے کیسے لوہے کے چنے چبواتا ہوں۔" مبشر اسے پھسلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے گیم پوری کر کے ہی چھوڑی۔

"چلو اب ڈبلز کا میچ کھیلتے ہیں۔"

فری اور شین بھی اٹھ گئی تھیں۔ ولید ہانپتا ہوا موی کے پاس چیئر پر آن بیٹھا۔ تولیے سے پسینہ خشک کرتے ہوئے اس نے موی سے پوچھا تھا۔

’’تم سارا دن کیا کرتی رہتی ہو؟‘‘

’’میں؟‘‘ وہ اس کے سوال پر کچھ گڑبڑا گئی تھی۔

’’میں   میں کچھ بھی نہیں۔‘‘

ویری گڈ میری Follower ہو۔‘‘ موی کی رنگت سرخ ہو گئی۔

’’کچھ پڑھائی لکھائی کی تھی یا؟‘‘ ولید کا لہجہ معنی خیز تھا۔

’’بی اے کیا ہے۔‘‘ اس نے بے اختیار کہا۔

’’وہ تو سب ہی کرتے ہیں۔ اس میں خاص بات کیا ہے اس سے آگے کچھ پڑھا ہے؟‘‘ اس نے سر جھکا لیا۔

’’ہاں بھئی، آج کل کی لڑکیوں کا پڑھائی میں دل کہاں لگتا ہے۔ بس رو دھو کر تھرڈ ڈویژن میں یک ڈگری لے لیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کمال کر دیا۔ پھر گھر بیٹھ جاتی ہیں کسی احمق کے انتظار میں۔‘‘ اس نے حیرانی سے ولید کو دیکھا تھا۔ اس کا لہجہ آج بہت عجیب تھا۔

’’تم موی کے بارے میں غلط اندازے مت لگاؤ۔ اس نے بی اے میں کالج میں ٹاپ کیا تھا، یہ تو بس سارے ارے یہ فاؤں کر رہے ہو تم۔‘‘ فری نے درمیان میں مداخلت کی تھی اور پھر بات کرتے کرتے وہ فراز کی طرف متوجہ ہو گئی۔ موی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کہنے والی تھی۔

’’اچھا واقعی عجیب بات ہے۔‘‘ ولید نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

’’تو پھر پڑھنا چھوڑ کیوں دیا۔ آگے بھی پڑھو کچھ نہ کچھ کرو۔ آج کل کے دور میں بہت ضروری ہوتا ہے۔‘‘

وہ اسے پتا نہیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ غائب دماغی کے عالم میں اس کی باتیں سنتی رہی۔

’’آؤ موی! اب تم کھیلو۔‘‘ شین اسی وقت ریکٹ لے کر اس کے پاس آ گئی تھی۔ شاید وہ کبھی بھی کھیلنے پر تیار نہ ہوتی مگر اس وقت وہ ولید کے پاس سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے فوراً ریکٹ تھام لیا تھا۔

’’فراز بھائی! مجھے تو کھیلنا نہیں آتا۔‘‘ اس نے فراز کے پاس پہنچ کر آہستہ آواز میں کہا تھا۔

’’یہاں کھیلنا آتا کس کو ہے۔ تم شروع کرو، خود بخود ہی آ جائے گا۔‘‘ فراز نے اسے تسلی دی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے سروس کروائی مگر ہی سروس نیٹ میں جا کر لگی۔ اس نے شرمندگی سے فراز کو دیکھا۔ ’’کوئی بات نہیں پھر کرواؤ۔‘‘ فراز نے اس کی ہمت بندھائی۔

اس نے سروس کورٹ میں جا کر ایک بار پھر کانپتے ہاتھوں سے شٹل پھینکی۔ اس بار شٹل کاک نیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گر گئی۔ اس نے تالیوں کی آواز پر چونک کر دیکھا تھا۔

’’زبردست میں اور موی پارٹنر بن سکتے ہیں۔ ہم ایک جیسا برا کھیلتے ہیں۔‘‘

ولید نے شوخ لہجے میں کہا تھا۔ وہ ریکٹ زمین پر رکھ کر تیزی سے لان سے نکل آئی۔ اپنے پیچھے اسے سب کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اسے واپس بلا رہے تھے مگر وہاں رکی نہیں۔

"بس میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کھیلنے کو نہیں میں ناراض ہو کر تو نہیں آئی تھی۔" تھوڑی دیر بعد سب لوگ اندر آ گئے تھے اور فری کے استفسار پر اس نے کہا تھا۔ ویدان کے ساتھ نہیں آیا۔

* * *

پھر اس نے چند روز اسے نہیں دیکھا اور یہ ایک عجیب بات تھی ورنہ وہ دن میں کم از کم ایک چکر ضرور لگا جاتا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا وہ فری سے اس کے نہ آنے کے بارے میں پوچھے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔

"وہ کیوں نہیں آ رہا؟ کیا وہ ناراض ہو گیا ہے یا پھر وہ یہ سوچ رہا ہے کہ میں اس کی بات پر ناراض ہوں۔"

گھر میں کسی کو بھی اس کے نہ آنے پر کوئی حیرت تھی نہ تجسس اور اس چیز نے موی کو اور بھی پریشان کیا تھا۔ انہیں کچھ تو کہنا چاہیے اس کے بارے میں۔

وہ ایک ہفتہ کے بعد آیا تھا۔ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور ہشاش بشاش ہو کر۔ وہ اس وقت لان میں پھر رہی تھی جب اس نے اسے اپنے لان سے نکل کر آتے دیکھا تھا اس نے موی کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا اور پھر اس کی طرف آنے کے بجائے اندر چلا گیا وہ وہیں باہر لان کے چکر لگاتی رہی یہاں تک کہ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ وہ اندر چلی آئی۔ لاؤنج سے سب کے ساتھ اس کے قہقہوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ لاؤنج میں آنے کے بجائے سیدھا اوپر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ جانتی تھی، وہ اب کھانا کھائے بغیر نہیں جائے گا اور وہ کھانے پر اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کمرے کی لائٹ آف کرنے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے دروازے پر دستک سنی اور پھر ملازم کو اپنا نام پکارتے سنا مگر وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ وہ جانتی تھی وہ اسے کھانے کے لیے بلانے آیا تھا۔ ملازم کچھ دیر تک دستک دینے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔

اگلے دن وہ صبح سب کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی۔ جب وہ ایک بار پھر آ گیا تھا کسی کے کہے بغیر ہی وہ کرسی کھینچ کر ناشتہ کرنے بیٹھ گیا تھا۔ اس نے موی کو مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ ناشتہ کرتے ہوئے گاہے بگاہے اس کا چہرہ دیکھتی رہی، مگر وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ فری اور ثمین سے گفتگو میں مصروف تھا۔ وہ ناشتہ کرنے کے بعد وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر یہ جیسے ویدی کی روٹین بن گئی تھی۔ وہ جب بھی وہاں آتا۔ باقی لوگوں سے باتیں کرتا رہتا اور اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ خود بھی اس سے کترانے لگی تھی۔ وہ جب بھی وہاں آتا وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ جاتی تھی اور اگر وہ پہلے سے فراز اور فری کے پاس بیٹھا ہوتا تو وہ کبھی بھی پہلے طرح ان کے پاس نہیں آتی تھی۔

اسے وہاں آئے چار ماہ ہونے والے تھے اور ان چار ماہ میں جب بھی اس کے ابو نے فون کیا تھا، انہوں نے کبھی بھی اسے واپس آنے کے لیے نہیں کہا۔ تایا کے گھر وہ اگر خوش نہیں تھی تو ناخوش بھی نہیں تھی۔ یہاں گھر کی طرح کوئی اس کی وجہ سے ناخوش نہیں تھا نہ ہی گھر کی طرح کوئی اسے گھر سے نکالنا چاہتا تھا مگر وہ جانتی تھی پھر بھی یہ اس کا گھر نہیں تھا۔

* * *

اس دن واصف کی سالگرہ تھی اور وہ ان سب کو لنچ کے لیے پی سی لے کر گیا تھا۔ وسیم اور عثمان دونوں ان کے ساتھ کسی مصروفیت کی وجہ سے نہیں گئے تھے۔ واپسی پر وہ اپنے گھر آنے کے بجائے ولید کے گھر ہی چلے گئے تھے۔ نفیسہ آنٹی باہر دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سب بھی اندر جانے کے بجائے ان کے پاس لان میں آ گئے تھے۔ کافی دیر تک وہ لنچ کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ پھر پتا نہیں زری کو کیا خیال آیا تھا۔

”وہ تمہیں میں اس دن بتا رہی تھی نا سومی کہ واصف کی اسٹڈی میں کتابوں کی اچھی کلیکشن ہے کسی دن دکھاؤں گی۔ اب دیکھنا چاہو تو جا کر دیکھ لو۔“ زری نے اس سے کہا تھا۔

”میں کیسے جا سکتی ہوں اکیلے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔

”چلی جاؤ سومی! کوئی مسئلہ نہیں ہے یہ سامنے والا کمرہ میرا ہے پہلے والا عثمان کا ہے اور اس سے آگے والا وسیم کا۔ میرے کمرے کے ساتھ چھوٹی سی اسٹڈی ہے۔ کمرہ لاکڈ ہے نہ ہی اسٹڈی روم، تم آرام سے جا سکتی ہو۔ کوئی مشکل ہو تو اندر کسی ملازم سے پوچھ لینا۔“

واصف نے راکنگ چیئر پر جھولتے ہاتھ اٹھا کر دوسری منزل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہاں کچھ کمروں کی کھڑکیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ سب دوبارہ گفتگو میں مصروف ہو چکے تھے۔ وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔

سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنے سامنے کمروں کی ایک لمبی قطار دیکھی تھی۔ اس نے اندازہ لگا کر ایک دروازہ کھول لیا۔ وہ اسٹڈی روم ہی تھا اور وہاں واقعی اچھی خاصی کتابیں تھیں، مگر جس چیز نے اسے سب سے پہلے متوجہ کیا تھا وہ وہاں ٹیبل پر پڑا ہوا ایک عدد کمپیوٹر تھا۔ اس نے اسٹڈی میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ ایک نظر اس نے چاروں اطراف ڈالی تھی۔ اسٹڈی کا ایک دروازہ بائیں جانب بھی تھا، شاید وہ واصف کے بیڈ روم میں کھلتا ہوگا، اس نے سوچا تھا اور پھر وہ شیلف کی طرف بڑھ گئی۔ باری باری کتابیں نکال کر اس نے انہیں دیکھنا شروع کیا تھا۔ وہاں مختلف موضوعات پر کتابیں تھیں۔ مگر ان میں زیادہ تر کتابیں کمپیوٹر سے متعلق تھیں۔ اس نے ہر شیلف پر پڑی ہوئی کتابوں کو ترتیب سے دیکھنا شروع کیا اور پھر کچھ کتابیں اس نے نکال لی تھیں۔ کتابیں نکالنے کے بعد وہ ٹیبل پر پڑے ہوئے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ اسے دلچسپی سے دیکھتی رہی۔ کمپیوٹر آن نہیں تھا اور وہ اسے آن کرنا جانتی بھی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ ایسا کوئی رسک لینا چاہتی تھی۔ چند لمحے وہ آف پڑے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی رہی اور ان پر لکھے ہوئے نمبرز اور حروف کو پڑھتی رہی۔ پھر وہ کتابیں اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسٹڈی میں تقریباً ایک گھنٹہ گزار کر جب وہ نیچے آئی تو واصف اندر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔

”واصف بھائی! میں نے کچھ کتابیں لی ہیں آپ کی اسٹڈی سے۔ پڑھنے کے بعد واپس کر دوں گی۔“ اس نے واصف سے کہا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ تم جب چاہو آ کر میری اسٹڈی سے کتابیں لے جا سکتی ہو بس انہیں احتیاط سے رکھنا۔ میں نے بڑی محنت سے جمع کی ہیں۔“ واصف نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

وہ اسے یقین دہانی کراتے ہوئے باہر آ گئی۔ نفیسہ آنٹی اب لان میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھیں۔ شاید باقی سب واپس گھر جا چکے تھے۔ وہ کچھ دیر نفیسہ آنٹی کے پاس بیٹھی رہی پھر ان سے اجازت لے کر گھر آ گئی تھی۔

چند دن کے بعد کتابیں لے کر وہ واپس اسٹڈی میں گئی تھی اور وہاں سے کچھ اور کتابیں لے کر آئی تھی پھر یہ جیسے اس کی روٹین میں شامل ہو گیا تھا وہ ہفتہ میں ایک دوبار ضرور اسٹڈی جاتی اور کچھ دیر وہاں گزارنے کے بعد کتابیں لے کر آ جاتی تھی۔ واصف سے کبھی بھی دوبارہ اسٹڈی جاتے ہوئے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ عموماً رات کے وقت اپنے باپ کے ساتھ آفس سے واپس آتا تھا اور یہی حال عثمان کا تھا۔ وہ بھی بزنس مینجمنٹ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ ہی کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔ صرف ولید تھا جو ابھی پڑھ رہا تھا۔ واصف اور عثمان وسیم کی طرح اپنی پھوپھو کے گھر زیادہ نہیں آتے تھے۔ ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ وہ دونوں سارا دن آفس میں ہوتے تھے اور دوسری وجہ شاید یہ کہ وہ دونوں فراز اور فری سے کافی بڑے تھے۔ جبکہ ولید ان کا ہم عمر تھا۔ واصف کی نسبت فری سے طے تھی۔ جبکہ عثمان کے لئے آج کل نبیلہ آنٹی لڑکیاں دیکھنے میں مصروف تھیں۔

اس روز بھی شام کو وہ کتابیں ہی واپس کرنے کے لیے نبیلہ آنٹی کے گھر گئی تھی۔ نبیلہ آنٹی کو بتانے کے بعد وہ اوپر اسٹڈی میں آ گئی تھی۔ لائٹ آن کرنے کے بعد اس نے پہلے والی کتابیں واپس اپنی جگہ پر رکھ دی تھیں اور کچھ نئی کتابیں نکال کر اسٹڈی ٹیبل پر رکھ گئی۔ تب ہی اچانک کسی نے ایک جھٹکے سے اسٹڈی کا دروازہ کھولا۔ وہ چونک کر مڑی۔ وسیم اسٹڈی کے دروازے میں کھڑا حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید اس وقت واصف کے بیڈ روم میں تھا اور کسی کام سے اسٹڈی میں آیا تھا۔

"موحی! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں کتابیں لینے آئی تھی۔" وہ اسے یک دم اپنے سامنے پا کر گڑبڑا گئی تھی۔

"کتابیں لینے لیکن یہاں سے؟" وہ اب بھی حیران تھا۔

"میں نے اجازت لی ہے۔"

"کس سے اجازت لی ہے؟" اس کا لہجہ کچھ تیکھا تھا۔

"واصف بھائی سے پوچھا ہے میں نے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میں جب چاہوں یہاں آ سکتی ہوں۔"

اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"واصف بھائی سے؟ کیا بات ہے بھئی واصف کی۔ بڑے بڑے لوگ ان سے اجازت لیتے ہیں۔ مجھ غریب کو تو کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا۔ ٹھیک ہے موحی بی بی جو چاہیں کریں۔ آپ کو کھلی چھٹی ہے۔" اس کا لہجہ بے حد عجیب تھا۔

"اگر آپ کو برا لگا ہے تو میں آئندہ یہاں سے کوئی کتاب نہیں لوں گی۔ میں آپ کو تکلیف " اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں ٹیبل پر رکھ دی تھیں۔ اب اس پر کچھ خجالت بھی طاری ہو چکی تھی۔

وہ اس کی بات سن کر دروازہ چھوڑ کر اسٹڈی کے اندر آ گیا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض کیوں ہو جاتی ہو۔ اس دن وہ بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد تم نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی جہاں میں آتا ہوں تم بھاگ جاتی ہو۔ شاید میری شکل دیکھنا ہی نہیں

چاہتیں اور پھر میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔ میں نے کہا ہے کہ مجھے تکلیف پہنچی ہے یا تم کتابیں لینے مت آیا کرو۔ میں نے کچھ ایسا کہا ہے؟"

وہ اس کے سامنے کھڑا سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ مومی کو اپنا چہرہ سرخ ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ "میں ناراض تو نہیں تھی۔ میں تو بس وہ مجھے۔ میں۔" وہ ہکلانے لگی۔

"تم آؤ۔ جتنی چاہے کتابیں لے سکتی ہو مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے Do keep it in your mind. مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" وہ بات کرتے کرتے اسٹڈی سے نکل گیا تھا۔ اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔ کتابیں ٹیبل سے اٹھا کر وہ اسٹڈی سے نکل گئی تھی۔

اگلے دو ہفتے وہ اسٹڈی نہیں گئی۔ وہ دوبارہ وہاں اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسی طرح تایا کے گھر آ رہا تھا، لیکن اس نے بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ہاں اب وہ ایک بار پھر مومی سے بات کرنے لگا تھا۔ وہ بھی پہلے کی طرح اس کے آنے پر اٹھ کر وہاں سے نہیں جاتی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی وہ پہلے کی طرح دوبارہ یہ بات پوائنٹ آؤٹ کرے۔

* * *

اس دن اس کے ابو اچانک آ گئے تھے۔ امی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ چھ ماہ کے بعد انہیں دیکھ رہی تھی۔

"آپ لوگوں کو انوائٹ کرنے آئے ہیں۔ مرینہ کی شادی ہو رہی ہے۔ چودہ تاریخ کو۔ ہم نے سوچا خود آ کر آپ لوگوں کو کارڈ دے دیں اور مومنہ کو بھی لے جائیں۔ وہ بھی بہن کی شادی اٹینڈ کر لے۔" امی نے چائے پیتے ہوئے تائی کو بتایا۔ ان کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اس نے ابو کو دیکھا وہ بھی مسکرا رہے تھے۔

"مرینہ کی شادی اتنی جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابھی تو وہ اٹھارہ سال کی ہوئی ہے۔ تم لوگوں کو مومنہ کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا۔ وہ سب سے بڑی ہے چلو روبینہ کی تو تم نے کر دی مگر اب مرینہ سے پہلے تمہیں مومنہ کا خیال کرنا چاہیے تھا۔"

تائی چپ نہیں رہ سکی تھیں۔ امی کا چہرہ یک دم سپاٹ پڑ گیا۔ وہ اٹھ کر لاؤنج سے باہر آ گئی۔ شام کو وہ امی اور ابو کے ساتھ واپس گجرات آ گئی تھی۔ امی کا موڈ اب پھر نارمل ہو چکا تھا۔ شاید تائی نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ شادی ایک ہفتے کے بعد تھی اور گھر میں بہت سے کام تھے۔ اس نے امی کے بغیر کہے ہی اپنی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ شادی کی تقریبات بہت دھوم دھام سے ہو رہی تھیں۔ شادی کے دوران ہی اسے پتا چلا کہ روبینہ کی شادی کے دوران ہی کسی نے مرینہ کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ ابو شاید اس بات پر تیار نہ ہوتے۔ اس لیے انہوں نے بہانے سے اسے تایا کے ہاں بھجوا دیا تھا اور اس کی عدم موجودگی میں انہوں نے ابو کو اس رشتے پر رضامند کر لیا تھا۔ شادی پر تایا، تائی بھی فری اور شمین کے ساتھ آئے تھے۔ اور شادی کی تقریبات ختم ہونے کے بعد انہوں نے ابو سے کہا تھا کہ وہ اب مومنہ کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں اور دونوں چھوٹی بہنوں سے پہلے اس کی شادی کریں۔

"بھائی صاحب! ابھی ہم فوری طور پر شادی نہیں کر سکتے۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کہ اچھے رشتے کتنی مشکل سے ملتے ہیں اور پھر ابھی دونوں بیٹیوں کی شادی کی ہے۔ اب فوری طور پر تیسری بیٹی کی نہیں کر سکتے ظاہر ہے بہت کچھ دینا دلانا ہوتا ہے۔ ایک دو سال ٹھہر کر کریں گے تب تک کوئی اچھا

رشتہ مل جائے گا اور ویسے بھی مومنہ کون سی بوڑھی ہو رہی ہے۔ ماشاءاللہ ابھی جوان ہے۔ میرا تو ارادہ یہ ہے کہ مومنہ کے ساتھ ہی غزل کی شادی بھی کر دیں۔ وہ بھی خیر سے بڑی ہو رہی ہے۔ اگلے سال اس کا قد مومنہ تک پہنچنے لگے گا۔ آپ کو تو پتا ہی ہے، ہمارے کندھوں پر کتنی ذمہ داریاں ہیں۔ بیٹیوں کی شادی کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا۔"

امی نے ان کی باتوں کے جواب میں کہا تھا۔ ابو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ تائی نے بات بدل دی۔

اگلے روز فری جانے کے لیے اپنا سامان پیک کر رہی تھی جب وہ اس کے پاس آئی تھی۔

"کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی؟" اس نے پوچھا تھا۔

فری کے ہاتھ رک گئے۔ "تم جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"ٹھیک ہے چلو۔ میں پاپا سے کہہ دیتی ہوں۔" فری نے دوبارہ پیکنگ شروع کر دی۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر سامان پیک کرنے لگی۔ خلاف توقع امی یا ابو نے اس کے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور پہلی بار اسے یہ بات اچھی نہیں لگی۔

"کیا ان لوگوں کو میری ضرورت ہی نہیں ہے؟ میری کمی محسوس نہیں ہوتی۔ امی کو نہیں ابو کو ہی۔" وہ مایوس ہو گئی تھی۔

* * *

اس شام وہ پھر وصف کی اسٹڈی میں آئی تھی۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی۔ وہ کمپیوٹر کے پاس آ گئی۔ اس نے اسے آن کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ پلگ ساکٹ میں لگانے کے بعد اس نے CPU کو دیکھنا شروع کر دیا بڑی احتیاط سے اس نے پاور کا بٹن دبا دیا۔ چند لمحوں کے بعد کمپیوٹر کی تاریک اسکرین روشن ہو گئی تھی اس نے کی بورڈ پر موجود Keys کو دبانا شروع کیا اسکرین پر موجود سکرین سیور بدل نہیں رہا تھا۔ اس نے باری باری ہر Key کو دبایا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں کتنے منٹ وہ Keys کو بار بار دباتی رہی تھیں پھر اچانک ایک ہاتھ کی بورڈ پر آ گیا تھا اس نے کچھ Keys کو پریس کیا تھا پھر پاس ورڈ فیڈ کیا۔

"لو اب کرو، کیا کرنا ہے؟" ایک پرسکون آواز اس کے عقب میں گونجی۔ پھر ہاتھ Key بورڈ سے ہٹ گیا۔ وہ بالکل ساکت تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہا تھا، وہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائے۔

"کمپیوٹر آپریٹ کرنا آتا ہے؟" ولید نے کچھ توقف کے بعد پوچھا تھا۔

"نہیں۔" اس نے بے جان آواز میں جواب دیا۔

"میں نے اسے آن کر دیا ہے۔ تم اب Key بورڈ استعمال کر سکتی ہو۔ اب کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ جب جانا چاہو تو اسے آن ہی رہنے دینا، مجھے اس پر کچھ کام کرنا ہے۔"

وہ ایک بار پھر اسٹڈی سے غائب ہو گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر ایک گہرا سانس لے کر پیچھے دیکھا تھا۔ پھر دوبارہ اسکرین پر نظریں جما دیں کچھ دیر وہ بے دلی سے Key بورڈ پر ہاتھ چلاتی رہی پھر اٹھ کر اسٹڈی سے باہر آ گئی۔

◆

"جم خانہ چلو گی آج موی میرے ساتھ؟" اس شام فری نے اس سے پوچھا تھا۔

"سب جا رہے ہیں؟"

"نہیں، سب تو نہیں جا رہے۔ پاپا اور ممی نے جانا تھا مگر انہیں کسی ڈنر پر جانا ہے۔ فراز کی آج نائٹ ڈیوٹی ہے۔ ثمین کا بھی کوئی ٹیسٹ ہے۔ میں اور مبشر جا رہے ہیں۔ بہت بڑا فنکشن ہے وہاں، کچھ پاپ سنگرز بھی آ رہے ہیں۔ تم انجوائے کرو گی۔"

فری نے اسے تفصیل بتائی وہ کچھ ہچکچاہٹ کے بعد تیار ہو گئی۔

فنکشن واقعی بہت بڑا تھا۔ پورے لان میں ٹیبلز لگی ہوئی تھیں اور کوئی بھی ٹیبل خالی نظر نہیں آ رہی تھی۔ زیادہ تر نوجوان تھے اور جو ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے۔ فنکشن ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اسٹیج پر آرکسٹرا ہلکی ہلکی دھنیں بجا رہا تھا۔ فری اور مبشر کو ساتھ لے کر انویٹیشن کارڈ پر درج نمبر والی ٹیبل کی طرف بڑھ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فنکشن شروع ہو گیا۔ ایک مشہور پاپ سنگر نے اسٹیج پر چڑھ کر گانا شروع کیا۔ لوگ ہاتھ اوپر کر کے تالیاں بجا رہے تھے۔ کچھ لڑکے اسٹیج کے سامنے ڈانس کر رہے تھے۔ وہ یہ ہنگامہ دیکھنے میں مگن تھی جب اس نے اسٹیج سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیبل پر ولید کو ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ وہ لاشعوری طور پر اسے دیکھتی رہی۔ وہ خلاف معمول ڈنر سوٹ میں ملبوس تھا اور خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ دونوں گانا سننے کے بجائے آپس میں باتیں کرنے میں زیادہ دلچسپی لے رہے تھے۔ پھر فری کی نظر بھی ولید پر پڑ گئی تھی۔

"ارے ولید بھی آیا ہوا ہے مبشر دیکھو۔" اس نے مبشر کو متوجہ کیا۔

"میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں میرے سامنے ہی آ کر بیٹھا ہے۔" مبشر نے بے نیازی برتی۔

"یہ لڑکی کون ہے اس کے ساتھ؟"

"کوئی ایک لڑکی مستقل ہو تو بندہ اتا پتا بھی رکھے، ہر تیسرے دن کوئی نئی لڑکی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ ویسے یہ ارسہ ہے۔ آج کل اس کے بڑے گن گا رہا ہے۔ پرسوں گپ شپ کرنے گیا ہوا تھا۔ میری بھی اتفاقاً وہاں ملاقات ہو گئی۔ تب ہی اس نے تعارف کروایا تھا۔ یہ کلاس فیلو ہے اس کی جس ملٹی نیشنل کمپنی میں انٹرن کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اس میں اس کا باپ بھی ڈائریکٹر ہے۔" مبشر نے پوری تفصیل بتا دی تھی۔

وہ گم صم ہو گئی تھی۔ "ملٹی نیشنل کمپنی میں انٹرن کے طور پر کام کر رہا ہے؟" اس نے مبشر سے پوچھا تھا۔

"ہاں اصل میں یہ LUMS سے MBA کر رہا ہے۔ پچھلے سال ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے ہائر کیا تھا۔ کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ وہ بھی پارٹ ٹائم جاب کر رہا ہے وہاں سے پچیس ہزار لے لیتا ہے۔" وہ بے یقینی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

"مگر یہ تو کہتے ہیں کہ ان کے پاس روپے نہیں ہوتے اور ان کے کپڑے بھی۔" فری نے ایک ہلکے سے قہقہے کے ساتھ اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ عادت ہے اس کی ٹھو دس ہزار انکل بھی اسے ہر ماہ دیتے ہیں اور اتنے ہی روپے یہ نبیلہ آنٹی سے بھی اینٹھ لیتا ہے۔ پھر بھی قرض لیے بغیر اس کا مہینہ نہیں گزرتا۔ اس کے ہاتھ میں سوراخ ہیں روپیہ اس کے پاس نہیں ٹھہر سکتا کچھ سرگرمیاں بھی اس کی ایسی ہیں لڑکیوں کے ساتھ ہوٹلنگ کرنا، تحفے تحائف دینے اب ظاہر ہے یہ سب کام روپے کے بغیر تو نہیں ہوتے اور تم کپڑوں کو کیا کہہ رہی ہو۔ یونیورسٹی جاتے ہوئے اس کا یہی حال ہوتا ہے۔ گھسی ہوئی جینز اور پرانی شرٹس۔ کبھی اسے شام کو دیکھا کرو، کس طرح بن ٹھن کر نکلتا ہے۔ بڑی اونچی چوائس ہے اس کی Versace اور ارمانی کے علاوہ اسے کوئی کپڑے پسند نہیں آتے۔ تم جا کر کبھی اس کی وارڈ روب دیکھو تو حیران ہو جاؤ۔ پورا بوتیک لگتا ہے۔ مگر پھر بھی اسے گھسے پٹے کپڑے پہن کر پھرنے کی عادت ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کی چیزیں بھی اٹھا کرے جائے۔ ایویں ہی تو ہم اسے ذلیل نہیں کرتے رہتے۔ مگر مجال ہے جو اس پر اثر ہو جائے۔ اسے پرواہ ہی نہیں ہے۔ گھر والے پابندیاں لگا لگا کر تھک گئے ہیں۔ مگر یہ ذرا نبیلہ آنٹی کا لاڈلا ہے، اس لیے اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ ماموں تو قطعاً لاڈ نہیں کرتے اس کا۔ انہوں نے لڑکیوں کے ساتھ پھرنے کی وجہ سے اس کی گاڑی واپس لے لی تھی۔ کئی دفعہ جیب خرچ بھی بند کیا ہے انہوں نے مگر اس کو تو سو طریقے آتے ہیں پیسے حاصل کرنے کے وہاں سے پیسے بند ہوتے ہیں تو نبیلہ آنٹی کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ روپے دیں۔ وہی کہانیاں سناتا ہے، اپنی مجبوریوں کی۔ اصل میں اسے بگاڑنے میں بھی بڑا ہاتھ نبیلہ آنٹی کا ہی ہے۔ ایک تو گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے انہوں نے بڑا لاڈ پیار کیا دوسرے انہیں یہ بھی تھا کہ وہ اپنی ماں کے پاس نہیں ہے، کہیں اسے یہ کمی محسوس نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے اس کی ہر جائز ناجائز فرمائش پوری کی۔ اب ظاہر ہے عادتیں پکی ہو چکی ہیں۔ اب وہ پابندیاں لگانے کی کوشش کرتی ہیں تو وہ قابو میں نہیں آتا ویسے بھی نبیلہ آنٹی کی تو اس میں جان ہے۔ یہی حال اس کا ہے۔ نبیلہ آنٹی پابندی لگاتی ہیں دوسری طرف سے لاڈ پیار بڑھا دیتی ہیں اسے بھی ان کی کمزوری کا پتا ہے اس لیے یہ بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتا پابندیوں کی۔ اب ماموں سوچ رہے ہیں کہ MBA کرے تو اسے لندن بھیج دیں گے اپنی کمپنی کا آفس اسٹیبلش کرنے کے لیے اور ان کا خیال ہے اس کی کہیں انگیجمنٹ کر دیں تاکہ کچھ ذمہ داری کا احساس ہو۔"

فری سوفٹ ڈرنک کے سپ لیتے ہوئے اسے سب کچھ بتاتی گئی۔ وہ کوئی سوال نہیں کر سکی تھی۔

"ان سے نین ملا کر دیکھو
یہ دھوکا بھی کھا کے دیکھو
ان سے نین ملا کے دیکھو
یہ دھوکا بھی کھا کے دیکھو

اسٹیج پر موجود سنگر چیخ چیخ کر گا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ولید کو دیکھا، وہ ابھی بھی وہیں اس لڑکی کے ساتھ موجود تھا۔ باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

آج کی رات بہت کالی ہے
سوچ کا دیپ جلا کے دیکھو

"مجھے چہرے پہچاننا کبھی نہیں آ سکتا۔" اس نے اعتراف کیا تھا۔ اسے یاد آیا تھا جب وہ بار بار اس کے پیچھے اسٹڈی میں آتا تھا۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہر چیز میں بغیر مانگے ہی مدد کرتا تھا۔

"کوئی ایک لڑکی ہو تو بندہ تا پار رکھے اس کے ساتھ تو ہر تیسرے دن ایک نئی لڑکی ہوتی ہے۔" اس کے کانوں میں مبشر کا جملہ گونج رہا تھا۔

"تو کیا یہ میرے ساتھ بھی۔۔۔" وہ آگے کچھ نہیں سوچ سکی تھی۔

"اور میں نے اسے کیا سمجھا۔ ضرورت مند، مجبور، مظلوم۔" وسیم کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

ظاہر ہمیشہ دھوکا دیتا ہے کہیں پڑھا ہوا ایک جملہ اس کے ذہن میں گونجنے لگا تھا۔

"مومی کیا ہوا رو کیوں رہی ہو؟" فری نے چونک کر اس سے کہا تھا۔

"پتا نہیں آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔" اس نے آنکھوں کو مسلنا شروع کیا۔

"ان سے نین ملا کے دیکھو

یہ دھوکہ بھی کھا کے دیکھو

آواز پورے لان میں گونج رہی تھی۔

"اب ٹھیک ہو تم؟"

"ہاں اب ٹھیک ہوں۔" اس نے کچھ دیر بعد آنکھوں سے ہاتھ ہٹا دیئے۔

"سوتیلا ہونا بھی بڑا عذاب ہے سوتیلے ہونے سے مرجانا بہتر ہے۔"

"مجھے صبح سے کسی نے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیا مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

"میں ایک ایک روپے کے لیے ترستا ہوں۔ میرے پاس چار پانچ سو روپے ہوں تو میں کٹ کے بجائے ایک سوٹ نہ لے لوں۔ دو چار سستی شرٹس نہ خرید لوں۔ ایک عدد جینز یا جاگرز کا جوڑا نہ لے لوں۔ ایک عدد چھا بھیز برش نہ لے لوں۔"

"تمہیں کیا پتا میں کس طرح اپنے اخراجات پورے کرتا ہوں۔ یونیورسٹی کی فیس ہوتی ہے پھر اور کئی قسم کے اخراجات ہیں۔ یہ سب میں اپنی جاب اور پاکٹ منی سے ہی پورے کرتا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں پھر کچھ پڑ گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھوں کو مسلنا شروع کر دیا تھا۔

"بس میرے پاس کچھ روپے آ گئے۔ میں نے سوچا کہ چلو اور کچھ نہیں تو چند ٹی شرٹس اور جاگرز ہی لے لوں۔"

"تم لوگ تو میرے حالات جانتے ہی ہو۔ میں کتنی مشکل سے گزر بسر کر رہا ہوں۔ یہ جاننے کے باوجود تم لوگ میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"اچھا ہے گاڑی واپس لے لی۔ میرے پاس تو پہلے بھی پیٹرول کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ مجھے سفید ہاتھی پال کر کیا کرنا ہے۔"

میوزک کا شور پہلے سے زیادہ بلند ہو گیا تھا۔

"میرے جیسے بندے کے پاس لڑکیوں کے لیے وقت کہاں ہوتا ہے اور لڑکیاں وہ بھی تو بندہ دیکھتی ہیں۔ مجھ میں ایسا ہے کیا کہ کوئی مجھ سے دوستی کرے گی۔"

"ممی کی بات چھوڑو۔ انہیں تو مجھے بدنام کرنے کے علاوہ اور کوئی کام ہے ہی نہیں۔ ہر ایک کے پاس جا کر میرے ہی قصے سناتی رہتی ہیں۔ کبھی واصف اور عثمان کا نام سنا ان کے منہ سے۔"

سنگر اب اسٹیج سے نیچے اتر کر ٹیبلز کے درمیان چکر لگا رہا تھا۔

"میں اور موی اچھے پارٹنر بن سکتے ہیں۔ ہم ایک جیسا برا کھیلتے ہیں۔"

"تم تنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض کیوں ہو جاتی ہو۔ اس دن بھی تم وہ بیڈمنٹن والی بات پر ناراض ہو گئی تھیں۔ پھر تم نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جہاں میں آتا ہوں۔ تم بھاگ جاتی ہو شاید تم میری شکل دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔"

"تم جتنی کتابیں چاہو لے سکتی ہو۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

"اس کے ہاتھ میں سوراخ ہے روپیہ اس کے پاس نہیں ٹھہرتا۔ کچھ سرگرمیاں بھی اس کی ایسی ہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ ہوٹلنگ کرنا، تحفے تحائف دینا اب یہ سب کام روپے کے بغیر تو نہیں ہو سکتے۔"

"تم کبھی اس کی وارڈ روب جا کر دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔ پورا بوتیک لگتا ہے مگر پھر اس کو گھسے پٹے کپڑے پہن کر پھرنے کی عادت ہے۔ کبھی شام کو دیکھا کرو، اسے کیسے بن ٹھن کر نکلتا ہے۔"

"ویسے بھی نبیلہ آنٹی کی جان ہے اس میں۔ یہی حال اس کا ہے۔ اسے ان کی کمزوری کا پتا ہے۔ اس لیے پابندیوں کی پروا نہیں کرتا۔"

اس کے اردگرد آواروں کا ہجوم تھا۔ ولید اب بھی وہیں بیٹھا لڑکی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ فری اور مبشر ہاتھ اوپر اٹھا کر تالیاں بجاتے ہوئے سنگر کے ساتھ گا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی کچھ پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں مسلنے سے بھی نہیں نکل رہا تھا۔ سنگر دوبارہ اسٹیج پر چڑھ کر ڈانس کرتے ہوئے گا رہا تھا۔ چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگوں کی تالیوں، سیٹیوں اور چیخوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

رات گیارہ بجے واپسی پر لان سے اٹھ کر پارکنگ میں لگائی گئی روشنیوں میں آنے پر فری نے غور سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔

"تمہاری آنکھیں تو بے تحاشا سرخ ہو رہی ہیں موی۔ ستیاناس ہو گیا ہے تم گھر چل کر پانی سے انہیں دھو کر آئی ڈراپس ڈال لینا۔ ورنہ یہ زیادہ خراب ہو جائیں گی۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے موی کو مشورہ دینا شروع کیا۔ "اب تو آنکھ میں کچھ نہیں پڑا ہوا؟"

"نہیں، اب سب کچھ نکل چکا ہے۔" اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا تھا۔

* * *

اس رات کے بعد وہ دوبارہ کبھی اسٹڈی گئی تھی نہ ولید کے گھر۔ اس نے فری وغیرہ کے پاس بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ بس اپنے کمرے میں ہی رہتی تھی۔

"میں سوچ رہی ہوں، پولیٹیکل سائنس میں پرائیویٹ طور پر ماسٹرز کر لوں۔" اس نے فری سے کہا تھا۔

"ہاں ضرور کرو۔" فری نے سرسری طور پر کہا۔ وہ کتابیں بازار سے لے آئی تھی اور انہیں لے کر وہ سارا دن اپنے کمرے میں بند رہتی۔ اس نے لان میں بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب ولید کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی اور بہت دن تک ہر بار کتاب کھولنے پر اس کے سامنے مبشر کے کہے گئے جملے آ جاتے تھے۔

"لوگ کس قدر جھوٹے ہوتے ہیں۔ کتنا بڑا فراڈ کرتے ہیں۔" وہ ہر بار سوچتی تھی۔ میں نے کیوں سوچا کہ یہ بندہ قابل رحم ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے اور مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے۔ میرے ذہن میں یہ خیال ہی کیوں آیا تھا۔" وہ کئی کئی گھنٹے کمرے میں بے کار بیٹھی رہتی۔

"حالانکہ وہ تو ... اور پھر میں نے کیوں اس پر اتنی عنایات کیں۔ کیوں اتنی پرواہ کی۔ وہ میری ذمہ داری تو نہیں تھا۔ مجھے سمجھنے کی کوشش تو کرنی چاہئے تھی کہ سب اس کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کہتے ہیں؟ اس طرح کیوں ٹریٹ کرتے ہیں میں اس کے جھوٹ کو کیوں پکڑ نہیں سکی۔ کیا میں اتنی ۔ اور وہ بھی مجھے دھوکا دیتا رہا۔ میرے ساتھ ۔ اس نے کیوں نہیں سوچا کہ مجھے دھوکا نہیں دینا چاہئے۔ وہ مجھے کیا سمجھتا تھا، احمق، بے وقوف یا پتا نہیں کیا اور اگر یہ سب دوسروں کو پتا چل جائے تو۔" وہ خوفزدہ ہو جاتی۔

"وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ کیا کہیں گے فری تو ہنسے گی۔"

"تم موی! تم کیا اتنی احمق بھی ہو سکتی ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" اس کا خوف بڑھتا جاتا۔ "دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس میں ولید جیسے لوگ ہوتے ہیں اس نے نتیجہ اخذ کیا تھا۔

◆

چند دنوں سے اس نے فری اور ثمین کے رویے میں عجیب سی تبدیلی محسوس کی تھی۔ خدشات اس کے دل میں ابھرنے لگے تھے۔

"کہیں ان کو " وہ خوفزدہ ہو جاتی تھی۔ اس دن رات کو فری اس کے کمرے میں چلی آئی۔

"مصروف ہو موی؟" اس نے اندر آنے کے بعد پوچھا تھا۔ اس کتابیں سمیٹ دیں۔

"نہیں تو۔"

"اصل میں مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

وہ بے حد سنجیدہ تھی۔ موی کا سانس حلق میں اٹک گیا تھا۔ "کیا تم ولید میں، انٹرسٹڈ ہو؟" اسے لگا تھا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"نہیں" اس کے جواب پر فری کے چہرے کے تاثرات یک دم بدل گئے تھے۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں بھی سوچ رہی تھی کم از کم موی اتنی احمق تو نہیں ہو سکتی۔" وہ اب بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ "اصل میں کچھ دن پہلے نبیلہ آنٹی نے ممی سے بات کی تھی تمہارے رشتے کے بارے میں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ولید کو تم پسند ہو اور وہ شادی کرنا چاہتا ہے مگر ممی نے نبیلہ آنٹی سے کہا کہ تم ولید سے شادی کرنا نہیں چاہتیں اور وہ ایک نمبر کا فلرٹ ہے۔ ہم کیسے تمہیں ایسے غیر ذمہ دار آدمی کے پلے باندھ سکتے ہیں۔ کل کو تمہیں کوئی پریشانی ہو تو چچی ہمیں ہی الزام دیں گے۔ ممی نے تو صاف انکار کر دیا کہ تم ولید کو پسند نہیں کرتیں تو شادی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے مگر ولید دو تین دن سے بار بار آ رہا ہے۔ کہتا ہے، وہ خود تم سے بات کرنا چاہتا ہے مگر میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تم اس سے کوئی بات کرنا ہی نہیں چاہتیں۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ پہلے اپنی حرکات ٹھیک کرے پھر کسی لڑکی کے لیے پرپوزل لے کر جائے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ موی تو تمہیں اوّل نمبر کا لفنگا سمجھتی ہے، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس پر نظر رکھو گے۔ بڑی باتیں کی ہیں میں نے اس سے موی۔ مگر وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ موی مجھے ناپسند کرتی ہے اور یہ سب کچھ اس نے کہا ہے۔ تب مجھے شبہ ہوا کہ شاید تم اس میں انٹرسٹڈ تھیں اور اسی لئے اس نے پرپوزل بھجوایا ہے مگر اب مجھے تسلی ہو گئی ہے۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ٹھیک کہا میں اس میں انٹرسٹڈ نہیں تھی۔" وہ غائب دماغی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

فری کچھ دیر مزید میٹھی باتیں کرتی رہی تھی پھر اٹھ کر کمرے سے چلی گئی اس نے کمرہ بند کر کے لائٹ آف کر دی تھی۔ پتا نہیں کب تک وہ چپ چاپ بیڈ پر بیٹھی رہی تھی۔

اگلے دن اس نے ابو کو فون کیا۔ "میں واپس آنا چاہتی ہوں۔"

"مگر ابھی کیوں؟ میں تو چاہ رہا تھا کہ تم کچھ اور......"

"میں اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔ واپس آنا چاہتی ہوں۔" اس نے زندگی میں پہلی بار اپنے ابو کی بات کاٹی۔

تیسرے دن اس کے ابو آ کر اسے واپس لے آئے تھے۔ گھر ویسا ہی تھا اور وہاں کے لوگ بھی ریزرو، بجھے بجھے، سنجیدہ۔ گھٹن کے اس پرانے احساس نے ایک بار پھر اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"میں دوبارہ کبھی وہاں نہیں جاؤں گی۔ کبھی بھی نہیں۔" اس نے گھر آ کر اپنے آپ سے پہلا وعدہ کیا تھا۔

⁂

اسے یاد آ رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد کئی ہفتے تک وہ گم صم رہی تھی۔ کام کرتے کرتے اسے بہت سی چیزیں بھول جاتی تھیں۔ بات کرتے کرتے اسے پتا نہیں کیا کیا یاد آنے لگتا تھا۔ کئی ماہ تک وہ رات کو ڈراؤنے خواب دیکھتی رہی تھی۔ ایک ہی آواز، ایک ہی چہرہ، ایک ہی وجود اسے ہر وقت اپنے ارد گرد چلتا پھرتا نظر آتا تھا، اور پھر آہستہ آہستہ وہ ان لمحوں سے باہر آنے لگی تھی۔ وہ ہر بار یہ سوچ کر خود کو تسلی دیتی تھی۔ وہ اچھا انسان نہیں تھا۔ وہ دوسروں کی طرح مجھے بھی پھانسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ورنہ وہ بار بار اس طرح اسٹڈی میں

اور اب اسے پتا چلا تھا کہ وہ خود اس کی اسٹڈی میں جاتی رہی تھی۔ اسے یاد آیا تھا وہ پہلی بار اسے وہاں دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔ سیڑھیوں

سے تر تے ہوئے اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ خشک کیا۔ سارے پردے آہستہ آہستہ اٹھتے جا رہے تھے اور فری... اس نے کیا کیا۔ اس نے شٹین کا راستہ صاف کیا۔ اس نے میری طرف سے خود ہی انکار کر دیا اور اس نے میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ مجھے اس کی بات نہیں سننا چاہیے کیونکہ وہ فراڈ ہے۔ اسے ڈر ہو گا کہ اگر ودیعہ نے مجھ سے بات کی تو پھر ''

اس کو سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ ہر ایک اپنے راستے سے مجھے کتنی صفائی سے ہٹا دیتا ہے۔ چاہے وہ امی ہوں یا پھر ابو یا پھر فری اور شٹین اور میں۔ میرا وجود کیا اس قدر وہ گھر سے باہر نکل آئی تھی۔

وہ اب وہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ گھر کے سامنے والے لان میں صرف چند آدمی تھے۔ باقی سب عقبی لان میں تھے۔ اسٹیریوز پوری آواز سے انگلش نمبرز بجا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل آئی۔

''کاش دنیا میں میرے علاوہ کوئی اور نہ ہوتا۔ کم از کم اس وقت تو۔''

اس نے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے سوچا تھا۔ باہر کی سڑک ویران تھی اور وہاں گاڑیاں کھڑی تھیں اور اس خاموشی میں وہ فل والیم پر بجتے والے انگلش نمبر کو با آسانی سن سکتی تھی۔

اس نے چلتے ہوئے اپنے چہرے پر چند قطرے گرتے محسوس کیے۔ اس نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سٹریٹ لائٹس سڑک پر گرنے والے قطروں کو بہت واضح کر کے دکھا رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔

''میں پچھلے ڈیڑھ سال سے یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میں نے آپ کے ساتھ کب کوئی ایسی حرکت کی تھی کہ آپ میرے بارے میں اتنی خراب رائے رکھنے پر مجبور ہو گئیں۔''

اس نے اپنے پیچھے چاپ سنی اور پھر کسی کو کہتے سنا۔ اولیس ایک بار پھر اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

اس نے اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی وہ اب اس کے برابر چل رہا تھا وہ بھی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ سڑک پر اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ یوں بول رہا تھا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔

''میرا خیال ہے، میں نے اس ایک سال میں، جو آپ نے یہاں گزارا تھا ہمیشہ آپ کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ تحفظ دینے کی کوشش کی تھی پھر بھی آپ کے لیے میں ایک فلرٹ، آوارہ اور لفنگا انسان ہوں۔'' بارش کے قطرے تیز ہونے لگے تھے۔

''یہ ٹھیک ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ میری دوستی ہوتی تھی۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ میری کچھ باتوں کی وجہ سے آپ غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھیں جیسے آپ نے یہ سوچ لیا کہ میں اپنی ماں کے ظلم و ستم سے عاجز ہوں اور میرے پاس روپے نہیں ہیں مگر یہ آپ کی غلطی تھی۔ میری نہیں۔ آپ نے سب کے سامنے مذاق میں کہی جانے والی باتوں کو اتنی سنجیدگی سے کیوں لیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آپ مجھ پر ترس کھانے لگی ہیں یا میری باتوں پر اعتبار کرنے لگی ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب آپ نے مجھے روپے دیے اور پھر بعد میں ہر ماہ مجھے میری ضرورت کی چیزیں بھجوانے لگیں۔ میں ہر ماہ وہ پیکٹ دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ مجھے کون اس طرح شرٹس اور دوسری چیزیں بھجوا رہا ہے پھر مجھے آپ پر شک ہوا تھا اور میرا یہ شک ٹھیک تھا۔''

اس کے گالوں پر اب گرم قطرے بھی گرنے لگے تھے۔ اسٹیریو پر گونجتی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی۔

Smile an everlasting A smile can bring you near to me.

Don't ever let me find you gone cos that would bring a tear to me.

اسے یاد آیا۔ وہ پہلے سے ہمیشہ تم کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور آج وہ اسے آپ کہہ رہا تھا۔

"میں آپ کو منع کرنا چاہتا تھا۔ بتانا چاہتا تھا آپ کی غلط فہمی کے بارے میں مگر میں اتنی ہمت نہیں کر سکا۔ میں آپ کو شرمندہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میرا خیال تھا، آپ سب کچھ جان گئی ہیں۔ جب اسٹڈی میں آیا کرتی تھیں تو میرا خیال تھا کہ آپ میرے بارے میں ویسے جذبات رکھتی ہیں۔ اس لئے وہاں آتی ہیں۔ آج یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی۔ آپ تو واصف کی اسٹڈی سمجھ کر وہاں آیا کرتی تھیں۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آپ کو میری کون سی بات بری لگی تھی جس سے آپ نے میرا ایسا خاکہ بنایا کہ میں پچھلے ڈیڑھ سال سے فری کی باتوں کو بھول نہیں پایا۔"

"میں نے فری سے کچھ نہیں کہا تھا، کچھ بھی نہیں۔" وہ ایک لمحے کو ٹھٹک کر رکا۔ "پھر فری نے کیوں؟" وہ بڑبڑایا۔

"مرد کو محبت نہیں کرنی چاہئے، وہ محبت افورڈ ہی نہیں کر سکتا۔ یہ بندے کو رسوا کر کے رکھ دیتی ہے۔ کم از کم مجھے نہیں کرنی چاہئے تھی اچھا بھلا زندگی گزار رہا تھا اور پھر بس۔"

وہ اسے اس طرح بتا رہا تھا جیسے کسی تیسرے کے بارے میں بتا رہا ہو۔

"ہمیں محبت نہیں کرنی چاہئے۔" اس نے دل میں اعتراف کیا تھا۔

"پچھلے ڈیڑھ سال سے میں خود کو یہی سمجھا رہا ہوں کہ محبت بے کار چیز ہے۔ کیا ہے اگر نہیں ملی کیا دنیا ختم ہو گئی ہے۔ دفع کرو زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو۔ دنیا میں بس وہی تو نہیں تھی۔"

"ہاں پچھلے ڈیڑھ سال سے میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔" گالوں پر گرنے والے گرم قطروں کی تعداد میں اب اضافہ ہو گیا تھا، اسٹیریو پر آواز ابھی بھی گونج رہی تھی!

This word has lost its glory

Let's start a brand new story

Now my love

"اور پرسوں یہاں آنے کے بعد آج تمہیں دیکھا اور بس۔ سب کچھ دھواں بن کر اڑ گیا۔ مجھے پتا چل گیا تھا تم بھی شادی اٹینڈ کرنے آئی ہو مگر میں کوشش کے باوجود تمہیں دیکھ نہیں پایا۔ پھر جب سب مہندی لے کر آ رہے تھے تو میں وہاں کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا تم اب تو نظر آؤ گی مگر تم نظر نہیں آئیں۔ میں نے ایک ایک چہرے کو دیکھا تھا۔ تم اندر کیسے چلی گئی تھیں۔؟"

"لان سے گزر کر۔" اس نے گہرا سانس لیا۔

"ہاں مجھے اس کا خیال آیا تھا اور میں وہاں گیا تھا مگر تم نظر نہیں آئیں میرا دل چاہا تھا میں کہیں بھاگ جاؤں پھر میں نے تمہیں ہال میں دیکھا تھا شین کے پاس۔ مجھے لگا تھا کسی نے مجھے زندگی بخش دی ہے اور پھر میں نے تمہیں وہاں اپنے کمرے میں دیکھا اور میرا دل چاہا تھا جنید مر جائے وہ یہاں کیوں کھڑا تھا۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا اور میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ تم نے کبھی الوژنز دیکھے ہیں موی؟ میں ڈیڑھ سال سے الوژنز کے حصار میں ہوں اور ابھی جو یہاں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں تو مجھے لگتا ہے میں پھر کسی الوژن کے ساتھ چل رہا ہوں۔"

You think that I don't even mean

A single word I say

It's only words And words are all I have

To take your heart away

اسٹیریو کی آواز اب دور ہو چکی تھی مگر وہ اب بھی لفظوں کو سن سکتی تھی۔ وہ رک گئی۔ بارش تیز ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بری طرح بھیگ چکے تھے۔

"شین؟" اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"وہ سمجھ جائے گی ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا جو کسی دوسرے سے محبت کرتا ہو۔ وہ جانتی ہے، میں کس سے محبت کرتا ہوں۔ پہلے تو شاید میں اس سے شادی کر لیتا مگر اب نہیں۔ سب کچھ جاننے کے بعد نہیں۔"

اس نے مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھا تھا پھر اس نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیا۔

"میں نے طوطوں کے پنجرے کی جالی بدلوا دی تھی۔ اب اگر تم انہیں دیکھو میرا مطلب ہے دور تو وہ تمہاری انگلی کو کاٹ نہیں سکیں گے۔"

اس نے مڑ کر ولید کو دیکھا۔

Talk in ever lasting words

And dedicate them all to me

And I will give you all my life

I'm here if you should call to me

اسٹیریو پر بجنے والا نمبر ختم ہو گیا۔ چاروں طرف عجیب سا سناٹا پھیل گیا۔ بارش کے قطرے گرنے کی آواز اس خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر ولید نے اسے مسکراتے دیکھا تھا۔ وہ ایک قدم چل کر اس کے پاس آئی تھی۔ پاس آ کر اس نے اپنی بند مٹھی اس کے سامنے کر کے کھول دی۔ چیونگم کی ایک، سنگ ریپر سمیت ٹیڑھی میڑھی حالت میں اس کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ لہرائی۔ اس نے چیونگم اٹھا لی۔ موی نے اسے کہتے سنا۔

"یہ دنیا کی سب سے قیمتی چیونگم ہے۔" وہ تیزی سے گیٹ کھول کر اندر آ گئی تھی۔ وہ وہیں باہر کھڑا چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی اور بارش

کے قطروں کی آواز کو محسوس کرتا رہا۔

اس نے کلائی سے رسٹ واچ اتار کر وقت دیکھا تھا۔ نو بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے گھڑی کو اسی وقت پر روک دیا۔ ٹشو نکال کر اس نے چیونگم اور گھڑی دونوں کو اس میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ ایک گہری سانس لے کر دونوں ہاتھوں سے گیلے بالوں کو ماتھے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔ بارش کے قطرے اس کے چہرے پر گرنے لگے۔ اس نے مسکراتے ہوئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

”میرے علاوہ کسی کو آج یہ آسمان روشن نظر نہیں آ رہا ہو گا۔“ اس نے واپس جاتے ہوئے سوچا۔

”ہاں یا پھر۔“ اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

⁂

We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers
If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com

or

send message at
0336-5557121

کوئی بات ہے تیری بات میں

ڈور بیل تیسری بار بجی تھی جب اس نے جھنجھلا کر بالآخر اٹھنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے اس نے رسٹ واچ اٹھا کر ادھ کھلی آنکھوں سے وقت دیکھا۔ صبح کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔

اس نے بیڈ سے اٹھ کر سلیپرز پہنے، اور پھر شرٹ پکڑ لی۔ شرٹ پہنتے ہوئے بیل ایک بار پھر بجی تھی اور وہ بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا۔

گیٹ پر جو کوئی بھی تھا وہ بڑے تواتر سے بیل بجا رہا تھا اور کافی مستقل مزاج بھی لگتا تھا۔

واچ مین اس وقت اپنے کوارٹر میں ہوتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ دروازہ اسے ہی کھولنا پڑے گا کیونکہ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے وہ اندر سے نکل آیا۔

پورچ سے گیٹ تک کا فاصلہ طے کرنے کے دوران بیل پھر بجی تھی اور اس بار اس نے عقبی لان سے جیک کو بھونکتے ہوئے بھاگتے دیکھا۔

اس کے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی جیک گیٹ پر پہنچ گیا تھا اور اپنے اگلے پنجوں سے گیٹ کو بجاتے ہوئے وہ بڑے زور و شور سے بھونک رہا تھا۔

گیٹ کے نچلے حصے میں لگی ہوئی سلاخوں سے اس نے کسی لڑکی کی ٹانگیں دیکھی تھیں جو کتے کے بھونکنے پر گیٹ سے کافی دور چلی گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ بیل دوبارہ بجتی اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کی چین اتار کر اسے کھول دیا۔

سامنے موجود چہرہ اس کا شناسا نہ تھا۔ وہ انیس بیس سال کی ایک لڑکی تھی جو چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ دھوپ میں کھڑے رہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا وہ بول اٹھی تھی۔

"سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔"

شاید اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔ وہ اس کی معذرت پر کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا ورنہ وہ اسے بار بار بیل کرنے پر جھڑکنا چاہتا تھا۔

"میں ٹیچر ہوں، ہم لوگ فیصل آباد سے یہاں ایک شارٹ کورس کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم یہ ساتھ والی عمارت میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ وہاں سارے کرسچیز ہوتے ہیں لیکن میں مسلم ہوں۔ مجھے دراصل آٹھواں سیپارہ چاہئے، اگر آپ مجھے دے دیں تو میں پڑھ کر آپ کو واپس کر جاؤں گی۔"

اس نے اس لڑکی کی بات کافی حیرت سے سنی تھی کیونکہ اسے ایسی کسی فرمائش کی توقع ہی نہیں تھی۔ چند لمحوں کے لئے وہ شش و پنج میں پڑا رہا۔

"او کے میں دیکھتا ہوں۔" وہ بالآخر کہہ کر واپس مڑ گیا۔

"پلیز ایک منٹ" وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ دوبارہ اس لڑکی نے اسے آواز دی۔ وہ واپس مڑ آیا۔

"دیکھیں یا تو آپ اس گیٹ کو اندر سے بند کر کے جائیں یا اس کتے کو یہاں سے لے جائیں۔" اس نے جیک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا جو بڑے اطمینان سے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

"ایک تیسرا راستہ اور بھی ہو سکتا ہے میں آپ کو اندر کیوں نہ لے جاؤں۔" وہ بے اختیار بولتے بولتے رکا تھا۔

"یہ کچھ نہیں کہتا" اس نے مسکرا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

"کر تو بہت کچھ سکتا ہے۔" جواب بہت برجستہ تھا اگرچہ اس لڑکی کی نگاہ ابھی تک کتے پر ہی مرکوز تھی۔

"یہ کرتا بھی کچھ نہیں۔" اس نے ایک بار پھر مسکرا کر کہا۔

"پھر بھی آپ گیٹ بند کر کے جائیں۔" وہ ابھی بھی اپنے مطالبے پر قائم تھی۔

"آپ اندر آ جائیں۔" اس نے بالآخر اسے پیشکش کر ہی دی۔

"نہیں شکریہ آپ بس مجھے سیپارہ لا دیں۔"

اس نے اس لڑکی کے انکار پر کندھے جھٹکائے اور بنا کچھ کہے گیٹ بند کر کے اندر کی طرف چل دیا۔

وہ اندر آ کر سوچ میں پڑ گیا کہ سیپارہ اسے مل کہاں سکتا ہے۔ بچپن میں بلاشبہ اس نے قرآن پاک پڑھا تھا لیکن اب بہت عرصے سے اس نے کبھی قرآن پاک کی تلاوت ہی نہیں کی تھی۔ غلطی اس کی نہیں تھی وہ پچھلے چھ سات سال سے امریکا میں تھا اور اس سے پہلے جب وہ پاکستان میں تھا تب بھی اس پر والدین کی طرف سے اس قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی اور فطری طور پر بھی وہ مذہب سے کچھ دور ہی تھا۔ پھر باہر رہنے سے تو وہ جو سال میں دو بار جیسے تیسے عید کی نماز پڑھ لیتا تھا اس سے بھی گیا تھا۔ اس لئے اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سیپارے یا قرآن پاک کہاں تلاش کرے۔

چند لمحے وہ ایسے ہی پریشانی کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر یک خیال آنے پر اپنی دادی کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ دادی باقاعدگی سے نماز پڑھتی تھیں اور ان کے کمرے میں یقیناً قرآن پاک بھی ہوگا۔ کمرے میں داخل ہونے کے چند لمحوں تک متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر تخت پوش کے ساتھ والی الماری کی طرف بڑھ گیا اور الماری کھولتے ہی اس کے سامنے بڑے سلیقے اور نفاست سے رکھے گئے بہت سے سیپارے اور قرآن پاک آ گئے تھے۔ وہ سیپاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے یک دم ٹھٹک گیا۔ بے وضو ہونے کا خیال آنے پر اس نے واش روم جا کر ہاتھ دھوئے۔ پھر واپس آ کر وہ آٹھواں سیپارہ تلاش کرنے لگا۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ سیپاروں کے اوپر عربی اور اردو میں گنتی کے نمبر تھے اور دونوں ہی گنتیاں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ اس نے کچھ اندازہ کرنے کی کوشش کی آٹھواں سیپارہ کون سا ہو سکتا ہے۔ لیکن جس مقدس کتاب کو اس نے پچھلے پندرہ سولہ سال سے کھول کر نہیں دیکھا تھا اب اس کے بارے میں کچھ یاد کیسے آ جاتا۔ اس نے ان پاروں کو ویسے ہی رکھ دیا۔

واپس لاؤنج میں آ کر اس نے فریج سے سپرائٹ کا ٹن نکالا اور اسے کھول کر پیتے ہوئے باہر آ گیا۔ جب اس نے گیٹ کھولا تو وہ لڑکی اس کے ہاتھ میں اپنی مطلوبہ چیز کی بجائے سپرائٹ کا ٹن دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔

"دیکھیں میں نے سیپارہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے وہ نہیں ملا کیونکہ مجھے عربی یا اردو کی گنتی نہیں آتی۔ آپ ایسا کریں کہ خود ہی اندر آ کر مطلوبہ سیپارہ لے لیں۔" اسے لگا کہ اس کی بات پر لڑکی نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ لیکن وہ نظریں چرا کر ایک طرف ہٹ گیا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد لڑکی نے اندر قدم رکھ دیا۔ اس نے جیک کو پاؤں سے چھوتے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا تھا اور وہ اس کے اشارے پر بھاگتا ہوا پھر عقبی لان کی طرف چلا گیا۔ کتے کے جانے پر وہ کافی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

وہ اسے اپنی دادی کے کمرے میں لے آیا اور پھر وہیں دروازے پر کھڑا ہو گیا۔

"سامنے والی الماری میں ہیں۔" اس نے اشارے سے لڑکی کو بتایا تھا اور خود اطمینان سے ٹن کو دوبارہ منہ سے لگا لیا۔ وہ لڑکی الماری کھول کر بڑی احتیاط سے سیپاروں کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ دروازے سے ٹیک لگائے سپرائٹ کے سپ لیتا ہوا اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔ اسے جلد ہی سیپارہ مل گیا تھا اور باقی سیپاروں کو اسی احتیاط کے ساتھ اس نے واپس رکھ دیا۔ پھر الماری بند کر کے وہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس کے قریب رک کر سیپارے کو سیدھا کیا، اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس نے اردو میں لکھے ہوئے آٹھ پر انگشت شہادت پھیرتے ہوئے کہا

"یہ اردو کا آٹھ اور انگلش کا Eight ہے۔"

اس نے بے اختیار اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اب اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے جاننا چاہ رہی ہو کہ وہ اس کی بات سمجھا ہے یا نہیں اس نے بغیر سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔

پھر وہ کچھ کہے بغیر بیرونی دروازے کی طرف چلنے لگی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے اچانک مڑ کر کہا۔

"میں پڑھنے کے بعد اسے واپس کر جاؤں گی۔" وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

گیٹ بند کر کے جب وہ واپس لوٹا تو وہ مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہت عجیب سا تاثر چھوڑا تھا اس نے اس پر، لیکن جلد ہی وہ اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔

* * *

وہ فیکٹری جانے کے لئے تیار ہو کر پورچ میں کھڑی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا جب بیل ایک بار پھر بجی تھی۔ اسے یک دم اس لڑکی کا خیال آیا تھا اور وہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا تھا۔ واچ مین اس وقت دروازے پر موجود تھا اس لئے اب کی بار اسے دروازہ کھولنے کے لئے نہیں جانا پڑا۔ وہ وہیں گاڑی کے کھلے دروازے سے بازو ٹکائے گلاسز ہاتھ میں لئے اسے دور سے آتا دیکھتا رہا۔ وہ سیدھی اس کے پاس آئی تھی۔ سیپارہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر جب اس نے سیپارہ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے چونک پوچھا۔

"آپ نے وضو کیا ہوا ہے؟" اس کے سوال کے جواب میں اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اور اس لڑکی نے سیپارہ پکڑاتے ہوئے یک دم ہاتھ واپس کھینچ لئے تھے۔ اسے بے ساختہ شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔

"تو پھر آپ سیپارہ کیوں لے رہے ہیں؟"

اسے لگا کہ اس لڑکی کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔ وہ اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا لیکن اس نے بڑی ناگواری سے اسے کہا تھا۔

"آپ ایسا کریں کہ اندر رکھ آئیں ملازم اندر ہے۔" وہ کہہ کر گاڑی میں بیٹھنے لگا تھا جب اس نے دوبارہ اسے آواز دی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا ورنہ اس کا موڈ بری طرح بگڑ چکا تھا۔

"مجھے ایک درخواست کرنی ہے، کیا جتنے دن میں یہاں ہوں کیا آپ کے گھر سے قرآن پاک لے کر پڑھ سکتی ہوں۔" وہ اسے بس دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے لہجے میں چند لمحے پہلے کی ترشی کی بجائے عجیب سی التجا تھی۔

"Why not (کیوں نہیں) لیکن آپ ایسا کریں کہ ایک قرآن پاک لے جائیں اور جب آپ کو واپس جانا ہو تب آپ واپس کر جائیں۔" اس نے اس کے سامنے ایک تجویز پیش کی تھی۔

"میں نے یہ سوچا تھا لیکن پھر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کہاں رکھوں گی۔ وہاں زیادہ تر غیر مسلم ٹھہرتے ہیں، اور وہ ہے بھی ان کا مذہبی مرکز وہاں لماریاں تو ہیں لیکن میں وہاں قرآن پاک رکھنا نہیں چاہتی کیونکہ پتا نہیں پہلے وہاں کیا رکھا گیا ہو۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کو تکلیف ہوگی لیکن صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔ کم از کم مجھے یہ تسلی تو رہے گی کہ قرآن پاک، پاک جگہ پر رکھا گیا ہے۔"

"میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ میں تو صرف آپ کی آسانی کے لیے کہہ رہا تھا۔ اگر آپ کو آنے میں کوئی پرابلم نہیں تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ آپ جب چاہیں آ سکتی ہیں۔"

اس نے بڑے کھلے دل سے اسے آفر کی تھی۔ اس لڑکی نے بڑی ممنونیت سے اسے دیکھا۔ پھر وہ اس کا شکریہ ادا کر کے اندر چلی گئی۔ وہ اسے اندر جاتا دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اندر سے نکل آئی اور گیٹ کی طرف چل دی۔

"ایکسکیوزمی! آپ کا نام کیا ہے؟" اس نے اسے روکا تھا وہ اس سوال پر کچھ ہچکچائی تھی جیسے وہ جواب نہ دینا چاہ رہی ہو۔

"میرا نام مریم ہے" بلاآخر اس نے کہہ دیا۔

"تھینک یو۔ بس یہی پوچھنا تھا" وہ دوبارہ گیٹ کی طرف چل دی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

⁂

اگلے دن وہ تین بجے آئی تھی۔ آج پھر اسے نیند سے اٹھ کر دروازے پر آنا پڑا۔ اگرچہ اسے گیٹ نہیں کھولنا پڑا تھا لیکن لاؤنج کا دروازہ اس نے ہی کھولا تھا کیونکہ ملازم اس وقت سرونٹ کوارٹر میں موجود تھا اور وہ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ڈور لاک کر گیا تھا۔ ملازم کو اس نے کہا تھا کہ شام تک اسے ڈسٹرب نہ کرے۔

کچی نیند سے جاگتے ہی اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا تھا کہ شاید ملازم کسی کام سے دوبارہ آیا ہے۔ اسی لئے وہ شرٹ کے بٹن بند کیے بغیر ہی نیچے آ گیا۔ لیکن اب دروازہ کھولنے پر اس لڑکی کو دیکھ کر نہ صرف اس کا غصہ بھاپ بن کر اڑ گیا تھا بلکہ اسے بے تحاشا شرمندگی بھی ہوئی

تھی۔ اس لڑکی نے اسے دیکھتے ہی نظریں جھکائی تھیں۔

”اوہ آپ ہیں۔ اندر آجائیں۔ دراصل میں سو رہا تھا۔“ اس نے تیزی سے اپنی شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے جیسے اپنے حلیے کی وضاحت کی تھی۔

”کل تو آپ ساڑھے گیارہ بجے آئی تھیں“ اس نے پوچھا تھا۔ ”ہاں کل سنڈے تھا اس لئے ہمیں جلدی فری کر دیا گیا تھا۔ باقی دنوں میں ہمیں سات سے تین بجے تک کام کرنا ہوتا ہے۔ لیکن شاید میں ٹھیک وقت پر نہیں آئی۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں اگر آپ نہیں بھی آتیں تب بھی مجھے کچھ دیر بعد اٹھنا ہی تھا کیونکہ مجھے فیکٹری جانا تھا۔ سو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔“

اس نے اس لڑکی کی شرمندگی دور کرنے کے لئے جھوٹ بولا۔

”آپ چاہیں تو کل بھی اسی وقت آجائیں کیونکہ صبح تو میں فیکٹری ہوتا ہوں کل تو میں سنگاپور سے آیا تھا اس لئے فیکٹری جانے کی بجائے سو گیا تھا۔“

وہ دادی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے تفصیل بتانے لگا۔ اس نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ سیپارہ پڑھنے کے بعد جب وہ کمرے سے نکلی تو اس نے پوچھا۔

”آپ کچھ پینا پسند کریں گی۔“

”نو تھینک یو۔۔۔ بس مجھے یہی چاہیے تھا۔“

اس لڑکی نے ایک فقرے میں اپنی بات مکمل کی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ دوبارہ آئی تھی اور اس نے دادی کے کمرے میں جا کر سیپارہ رکھ دیا تھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھ کر ہی اس کا انتظار کرتا رہا تھا اور اس کے واپس جانے کے بعد دوبارہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔

پھر یہ جیسے روزمرہ کا معمول بن گیا تھا۔ وہ آتی سیپارہ پڑھتی وہ اسے چائے کافی کی آفر کرتا، وہ انکار کرتی اور چلی جاتی۔ پھر کچھ دیر بعد واپس آ کر سیپارہ اپنی جگہ پر رکھ دیتی۔ ان دونوں کے درمیان اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اسے وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔

ایسا بالکل نہیں تھا کہ وہ پہلی لڑکی تھی جو اسے اچھی لگی ہو۔ اس کی زندگی میں بہت سی لڑکیاں آتی رہی تھیں۔ امریکا جانے سے پہلے بھی اس کی بہت سی گرل فرینڈز رہی تھیں لیکن ان کی دوستی نے کبھی جائز حدود کو کراس نہیں کیا تھا۔ لیکن باہر جا کر ہر دوستی آخری حد پار کرتی رہی تھی اور یہ سب اس کے لئے ایک معمول کی بات بن چکا تھا کیونکہ جس طبقے سے وہ تعلق رکھتا تھا۔ وہاں ان سب باتوں کو غیر معمولی نہیں سمجھا جاتا تھا، یہ ایک عام سی بات تھی۔ پھر اس کے والدین کی طرف سے بھی اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی اور فطری طور پر بھی وہ لڑکیوں کی کمپنی پسند کرتا تھا۔ اس میں ایک خاص قسم کی روڈنیس تھی جس نے اس کی اپیل کو بہت بڑھا دیا تھا۔

خوبصورت تو وہ تھا ہی لیکن اپنی خوبصورتی کو استعمال کرنا بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ امریکہ میں بہت سی لڑکیوں کے ساتھ اس کے

تعلقات رہے تھے۔ جینیفر تو دو سال تک اسی کے فلیٹ میں رہی تھی اور اس کی فیملی یہ سب جانتی بھی تھی لیکن انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اور واحد نرینہ اولاد ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ ہی بہت اہمیت دی گئی تھی اور اسی لئے وہ بے حد خود سر اور اکھڑ ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں کسی سے خاص لگاؤ نہیں رکھتا تھا سوائے اپنے باپ کے لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کسی کی عزت ہی نہ کرتا ہو۔ وہ اپنی ماں اور بہنوں سے ہمیشہ دھیمے لہجے میں ہی بات کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اگر کہیں ان کی کوئی غلطی یا خامی نظر آتی تو وہ صاف صاف کہہ دیا کرتا تھا۔ اسے بناوٹ پسند نہیں تھی نہ اپنے گھر والوں کی نہ دوسروں کی سنجیدگی اس کے مزاج کا خاصہ بن چکی تھی اور زندگی کے بارے میں وہ اپنے الگ اور واضح نظریات رکھتا تھا جو قدامت پرست لوگوں کے لئے کافی قابل اعتراض ہو سکتے تھے۔ لیکن بہرحال اس کے طبقے کے لئے نئے نہیں تھے۔

پاکستان واپس آنے کے بعد بھی لڑکیوں میں اس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہاں بھی لڑکیوں کے ساتھ اس کی دوستی تھی اور بعض لڑکیوں کے ساتھ یہ دوستی تمام جائز حدود پار کر چکی تھی۔ اسے پاکستان واپس آنے کے بعد امریکہ اور یہاں کے ماحول میں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ بس یہ تھا کہ جو کام وہاں کھلے عام کر سکتا تھا یہاں وہی کام کچھ احتیاط سے کرنا پڑتا تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ ایسے تعلقات رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کی عزت اس کے دل سے یکسر ختم ہو گئی۔ اپنی کلاس کی لڑکیوں کو تو وہ بالکل قابل احترام نہیں سمجھتا تھا اور باقی لڑکیوں کے لئے بھی اس کے خیالات زیادہ مختلف نہیں تھے اور بدقسمتی سے جس لڑکی سے بھی اس کا ٹکراؤ ہوا اس نے اس کے ان خیالات کو اور مضبوط کیا تھا۔

جب مریم پہلی بار اس کے سامنے آئی تھی تو اس نے اس کے لئے کوئی کشش محسوس نہیں کی تھی کیونکہ وہ زیادہ خوبصورت نہیں تھی اور نہ ہی وہ عام طور پر لڑکیوں کی طرح بنی سنوری ہوئی تھی۔ لیکن پھر اس سے چند حرکتیں ایسی سرزد ہوئی تھیں کہ وہ اس میں عجیب سی کشش محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ اسے اس چادر سے باہر بھی دیکھے جو وہ اپنے اردگرد لپیٹے رکھتی تھی۔ ایک عجیب سا انس اسے مریم سے ہو گیا تھا لیکن بہرحال یہ محبت نہیں تھی۔

پھر ایک دن وہ نہیں آئی۔ وہ شام تک لاشعوری طور پر اس کا انتظار کرتا رہا۔ ایک عجیب سی بے چینی اسے لاحق ہو گئی تھی۔ اسی بے چینی میں وہ ساتھ والی عمارت کے سامنے ایک چکر بھی لگا آیا جہاں وہ مقیم تھی اور جہاں اس وقت مکمل سکوت تھا۔

شام کو وہ حسب معمول جاگنگ کے لئے ماڈل ٹاؤن پارک چلا آیا۔ جاگنگ ٹریک پر دوسرے چکر میں اس نے کچھ دور گھاس پر بیٹھی جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ مریم ہی تھی۔ اس کے ساتھ چند لڑکیاں اور بھی تھیں اور وہ سب کچھ کھانے میں مشغول تھیں۔ اپنے ساتھ جاگنگ کرتی سارہ کا ساتھ اسے ایک دم زہر لگنے لگا تھا اور وہ اس سے پیچھا چھڑانے کا سوچنے لگا۔ ٹریک کا دوسرا چکر لگاتے ہی اس نے سارہ سے معذرت کر لی تھی کہ اب وہ اکیلا بھاگنا چاہتا ہے اور وہ اس کے اس اچانک بدلے ہوئے رویے پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔

تیسرے چکر میں وہ بھاگتے ہوئے جگہ کی طرف آ گیا تھا جہاں اس نے مریم کو کچھ دیر پہلے بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی کہ وہ وہیں بیٹھی ہوئی تھی بلکہ اب اس کے پاس وہ لڑکیاں بھی نہیں تھیں۔ وہ ٹریک چھوڑ کر اس کی طرف چلا آیا۔

قدموں کی آہٹ پر مریم نے اس کی طرف دیکھا تھا اور شناسائی کی چمک اس کی آنکھوں میں لہرائی۔ پاپ کارن کھاتے ہوئے اس نے

اپنی چادر کو ٹھیک کیا تھا۔

"ہیلو آج آپ کیوں نہیں آئیں۔" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

"میں آئی تھی لیکن آپ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ آج سنڈے تھا اس لئے میں صبح دس گیارہ بجے آپ کے گھر گئی تھی اس وقت ملازم وہاں پر تھا" اس نے وضاحت کی اور اس نے بے اختیار اپنا نچلا ہونٹ بھینچا تھا۔ چند لمحوں تک دونوں کے درمیان مزید کوئی بات چیت نہیں ہوئی لیکن پھر اس نے دوبارہ گفتگو کا سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟"

اس کے چہرے کا اضطراب اس کی آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکا۔ اس نے نظریں جھکا کر جھجکتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں میں یہاں اپنے سکول کی ٹیچرز کے ساتھ آئی ہوں اور وہ کسی کام سے گئی ہیں بس چند لمحے تک آ ہی جائیں گی۔ اگر آپ یہاں بیٹھیں گے تو یہ مناسب نہیں ہوگا۔"

وہ اس کی بات پر چپ سا ہو گیا تھا۔

"آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا" مریم نے اس کی خاموشی پر سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"او نو کوئی بات نہیں میں دراصل آپ سے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ اور کب تک یہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے لاہور میں۔ ؟"

"بس ایک ہفتہ اور"

"اوکے ٹھیک Have a nice time"

وہ کہتا ہوا دوبارہ جاگنگ ٹریک کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھا۔ اب وہ جاگنگ ٹریک پر بھاگنے لگا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ ہاف بازوؤں والی سفید ٹی شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں کھلے گریبان کے ساتھ وہ بہت دلکش لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لئے رشک تھا۔

اس شام ٹریک پر بھاگتے ہوئے اس کی سوچ کا محور وہ لڑکی ہی رہی تھی۔ وہ اسے سمجھ نہیں پایا تھا اور اسے یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا اس کی کشش میں کچھ کمی آ گئی تھی کہ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں یوں ناکام ہو گیا تھا۔ اسے کبھی بھی لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کوشش نہیں کرنی پڑی تھی۔ لیکن پہلی دفعہ اس کے سامنے ایک ایسی لڑکی آ گئی تھی جسے وہ لاشعوری اور غیر ارادی طور پر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اگلے دن وہ پھر سہ پہر کو ہی آئی تھی۔ وہ بمشکل سیڑھیوں سے نیچے اتر کر دروازہ کھولنے آیا تھا۔ دروازہ کھول کر اس نے اسے راستہ دیا اور خود لاؤنج کی ایک چیئر کھینچ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس دن وہ پہلے کی طرح اس کے ساتھ دادی کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اسے پاؤں میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند کئے کرسی پر جھولتے ہوئے اس نے اچانک مریم کی آواز سنی تھی۔

"ارے آپ کے پاؤں کو کیا ہو گیا" اس نے واپسی پر اس کے پاؤں پر بندھی ہوئی پٹی پر نظر پڑتے ہی پوچھا تھا۔ اس نے اس کی آواز پر

آنکھیں کھول دیں۔ مریم نے اب غور سے اس کا چہرہ دیکھا تھا جو بہت زرد تھا شاید اسے بخار بھی تھا۔

"Nothing serious بس وجہ یہی کل رات کو میں لان میں پھر رہا تھا کسی Insect (کیڑے) نے کاٹ لیا۔"

وہ بے اختیار اس کے قریب چلی آئی پر تاسف نظروں سے اس کے پاؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

"پاؤں سوج گیا ہے نا ؟"

"ہاں کافی زیدہ میں ایسے ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا پھر اوپر سے بخار بھی ہو گیا ہے۔" وہ واقعی کافی تکلیف میں اور تھکا ہوا تھا۔

"میں آپ کو کچھ لکھ کر دیتی ہوں آپ اسے پانی میں ڈال کر اس وقت تک پانی پیتے رہیں جب تک کہ پاؤں ٹھیک نہیں ہو جاتا۔"

"What؟"

وہ اس کی پیشکش پر بری طرح حیران ہوا تھا۔

"آپ ایسا کیا لکھیں گی جسے پی کر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"آپ گھبرائیں نہیں میں آپ کو قرآنی آیت لکھ کر دوں گی اس کاغذ کو پانی میں بھگو کر پینے سے آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ یہ بھی ایک طریقہ علاج ہے۔"

مریم نے جیسے اس کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس نے بڑی غیر دلچسپی سے اس کی بات سنی اور بڑی بے رخی سے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔

"تھینک یو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر سے بینڈیج کروا چکا ہوں اور کچھ میڈیسن بھی لی ہے امید ہے شام تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی میں اس قسم کی چیزوں پر Believe نہیں کرتا۔"

اس کے لہجے میں وہی فطری اکھڑپن تھا لیکن اس نے برا مانے بغیر کہا۔

"پتا ہے پچھلے سال میرے ہاتھ پر بھی کسی کیڑے نے کاٹ لیا تھا" اس نے اپنی کلائی اس کے آگے کی تھی جس پر ایک مدھم سا نشان تھا۔

"میرا تو پورا بازو کہنی تک سوج گیا تھا اور ٹھیک ہونے کو ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بھی بہت سے ڈاکٹرز کو دکھایا تھا۔ پھر کسی نے مجھے کچھ آیات لکھ کر دی تھیں اور وہی پانی پی کر ٹھیک ہو گئی تھی۔ بعد میں تو مجھے کسی میڈیسن کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔"

وہ بڑے رسان سے اسے بتا رہی تھی اور وہ اکتایا ہوا بیٹھا تھا۔ اس لئے فوراً بول اٹھا۔

"آپ نے کسی کوالیفائیڈ ڈاکٹر کو نہیں دکھایا ہوگا اسی لئے ٹھیک ہونے میں اتنی دیر لگی۔" ایک لمحہ کے لئے وہ چپ رہی تھی اور پھر اس کے چہرے پر خفگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

"جی نہیں میں نے کوالیفائیڈ ڈاکٹروں کو ہی دکھایا تھا۔ دنیا میں یہ سہولت صرف آپ ہی کو میسر نہیں ہے اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔"

ایک دم وہ اسی پرانے تکلف کے ماحول میں سمٹ گئی تھی۔ مزید کچھ کہے بغیر اس نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیا اور اسے عجیب سا پچھتاوا ہوا تھا۔ اس کی خفگی اسے بے حد عجیب اور بے حد اچھی لگی تھی۔

"آپ تو ناراض ہو گئیں ... میں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ بہت سے ڈاکٹرز ٹھیک طرح سے ایسی چیزوں کو ٹریٹ نہیں کر پاتے You know یہ کوئی اتنی کامن چیز نہیں ہے۔"

مریم نے چند لمحوں کے لئے رک رک اسے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے اس کی وضاحت تسلیم نہیں کی تھی۔

"دیکھیں آپ کیا مجھے وہ Verses (آیت) لکھ کر نہیں دیں گی" اس بار وہ بے اختیار رک گئی تھی اور اس کی طرف مڑ کر اس نے پوچھا:

"لیکن آپ تو ایسی چیزوں پر یقین ہی نہیں کرتے۔"

"ہاں کرتا تو نہیں But let's try ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ آخر آپ نے سے پہلے آزمایا ہے۔"

اس نے یہ بات صرف اسے خوش کرنے کے لئے کہی تھی ورنہ وہ مکمل طور پر غیر سنجیدہ تھا اور حسب توقع وہ خوش ہو گئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے میں لکھ دیتی ہوں. میں اس سیپارے کو کہاں رکھوں؟"

اس نے بک شیلف کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے وہاں رکھ دو۔"

"پیپر اور پین کہاں سے ملے گا؟" یہ اس کا اگلا سوال تھا۔

"فون کے پاس جو کٹ ہے اس میں دیکھو۔" اس نے اسی طرح چیئر پر بیٹھے بیٹھے ہدایات دیں۔ وہ وہاں سے پیپر اور پین لے کر اس کے پاس چلی گئی اور لاؤنج کے ٹیبل کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گئی۔

"آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں، وہاں صوفہ پر بیٹھ جائیں۔" اس نے مریم کو کارپٹ پر بیٹھتے دیکھ کر کہا۔ اب اسے اس ساری مصروفیات میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

"نہیں. میں یہیں ٹھیک ہوں۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دے کر ڈائری ٹیبل پر رکھ دی اور اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک ہاتھ ڈائری پر جمائے اور ٹیبل پر جھک کر بڑی احتیاط سے کچھ لکھنے لگی۔ اسے یہ پوز بہت دلچسپ لگا تھا۔ اس وقت وہ ایک ایسے سٹوڈنٹ کی طرح لگ رہی تھی جو سالانہ امتحان میں پرچہ سوالات دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے اسے حل کرنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ وہ لکھنے کے ساتھ کچھ پڑھ بھی رہی تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے کا ناقابل برداشت درد اب جیسے ختم ہو گیا تھا۔ پھر اچانک اس نے اس کی خاموشی توڑنے کے لئے پوچھا۔

"آپ لکھ کیا رہی ہیں" جواب میں اسے سر اٹھا کر اسی طرح منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور دوبارہ کاغذ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔ اس کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ کچھ عجیب سی بات تھی اس لڑکی میں جسے وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ اسے اس وقت وہ بہت عجیب سی چیز لگی تھی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا تھا کہ وہ ہمیشہ یونہی اس کے سامنے رہے۔ ایسا کب ہوا تھا کہ اس نے کسی کی ناراضگی دور کرنے کی کوشش کی ہو۔ ایسا کب ہوا تھا کہ اس نے کسی سے اتنی نرمی برتی ہو۔ لیکن اس وقت وہ بے اختیار رہ

سب کر رہا تھا۔ شاید وہ وقت ہی کچھ انہونیوں کا تھا۔

چند منٹوں کے بعد اس نے اپنا کام ختم کر دیا۔ پھر کاغذ پر پھونک مارتے ہوئے اسے تہ کرنے لگی۔ پھر وہ کارپٹ سے اٹھ کر اس کی طرف آئی تھی۔

"آپ وضو کر کے اسے پانی کی بوتل میں ڈال دیں اور جب بھی پیاس لگے وہی پانی پئیں جب پانی ختم ہو جائے تو بوتل میں اور پانی بھر لیں۔"

"دیکھیں میں نے اس وقت وضو نہیں کیا اور نہ ہی مجھے وضو کرنا آتا ہے۔" بڑے اسٹریٹ فارورڈ سے انداز میں اس نے مریم سے کہا تھا۔

اس نے اس کی بات پر کاغذ والا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔

"دوسری بات یہ کہ میں یہاں کا پانی نہیں پیتا ہوں کیونکہ وہ مجھے سوٹ نہیں کرتا۔ میں یا تو ڈسٹلڈ واٹر پیتا ہوں یا منرل، اب آپ بتا دیں کہ ان سے کون سے پانی میں ڈال کر پیوں۔ بلکہ آپ ایسا کریں کہ کچن میں چلیں وہاں پانی کی بوتلز ہیں آپ خود ہی ان میں ڈال دیں۔"

وہ اٹھتے ہوئے بولا تھا۔ مریم خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ لنگڑاتے ہوئے وہ اسے کچن میں لے آیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ کچن کی لائٹ جلا کر اس نے ریفریجریٹر کھولا اور اس میں سے منرل واٹر کی ایک بوتل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ مریم نے بوتل لے کر اس کی سیل توڑی اور اسے کھول کر وہ کاغذ اس میں ڈال دیا پھر بوتل بند کر کے ایک دفعہ اسے ہلایا اور واپس اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ اتنی دیر میں ریفریجریٹر سے جوس کے دو پیک برآمد کر چکا تھا۔

"آپ نے میرے لیے اتنا وقت ضائع کیا ہے تو پلیز تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیں اور جوس پی کر جائیں۔"

"نہیں تھینک یو مجھے اب جانا ہے بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے کچن سے قدم باہر بڑھا دیے۔ وہ بھی اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔ بوتل کو کھول کر وہ پانی کے چند گھونٹ لے رہا تھا جب اس کے آگے آگے چلتی ہوئی مریم کچھ کہنے کے لیے مڑی تھی اور اسے یوں پانی پیتے دیکھ کر ناگواری کی ایک لہر سی اس کے چہرے پر نمودار ہوئی تھی۔

"اس کو اس طرح تو نہیں پیتے۔" کافی خفگی سے اسے ٹوکا گیا۔ وہ بوتل بند کرتے کرتے رک گیا۔

"تو کیسے پیتے ہیں؟" چند لمحے اور اس کے سوال پر اسے گھورتی رہی پھر مڑ کر کچن میں چلی گئی وہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ گلاس اسٹینڈ سے اس نے ایک گلاس لیا اور اس کے قریب چلی آئی۔

"یہ باٹل مجھے دیں۔" اس نے خاموشی سے بوتل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل پر گلاس رکھ کر اس میں پانی انڈیلا۔ گلاس کو آدھا بھرنے کے بعد اس نے ایک کرسی کھینچی اور اسے مخاطب کیا۔

"اب آپ یہاں بیٹھ کر بسم اللہ پڑھ کر یہ دعا کریں کہ اللہ مجھے اس تکلیف اور آزمائش سے نجات دے اور پھر یہ پانی تین گھونٹ میں پی لیں۔" وہ اس کے کہنے پر چیئر پر بیٹھ گیا لیکن بسم اللہ نہیں پڑھ سکا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی اس لیے اس نے اسے بسم اللہ پڑھ کر سنائی تھی۔ جھجکتے ہوئے اس

نے بھی بسم اللہ پڑھ لی تھی اور اچانک اسے پتا چلا تھا کہ وہ بسم اللہ بھی بھول چکا تھا۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ وہ دعا دہرائی تھی۔

"اب آپ دائیں ہاتھ سے گلاس پکڑ کر آہستہ آہستہ پانی پی لیں۔" وہ اس کے پاس کھڑی اسے انسٹرکشنز دے رہی تھی اور وہ کسی معمول کی طرح ان پر عمل کر رہا تھا۔

"یہ کوئی عام پانی یا مشروب نہیں ہے جسے آپ چلتے پھرتے ایسے ہی پیتے رہیں۔ اسے پینے کے کچھ آداب ہیں اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ واقعی ٹھیک ہو جائیں تو اسے اس طرح پیا کریں جیسے میں نے بتایا ہے ورنہ آپ کا پاؤں ٹھیک نہیں ہوگا۔"

اس نے جیسے اسے ڈرایا تھا۔ پھر وہ لاؤنج میں چلی آئی اور اپنا سیپارہ لے کر چلی گئی۔ وہ واپس کمرے میں جانے کی بجائے وہیں لاؤنج میں چلا آیا۔ واپس کمرے میں جاتا تو تھوڑی دیر بعد جب وہ سیپارہ واپس کرنے آتی تو اسے دوبارہ نیچے آنا پڑتا اور وہ اس ڈرل کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اسی لئے اس کے انتظار میں وہیں بیٹھ گیا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد واپس آئی تھی اور اسے دیکھتے ہی اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا،

"اب آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے؟"

"ویل... مجھے تو کوئی فرق محسوس نہیں ہوا... ابھی تک ویسے ہی درد ہے۔"

بڑی صاف گوئی سے اس نے جواب دیا تھا۔

"اچھا..." وہ جیسے بجھ گئی تھی پھر شاید اس نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

"کوئی بات نہیں اتنی جلدی درد ٹھیک نہیں ہو سکتا نا... ابھی تو تھوڑا سا وقت ہی گزرا ہے۔"

پھر وہ سیپارہ اندر رکھ کر واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اس نے لاؤنج کا دروازہ لاک کیا اور اوپر کے کمرے میں جانے سے پہلے پتا نہیں کیا سوچ کر وہ بوتل بھی اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ بوتل کو روم ریفریجریٹر میں رکھنے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ مریم کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

دوبارہ جب وہ بیدار ہوا تھا تو اس وقت کافی شام ہو چکی تھی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ اس نے رسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھا شام کے ساڑھے سات بجے تھے اور وہ پچھلے چار گھنٹوں سے بے خبر سو رہا تھا۔ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھتے ہی پہلا خیال اسے پاؤں کا آیا تھا جسے اس نے ہلایا تھا تو درد کی ایک لہر سی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن بہرحال اب اسے پہلے کی طرح پاؤں میں مسلسل درد نہیں ہو رہا تھا۔ اسے صرف اس وقت درد محسوس ہوتا جب وہ پاؤں کو تیزی سے حرکت دیتا۔ یہ چیز اس کے لئے کافی خوش آئند تھی۔ ورنہ پچھلی پوری رات پیر کو حرکت نہ دینے کے باوجود وہ درد سے بے قرار تھا اور اسی وجہ سے وہ سلیپنگ پلز لینے کے باوجود بھی ٹھیک طرح سے نہیں سو سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صبح سے ہلکا ہلکا بخار ہونا شروع ہو گیا تھا لیکن اس وقت اس بخار کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔

اس نے لائٹ آن کی اور اپنے پیر کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے لگا تھا جیسے پاؤں کی سوجن بھی کچھ کم ہو گئی تھی... اور یہ چیز بڑی مسرت

آمیز تھی۔ پاؤں پر پلاسٹک بیگ چڑھا کر اس نے باتھ لیا تھا اور بہت پرسکون حالت میں نیچے آ گیا۔ ڈیڈی اس وقت گھر آ چکے تھے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے اس سے پاؤں کے بارے میں دریافت کیا تھا اور اس نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ڈیڈی کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا جب ڈاکٹر اسے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ اس کے پاؤں کا معائنہ کرنے کے بعد وہ کافی مطمئن ہو گیا تھا اور اسے ایک انجکشن اور چند مزید میڈیسنز دے کر چلا گیا۔

ڈنر کے بعد وہ کچھ دیر تک باپ کے ساتھ کاروباری معاملات پر گفتگو کرنے کے بعد دوبارہ اوپر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دادی دوسرے چچا کے پاس رہنے گئی ہوئی تھی اور اس کی ممی اس کی بہنوں کے ساتھ امریکہ اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ اس لئے گھر میں بالکل سکوت تھا۔ لیکن جب وہ گھر میں موجود ہوتی تھیں تب بھی وہ اپنا زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنے کی بجائے اپنے کمرے میں گزارنا بہتر سمجھتا تھا۔

اس وقت بھی اس نے کمرے میں آ کر ٹی وی آن کر دیا تھا۔ بیڈ پر لیٹنے سے پہلے اس نے جب میڈیسن پینے کے لئے گلاس میں پانی ڈالا تو اسے اس پانی کا خیال آیا تھا لیکن اس نے لاپرواہی سے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اسے قطعاً بھی یقین نہیں تھا کہ اسے وقتی طور پر جو آرام آیا ہے اس میں اس پانی کا کوئی ہاتھ ہو سکتا ہے بلکہ اسے یقین تھا کہ یہ ڈاکٹر کے ٹریٹمنٹ کا نتیجہ ہے۔ اب وہ دوپہر کے واقعات کے بارے میں بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنی چند گرل فرینڈز سے فون پر بات کی اور پھر اپنے سب سے کلوز فرینڈ کو کال کر کے اس سے باتیں کرنے لگا۔ کافی دیر اس سے باتیں کرتے رہنے کے بعد وہ مووی چینل پر آنے والی فلم دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

فلم دیکھتے ہوئے اسے ابھی آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ اچانک اسے اپنے پاؤں میں درد کی لہریں سی اٹھتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پاؤں کو غور سے دیکھنے لگا جس کی ظاہری حالت میں اسے کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی لیکن درد میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ دیر گزرنے پر درد کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے درد کم کرنے کے لئے ایک پین کلر لی لیکن درد میں کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد ڈاکٹر کو کال کیا اور اس کی انسٹرکشنز کے مطابق دو ٹیبلٹس لیں لیکن نتیجہ اب بھی وہی تھا۔ کل رات کی نسبت آج اسے زیادہ درد محسوس ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنا پاؤں دیکھا اور جیسے دھک سے رہ گیا تھا۔ پاؤں میں کہیں کہیں سرخی مائل نیلے دھبے نظر آ رہے تھے۔ اسی بے چینی میں اسے اس پانی کی بوتل کا خیال آیا تھا اور جانے کیا سوچ کر وہ بمشکل پاؤں گھسیٹتا ہوا فریج کے پاس گیا اور اس لڑکی کی ہدایت کے مطابق اس نے پانی نکال کر پی لیا۔ پھر وہ واپس بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ درد ضبط کرتے ہوئے وہ تقریباً آدھ گھنٹہ تک اسی طرح پاؤں کو حرکت دیئے بغیر لیٹا رہا۔ پھر اچانک اسے محسوس ہونے لگا کہ درد کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اٹھ کر اپنے پاؤں کا جائزہ لیا۔ اس پر ابھی بھی دھبے نظر آ رہے تھے لیکن اب پہلے کی طرح درد نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ریفریجریٹر سے پانی نکال کر پیا اور پھر بیڈ پر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ اس بار درد اتنا کم ہو چکا تھا کہ اسے بستر پر لیٹتے ہی کچھ دیر بعد نیند آنے لگی۔

صبح دیر سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس وقت دس بجے تھے اور پاؤں کو دیکھتے ہی ایک اطمینان کا سانس اس نے لیا تھا۔ جو دھبے رات کو اس کے پاؤں پر نظر آئے تھے اب وہ کہیں بھی نہیں تھے۔ یہ دیکھ کر تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی کہ وہ پاؤں پر وزن ڈال کر کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا

تھا۔ ورنہ پہلے وہ صرف پاؤں کو زمین پر ہلکا سا ٹکا کر ہی کھڑا ہو سکتا تھا۔ تکلیف سے چھٹکارا پا کر اسے یقیناً خوشی ہو رہی تھی لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ درد سے نجات دلانے میں کس کا ہاتھ تھا   پانی کا یا میڈیسنز کا۔ رات کو پانی پینے کے باوجود بھی اسے یہ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ واقعی اس پانی کو پینے سے ہی اسے درد سے نجات حاصل ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ آئی تھی اور اس نے پاؤں کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے کہہ دیا۔

"بہت حد تک ٹھیک ہے بٹ ٹو بی ویری فرینک مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ آپ کے دیئے ہوئے پانی کا کمال ہے یا پھر ڈاکٹرز کی میڈیسنز کا۔"

"اس کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ آپ میڈیسن لینا چھوڑ دیں آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا کہ یہ پانی کا اثر ہے یا میڈیسن کا   " وہ اس کی بات پر مسکرانے لگا۔

"اچھا چلو یہ بھی کر کے دیکھ لیتا ہوں" پھر اس نے اگلے دو دن میڈیسن نہیں لی اور صرف پانی ہی پیتا رہا اور نتیجہ حیران کن تھا۔ چوتھے دن اس کا پاؤں بالکل ٹھیک ہو چکا تھا۔ اب اسے چلنے پھرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا تھا اور زخم کو صرف دبانے پر ہی اس میں ہلکا سا درد محسوس ہوتا تھا ورنہ پاؤں بالکل ٹھیک تھا۔ لیکن بہر حال اسے یہ یقین اب بھی نہیں آیا تھا کہ وہ صرف پانی کی وجہ سے صحت مند ہو گیا ہے۔ اسے لگتا تھا کہ شروع میں اس نے جو میڈیسن لی تھی شاید یہ سب اس کا اثر ہے لیکن بہر حال یہ بات اس نے مریم کے سامنے نہیں کی اور اس کے سامنے یہی ظاہر کیا کہ جیسے اسے بھی اس پانی کی کرامت پر یقین آ گیا تھا۔ پاؤں ٹھیک ہوتے ہی وہ پھر اپنی سرگرمیوں کی طرف لوٹ آیا تھا۔

ہفتہ کا دن تھا اور رات کو سونے کے لیے لیٹتے ہوئے اس کو اچھی طرح یاد تھا کہ صبح اتوار ہے اور وہ جلدی آئے گی اس لیے اس نے آفس دیر سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ صبح جب وہ آئی تھی تو بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے حسب معمول اسے چائے کافی کی آفر کی تھی اور حسب معمول مریم نے آفر ٹھکرا دی تھی۔ جب وہ سیپارہ واپس کرنے آئی تو وہ لاؤنج میں ٹی وی آن کیے بیٹھا تھا۔ سیپارہ اندر رکھ کر وہ واپس آئی تھی تو اس نے کہا تھا۔

"میں نے آپ کو بہت ڈسٹرب کیا لیکن بس آج آخری دن تھا   کل ہم لوگ واپس چلے جائیں گے۔"

اس کے چہرے کی مسکراہٹ ختم ہو گئی تھی۔

"آپ لوگ کل جا رہے ہیں   ؟" اس کے سوال پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیا آپ مجھے اپنا فون نمبر یا ایڈریس دیں گی" وہ اس کی بات پر حیران ہو گئی تھی۔

"وہ کیوں   ؟" وہ اس کی بات کا مناسب جواب نہیں دے پایا بس کندھے اچکاتے ہوئے اس نے کہا:

"نہیں ایسے ہی۔"

"میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔" اسے بڑی سختی سے جواب دیا گیا تھا وہ بس اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

"اچھا ایک منٹ ٹھہر جائیں" وہ یہ کہہ کر تیزی سے اندر چلا گیا اور وہ حیرانگی سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر جتنی تیزی سے وہ اوپر گیا تھا اتنی ہی تیزی سے واپس آ گیا۔

"یہ آپ کے لئے ہے" اس نے ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ نے میرا پاؤں ٹھیک کیا تھا اور اس لئے بھی کہ میں آپ سے فرینڈشپ کرنا چاہتا ہوں اور اس لئے بھی کہ مجھے آپ اچھی لگی ہیں۔"

وہ اس کے تاثرات سے بے خبر کہتا جا رہا تھا اور وہ جیسے غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے یک دم پیکٹ اس کے ہاتھ سے کھینچ کر زور سے دیوار پر دے مارا تھا۔

"آپ نے مجھے بہت غلط سمجھا ہے۔ میں تو صرف قرآن پاک لینے کے لئے آپ کے گھر آئی تھی اور آپ "

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر غصے میں دروازے کی طرف چل پڑی۔

"مریم آپ بھی مجھے غلط سمجھ رہی ہیں" وہ ایک دم اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں یہ تو صرف ایک گڈ ول گفٹ تھا اور کچھ نہیں، بلکہ میں پھر بھی ایکسکیوز کرتا ہوں۔ آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ بہت عرصے کے بعد کسی نے میرے سامنے اس طرح مذہب پر یقین ظاہر کیا ہے جو مجھے اچھا لگا ورنہ اور کوئی بات نہیں ہے۔"

وہ وضاحتیں پیش کر رہا تھا اور اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ رہا تھا۔ اب سے افسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اسے اب یاد آ رہا تھا کہ پچھلے پندرہ دن سے وہ اس سے کتنے مہذبانہ انداز میں پیش آ رہا تھا۔

"مجھے بھی افسوس ہے کہ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔ بس مجھے ایسے ہی غصہ آ گیا تھا۔ آپ نے تو واقعی ہمیشہ اس طرح میری عزت اور مدد کی ہے۔"

مریم نے کھلے دل سے اس سے معذرت کی تھی، شرمندگی کے تاثرات اس کے چہرے پر نمایاں تھے۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ بڑی عجیب نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد اس نے مریم سے کہا۔

"اٹس آل رائٹ آئیں میں آپ کو باہر تک چھوڑ آؤں۔" وہ اس کے ساتھ چل پڑی تھی لیکن اب بھی اپنی حرکت پر پشیمان تھی۔ گیٹ کی طرف جاتے ہوئے اچانک وہ اس سے کہنے لگا۔

"ویسے آئندہ کے لئے ایک مفید مشورہ میں آپ کو دیتا ہوں۔ قرآن پاک سے عقیدت و محبت اچھی چیز ہے لیکن آئندہ کبھی اس طرح اکیلے کسی کے گھر مت جائیں۔" وہ یک دم رک گئی وہ بھی ٹھہر گیا۔

"کیا مطلب......؟" وہ واقعی اس کی بات نہیں سمجھی۔

"ہاں کبھی بھی اکیلے کسی کے گھر مت جائیں اور کسی تنہا مرد کے پاس تو بالکل بھی نہیں چاہے وہ سولہ سال کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا۔"

"کیا مطلب؟" اب کی بار وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

"میرا مطلب وہی ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ آپ اتنے دنوں سے یہاں آ رہی ہیں کیا آپ نے میرے علاوہ یہاں کسی کو دیکھا ہے۔"

اس نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ملازم تھے تو سہی۔" مریم نے جیسے خود کو خوش فہمی سے بہلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کی بات پر تمسخرانہ انداز میں ہنس دیا۔

"اچھا ملازم تھے مگر کب، مجھے اچھی طرح یاد ہے جب آپ پہلے دن آئی تھیں تو گیٹ پر واچ مین تک نہیں تھا اور ملازم اپنے کوارٹرز میں تھے۔"

"گھر میں کوئی نہیں تھا؟" اس نے بمشکل سوال کیا تھا۔

"نہیں گھر میں کوئی نہیں تھا۔ اتنے دنوں میں کیا آپ نے میرے کسی فیملی ممبر کو دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا نا، آپ دیکھ بھی کیسے سکتی ہیں کیونکہ وہ تو یہاں ہیں ہی نہیں وہ امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ صرف فادر یہاں ہوتے ہیں لیکن وہ بھی صبح نو بجے چلے جاتے ہیں اور پھر رات کو واپس آتے ہیں اور پھر کئی دفعہ ایسا ہوا کہ گیٹ پر واچ مین کے علاوہ میرے گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً اس دن جب آپ مجھے وہ پانی والی بنا کر دے رہی تھیں۔"

وہ اطمینان سے کہتا جا رہا تھا اور وہ ہونق بنی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔

"پر میں تو صرف چند منٹ کے لیے آتی تھی اور فوراً چلی جاتی تھی۔" اس نے جیسے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں آپ جلدی چلی جاتی تھیں لیکن وہ صرف اس لیے کہ میں آپ کو جانے دیتا تھا۔ ورنہ چاہتا تو آپ کا قیام طویل بھی ہو سکتا تھا۔"

"پر میں قرآن پاک لینے آتی تھی۔"

اس کا لہجہ کمزور اور معذرت خواہانہ ہوتا جا رہا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ آپ کس لیے آتی ہیں۔"

"لیکن آپ تو مسلم ہیں۔۔۔ میں نہیں مانتی کہ آپ میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کر سکتے تھے۔"

اب کی بار وہ کھلکھلا کر بڑے دلکش انداز میں ہنسا تھا۔

"آپ کیا سوچتی ہیں یہاں سارے کرائم نان مسلم کرتے ہیں؟"

"آپ ایسے تو نہیں لگتے۔"

ایک بار پھر وہ ہنس پڑا تھا۔

"میرے بارے میں آپ کا یہ اندازہ بھی غلط ہے۔ اگر آپ مجھے جانتیں تو یہاں آنے سے پہلے کم از کم ایک ہزار بار ضرور سوچتیں اور اکیلے آتے ہوئے تو شاید لاکھ بار۔" وہ اس کی متغیر ہوتی ہوئی رنگت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"آپ نے تو اتنے دنوں سے میرا نام تک پوچھنا گوارا نہیں کیا۔ کسی مہذب آدمی کو بھڑکانے کے لیے تو اتنی بے رخی ہی کافی ہوتی ہے پھر آج بھی آپ نے بڑا کارنامہ کیا۔ میرا گفٹ اٹھا کر پھینک دیا۔ کمال کیا۔ لیکن آپ دیکھیں واچ مین آج بھی گیٹ پر نہیں ہے اور اکثر اس وقت نہیں ہوتا۔ آپ نے جارحیت اس جگہ دکھائی تھی جہاں صرف میں تھا اور کوئی نہیں۔ آپ خود سوچیں اگر مجھے آپ کی اس حرکت پر غصہ آ جاتا تو کیا ہوتا۔"

وہ اس کی بات پر پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔ وہ جان گیا کہ اب اگر اس نے کچھ اور کہا تو وہ شاید پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے گی۔

"آئیں اب میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ آؤں۔"

وہ سر جھکائے اس کے ساتھ چلنے لگی۔

"ویسے آپ کس کلاس کو پڑھاتی ہیں۔"

چلتے چلتے اس نے اس سے پوچھا۔

"ون کو۔" اس نے اتنی ہلکی آواز میں جواب دیا کہ وہ بمشکل سن پایا۔

"آپ کو پڑھانا بھی اسی کلاس کو چاہئے۔ ویسے جو کچھ ابھی میں نے آپ سے کہا ہے وہ اپنے اسٹوڈنٹس کو ضرور سکھانا۔" وہ اس کے طنز کو سمجھنے کے باوجود بھی چپ ہی رہی۔ گیٹ کی چٹخنی اتارتے ہوئے اس نے کہا۔

"اگر آپ نہ رونے کا وعدہ کریں تو ایک بات دوہراتا ہوں۔" وہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"آپ پہلے دن یہاں آئی تھیں اس دن۔ " وہ بولتے ہوئے یک دم رک گیا پھر دھیمی آواز میں اس نے کہا۔

"اس دن میں ڈرنک کر رہا تھا" مریم کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

"اور جس دن آپ مجھے وہ پانی کی ترکیب بتا رہی تھیں اس دن آپ کے آنے سے پہلے میں ڈرنک کر رہا تھا اور میں نے آپ کے بارے میں وہی سوچا تھا جو کوئی مرد کسی عورت کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور آج آپ نے کتنی آسانی سے میری ایکسکیوز کو مان لیا حالانکہ میں نے وہ گفٹ آپ کو اسی نیت سے دیا تھا جو آپ پہلے سمجھی ہیں اور آپ پتا نہیں اسٹوپڈ ہیں یا کیا ہیں کہ ان میں سے کچھ بھی جان نہیں پائیں تو پھر خود کو اتنے رسک میں کیوں ڈالتی ہیں۔ یار عقل کی ضرورت ہوتی ہے جب دوسرے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں کچھ جان پائیں۔ آپ تو شاید "

وہ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی نمی دیکھ کر یک دم چپ ہو گیا۔ اسے پہلی بار اپنے تجزیے کی بے رحمی کا احساس ہوا تھا But inspite of everything I must admit کہ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں کوئی بدتمیزی نہیں کر سکا۔ شاید میں "

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ اس نے سر اٹھا کر آخری بار اسے دیکھا جو بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ کچھ کہے بغیر گیٹ کراس کر گئی تھی۔

ایک ہفتہ کے بعد اسے اسکول کے ایڈریس پر ایک پارسل ملا تھا۔ اسے بہت حیرت ہوئی تھی کہ اسے اسکول کے ایڈریس پر پارسل کون بھیج سکتا ہے۔ پارسل کھولتے ہی کرسچن ڈی اور کی ایک بہت خوبصورت اور قیمتی گھڑی نے اسے چونکا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنا قیمتی تحفہ اسے کون بھیج سکتا تھا۔ بڑے تجسس سے اس نے پیکٹ میں سے نکلنے والے کارڈ کو کھولا تھا۔ کارڈ پر تحریر لفظوں نے اسے چونکا دیا۔

An ordinary gift for an extraordinary girl who restored my faith in God and the chastity of woman.

Your humble admirer

Walid Haider

چند لمحوں کے لئے اس کا سانس جیسے حلق میں اٹک گیا۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ کس کا بھیجا ہوا تحفہ تھا۔ لیکن پھر وہ اس تحریر کو دوبارہ پڑھنے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس نے وہ کام کیسے کیا ہے جس کا وہ ذکر کر رہا تھا۔ ہاں البتہ اس نے اسے ضرور کچھ سکھایا جسے وہ باقی ساری زندگی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔

”کبھی کسی مرد کے پاس اکیلے مت جانا چاہے وہ سولہ سال کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا۔“

اس نے کیس میں سے گھڑی نکال لی۔

”آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں اس لئے میں آپ سے کوئی بدتمیزی نہیں کر سکا شاید میں آپ سے۔۔“ کوئی کہہ رہا تھا۔ گھڑی کو گالوں سے چھوتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مٹھی بھر مٹی

میں نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی وہ جھنڈی اٹھا لی۔ رات ہونے والی موسلادھار بارش نے گھروں اور دیواروں پر لگی ہوئی جھنڈیوں کو زمین بوس کر دیا تھا۔ میں کچھ دیر اس جھنڈی کو دیکھتا رہا پھر میں نے اسے اپنے ٹریک سوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اس راستے پر نظر آنے والی پہلی جھنڈی... بہت سال پہلے میرے باپ نے پاکستان کی سرزمین پر پہلا قدم رکھتے ہی وہاں کی مٹی کو ایک رومال میں باندھ کر اسی طرح اپنی جیب میں رکھا تھا۔ مٹی کی وہ ننھی سی پوٹلی آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور ہر سال کسی نہ کسی سڑک سے اٹھائی جانے والی ایک جھنڈی بھی۔ شاید میری کولیکشن دنیا کی عجیب ترین چیزوں پر مشتمل ہے۔ اپنے یوم آزادی کے بجائے اگلے دن کسی نہ کسی سڑک پر گری ہوئی کوئی چھوٹی، مسلی، بھیگی ہوئی ایک جھنڈی پھر میں ہر اس جھنڈی کو تاریخ اور سن کے ساتھ اپنی البم میں محفوظ کر لیتا ہوں۔

پچھلے بیس سال سے اسی مخصوص سڑک پر میں صبح کی سیر کے لیے آ رہا ہوں، برسات سردی... گرمی خزاں... بہار، کوئی موسم، کوئی تہوار میرا معمول نہیں بدل سکا حتیٰ کہ موسلادھار بارش اور تیز طوفان بھی۔

رات کی بارش نے ہر چیز کو گیلا کر رکھا ہے۔ تارکول کی سیاہ سڑک بھیگ کر کچھ اور چمکدار اور نمایاں ہو گئی ہے۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت اور پودے بارش کے پانی میں دھل کر کچھ اور نکھر گئے ہیں۔ اس وقت بھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور شاید کچھ دیر بعد بارش ایک بار پھر شروع ہو جائے گی۔ برسات کی ہوا میں وہی مخصوص نمی ہے جسے پچھلے کئی سالوں سے اس موسم میں محسوس کرتا آ رہا ہوں۔ ہوا میں خنکی بھی ہے۔

کشمیر کی طرف سے آنے والے جھونکوں کی مرہون منت صبح سویرے اس سڑک پر ٹریفک غائب ہے اور اس کے ساتھ گاڑیوں کا شور بھی۔ البتہ سڑک کے کنارے لگی ہوئی گھاس میں جمع شدہ پانی سے محفوظ ہونے والے مینڈکوں کی آوازیں اس سناٹے کو توڑ رہی ہیں اور کبھی کبھار سڑک کے کنارے لگے ہوئے درختوں کی گیلی شاخوں پر پناہ لینے والے پرندوں کی چہچہاہٹ بھی۔ یہ اس علاقے کی سب سے خوبصورت سڑک ہے اور میرا اور اس کا ساتھ اب بیس سال پر مشتمل ہے۔ بیس سال پہلے اس سڑک کے دائیں بائیں گھروں کی بہت محدود تعداد تھی۔ خالی پلاٹ سبزے سے ڈھکے رہتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس سڑک پر کوئی ایک بھی خالی پلاٹ نہیں مگر گھروں کے آگے سڑک کے کنارے گھاس اور درخت ضرور باقی ہیں۔

میں اس سڑک پر واک کرنے والا اکیلا شخص ہوں، میری عمر کے لوگ، نوجوان لڑکے، لڑکیاں، ادھیڑ عمر عورتیں، والدین کے ساتھ دس بارہ سال کے بچے وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی میرے پاس سے گزرتا جاتا ہے۔

پورا سال میں اس سڑک پر بڑی خاموشی کے ساتھ چیزوں پر غور کیے گزرتا رہتا ہوں مگر سال میں ایک دن نوسٹلجیا کا دن ہوتا ہے۔ اس دن

میں اس سڑک سے گزرتے ہوئے ماضی کے علاوہ اور کسی چیز کے بارے میں نہیں سوچتا اور وہ آج کا دن ہوتا ہے، پندرہ اگست... 54 سال پہلے اس تاریخ کو میں نے اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ لفظ خاندان شاید میں جذبات میں آ کر استعمال کر گیا۔ میرے ساتھ صرف میرا باپ تھا۔ سینتالیس سال کا ایک دکھ بھرا، ادھ موا قافل جس قافلے میں میں پاکستان آیا تھا اس میں کم از کم چھ قافل تھے۔ باقی کے لوگ کیا تھے یہ میں نہیں جانتا۔

سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کا پہلا گروپ میرے پاس سے گزرنے والا ہے۔ ان کی آوازیں میرے کانوں میں پڑ رہی ہیں۔ "2025ء تک پاکستان تقسیم ہو جائے گا پچھلے تین سالوں سے امریکن تھنک ٹینک یہی رپورٹ دے رہے ہیں اور ان کے اندازے صحیح ثابت ہوتے ہیں۔"

"2025ء تو بہت دور ہے، جس طرح کے حالات ہیں یہ کام تو اس سے پہلے ہی ہو جائے گا۔" تین لوگوں کا میرا ہم عمر گروپ اب میرے پاس سے گزر رہا ہے، ہم نے سر کے اشارے اور مسکراہٹوں سے سلام دعا کا تبادلہ کیا اور ایک دوسرے کے پاس سے گزر گئے۔

"2025ء میں پاکستان ٹوٹ جائے گا۔"

کیانی صاحب کا جملہ میرے ذہن میں اٹک گیا ہے۔

میں چودہ سال کا تھا جب میں اپنے باپ کے ساتھ پاکستان آیا، ہندوستان کی تقسیم کے بعد میرے باپ کا تعلق پٹیالہ سے تھا۔ وہ زمیندار تھا، تین بہنوں اور دو بھائیوں پر مشتمل ہمارا گھرانہ اس علاقے کے بہت کم مسلمان گھرانوں میں سے ایک تھا۔ ہم لوگ وہاں بڑے سکون کی زندگی گزار رہے تھے۔ تحریک پاکستان کا آغاز ہونے کے بعد بھی ہم لوگوں کو کوئی زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ جس گاؤں میں ہم تھے وہاں کی اکثریت ان پڑھ لوگوں پر مشتمل تھی۔ انہیں ملکی سیاست کے بارے میں زیادہ معلومات تھیں نہ دلچسپی۔ لیکن آہستہ آہستہ تحریک پاکستان میں شدت کے ساتھ ہی چوپال میں شام کو سیاست اور جناح کا یہ مطالبہ زیر بحث رہنے لگا میرا باپ بھی ان مسلمانوں میں شامل تھا جو اس مطالبے کو ایک حماقت سمجھتے تھے۔

"یعنی اپنی ساری زمینیں چھوڑ کر میں پاکستان چلا جاؤں کیونکہ وہ ملک مسلمانوں کے لیے ہے۔ جناح کا دماغ خراب ہے۔ کوئی اپنی مٹی چھوڑ کر جاتا ہے۔ کوئی اپنا گھر بار اور زمینیں چھوڑ کر صرف مذہب کے لیے کہیں چل پڑے۔"

مجھے یاد ہے میرا باپ کئی سال یہی بات رات کو گھر میں ماں کے سامنے دہرایا کرتا تھا اور گھر میں موجود سب لوگ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ جب زندگی سکون سے گزر رہی ہو تو پھر اس طرح کے مطالبات حماقت کے علاوہ کچھ بھی نہیں لگتے۔

میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور میرا بھائی سب سے بڑا تھا تینوں بہنیں دونوں کے درمیان آئی تھیں۔

گاؤں میں جب بھی مسلم لیگ والے مسلم لیگ کے لئے کنویسنگ کرنے کے لیے آئے، میرے باپ نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح ان کا مذاق اڑایا۔

"تم لوگوں کو ووٹ دیں؟ کیوں ووٹ دیں، بٹوارہ کرنا چاہتے ہو تم لوگ مصیبتیں بڑھانا چاہتے ہو ہماری۔ کانگریس ہے ہماری بات سنتے

والی۔ ہمارے لیے وہی کافی ہے۔“

میرے باپ نے ہر دفعہ لیگیوں کو اسی طرح دھتکارا۔ کئی بار لیگیوں کے گھر گھر جا کر عوام رابطہ مہم کے دوران میرے باپ نے گھر کا دروازہ ہی نہیں کھولا۔ وہ لوگ دروازہ بجاتے تھک کر اگلے گھر چلے جاتے۔

میرے باپ کی سوچ میں تب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی جب اس نے میرے بڑے بھائی کو ہائی اسکول کے بعد آگے تعلیم کے لیے جالندھر بھجوایا۔ گھر میں صرف میں اور میرا بھائی ہی تھے جنہیں تعلیم دلوائی جا رہی تھی۔ میری بہنوں کو تعلیم نہیں دلوائی گئی۔ اس علاقے میں عورتوں کو تعلیم دلوانے کا رواج نہیں تھا اور پھر مسلمان عورتوں کے لیے تو تعلیم شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتی تھی۔ میری ماں اور بہنیں گھر کے اندر بند رہنے والی عورتیں تھیں۔ ماں کبھی کبھار باپ کے ساتھ کھیت پر چلی جاتی مگر بہنوں نے یہ کوئی کام نہیں کیا۔ میرا باپ ویسے بھی ایک خوشحال زمیندار تھا جسے گھر کی عورتوں کو کھیتوں پر کام کروانے کی احتیاج نہیں تھی۔

شہر میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی میرے بڑے بھائی کی سوچ میں تبدیلی آنا شروع ہوگئی۔ اب وہ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا تو مسلم لیگ کی بات کرتا، جناح کے گن گاتا، مسلمانوں کے حقوق پر بولتا۔ دو قومی نظریہ کے حق میں دلیلیں دیتا۔ وہ اپنے کالج کے بہت سے دوسرے مسلمان طلبہ کے ساتھ جناح کی تقریریں سننے جایا کرتا تھا اور شاید یہ Metamorphosis (کایا پلٹ) وہیں ہوا تھا۔

”ان کی آواز میں جادو ہے، وہ بات کرتے ہیں تو ہندو لیڈروں کو لرزا دیتے ہیں، ان کی دلیلوں کے پرخچے اڑا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ لوگ تو گھروں کے اندر رہتے ہیں، آپ کو کیا پتا شہروں میں انگریز اور ہندو مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ آج ہندو انگریز کے پالتو کتے کا کام کر رہا ہے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو انگریز کی جگہ لے لے گا اور مسلمان ہندو کی اور کم از کم میں تو کسی پالتو کتے کا کردار ادا کرنے کو تیار نہیں۔“

میرا بڑا بھائی مظفر چولہے کے پاس چوکی پر بیٹھ کر روٹی کھاتا اور ساتھ بولتا جاتا۔ میری تینوں بہنیں اور ماں اس کے گرد بیٹھے اسے مرعوب انداز میں دیکھتے رہتے۔ میری بڑی بہن شکیلہ اسے پورا وقت پنکھا جھلتی رہتی۔ ماں گرم گرم روٹیاں اس کے سامنے تیار کر کر رکھتی جاتی۔ منجھلی بہن صغریٰ سالن کم ہوتے ہی کٹورہ بھر دیتی۔ چھوٹی بہن مسلسل پانی کا گلاس دیکھتی رہتی کہ وہ خالی ہو تو اسے برق رفتاری سے بھرے اور میں میں صرف اس کی باتیں، اس کی آواز کا اتار چڑھاؤ، اس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھتا رہتا۔ جناح کون تھا؟ مسلم لیگ کیا کام کر رہی تھی؟ دو قومی نظریہ کیا تھا؟ اور پاکستان کیا تھا؟ یہ ہم سب نے مظفر سے جانا تھا۔

وہ ہر بار نئی خبروں کے ساتھ واپس آتا۔ ہر بار اس کی آواز میں پہلے سے زیادہ جوش ہوتا۔ آنکھوں میں پہلے سے زیادہ چمک ہوتی، چہرے پر پہلے سے زیادہ سرخی ہوتی اور جھولی میں پہلے سے زیادہ خواب ہوتے۔

میرا باپ گھر کا واحد شخص تھا جو مظفر کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اسے گھر میں سب سے زیادہ مظفر سے محبت تھی یہی وجہ تھی کہ وہ اسے ڈانٹتا نہیں تھا مگر اس کی ہر بات کے جواب میں وہ کہتا۔

”تم اس شخص کی تقریروں کی بات کرتے ہو جسے کافر قرار دیا جا چکا ہے۔ کوئی مولوی اسے مسلمان ماننے کو تیار نہیں، سب کہہ رہے ہیں

جناح پاگل ہے، کافر ہے، مسلمانوں میں تفرقہ پھیلا رہا ہے۔ میں تو ان لوگوں کی بات سنوں گا اور اسی پر عمل کروں گا، جناح کی نہیں۔"

میرے باپ کی ایک ہی رٹ ہوتی، چوپال میں سب سیاست پر ہی بات ہوتی تھی۔ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں بحثیں ہوتیں، مسلم لیگ اور کانگریس کے بارے میں بات ہوتی۔ گاندھی، نہرو، مولانا عبدالکلام آزاد اور جناح، جوہر اور لیاقت علی خان کا موازنہ کیا جاتا۔ مسلم لیگ اور اس کے لیڈر کو گالیاں دی جاتیں میرا باپ بھی انہی مسلمانوں میں شامل ہوتا جو اسے گالیاں دیا کرتے تھے۔

1940ء کا عشرہ چل رہا تھا۔ میری بڑی بہن کی منگنی میرے ماموں زاد کے ساتھ ہو چکی تھی۔ کچھ عرصہ تک شادی ہونے والی تھی۔ مگر پھر میرے ماموں زاد نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، شادی ملتوی ہو گئی۔ طے یہ پایا کہ وہ تعلیم مکمل کرے پھر شادی کی جائے گی۔

ان ہی دنوں پنجاب کے کچھ علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر قتل و غارت کی گئی، چوپال میں یہ خبریں بھی پہنچتیں۔

"ہاں تو جو لوگ غلط کام کرتے ہیں، ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ کیوں مسلم لیگ کے گماشتے بنے پھرتے ہیں۔ نہ یہ مشتعل کرنے والے کام کریں نہ مارے جائیں۔" سکھ پنچ نے ان فسادات پر چوپال میں بیٹھ کر یہ تبصرہ کیا۔

"مگر اس طرح پورے کے پورے گھر کو جلا دینا اور خاندان قتل کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔ قتل تو نہیں کرنا چاہئے۔ وہ جو بات کہتے ہیں سن لیں اور ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیں۔ لیکن مار دینا، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔"

پہلی بار میرے باپ نے چوپال میں بیٹھ کر ایسی بات کہی۔

"کیوں انصاف نہیں ہے، یہ فسادی لوگ ہیں ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔ بٹوارہ کرنا چاہتے ہیں یہ گھر میں دیوار اٹھا دینا چاہتے ہیں...... ٹھیک کیا اگر ایسوں کو مارا۔"

چوپال میں بیٹھے ہوئے ایک ہندو نے کہا اور وہاں بیٹھے سب لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میرا باپ خاموش ہو گیا۔

1945ء کا سال شروع ہو چکا تھا۔ 1945ء اور 1946ء کے دسمبر جنوری میں انتخابات منعقد ہوئے اور یہ وہ انتخابات تھے جن میں میرے بھائی مظفر نے مسلم لیگ کے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا کام کرتے ہوئے مسلم لیگ کے امیدواروں کی کنویسنگ کی۔ وہ اپنے علاقے سے انتخاب لڑنے والے مسلم کے امیدواروں کے لیے علاقے کے تمام مسلمانوں کے گھر جاتا رہا اور وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں کی نظروں میں آ گیا۔

چوپال میں پہلی بار میرے باپ کو اس کے بیٹے کی سرگرمیوں پر سرزنش کی گئی۔ میرا باپ خاموش رہا۔ وہ کیا کہہ سکتا تھا، الزامات سچ تھے۔

اس رات گھر آ کر اس نے پہلی بار میرے بھائی کو ڈانٹا۔ "نہیں ابا یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اس بار گھر نہیں بیٹھ سکتا۔ اس بار اگر مسلم لیگ کے ساتھ الیکشنز میں وہ سب کچھ ہوا جو پچھلے الیکشنز میں ہوا تھا اور وہ اتنی بری طرح ہاری جس طرح پچھلی بار ہاری تھی تو ہم سب کچھ ہار جائیں گے۔ انگریز ہمیں ہندوؤں کے حوالے کر کے چلے جائیں گے، اور مجھ کو ان کا کتا نہیں بننا۔ اس بار اگر ہم نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو پھر اگلے کئی سو سال غلامی گزاریں گے اور اس بار غلامی پہلے سے زیادہ بدتر ہو گی۔"

میں نے زندگی میں کبھی اپنے بھائی کو اتنی بلند آواز میں اپنے باپ سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا، مگر اس رات وہ بولتا رہا۔ میرے باپ کی

کوئی دلیل اسے قائل نہیں کر سکی۔ جمعیت علمائے ہند کے بیانات کے حوالے بھی اسے متاثر نہیں کر سکے۔

"جو لوگ آج جناح کو کافر کہتے ہیں، وہ کل جناح کا ہاتھ چوما کریں گے اور اس کا مزار بنا کر اس پر فاتحہ پڑھا کریں گے۔ جو لوگ آج پاکستان کے مطالبے کو ذہنی فتور کہتے ہیں اور اسے گالیاں دیتے ہیں، وہ کل اسی پاکستان میں پناہ لینے کے لیے بھاگیں گے۔ جناح کافر نہیں ہے وہ پریکٹیکل مسلمان ہے۔ مولویوں کی طرح دین کی بات نہیں کرتا۔ دین پر عمل کرتا ہے۔ یہ وہ مولوی ہیں جو پچھلے سو سال میں ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی سے آزاد نہیں کروا سکے اور اب جو آزادی کی بات کر رہا ہے وہ شخص ان کو کافر نظر آتا ہے۔ یہ لوگ دستاریں اور چوغے پہن کر بھی میرے لیے اگر آزادی نہیں لا سکے تو مجھے اس شخص کے پیچھے کھڑے ہونے دیں جو پینٹ کوٹ پہن کر اور سگار پی کر مجھے وہ زمین دلا دے گا، جہاں میں مسجد میں بلند آواز میں اذان دوں تو میرا سر کاٹنے کے لیے ہندو اندر نہ آ جائیں۔"

میرا باپ بول نہیں سکا، وہ اس کے بعد کبھی بھی میرے بھائی کے سامنے بول نہیں سکا۔

مسلم لیگ نے 1945ء اور 1946ء کے انتخابات میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اور وہ مسلمانوں کی تقریباً تمام سیٹیں جیت گئی۔

کانگریس کے حامی مسلمان امیدوار ہمارے علاقے میں بری طرح ہارے۔

الیکشنز میں جیت کے بعد مسلم لیگ کے مطالبے میں اور بھی شدت آ گئی۔ برٹش حکومت اب مسلم لیگ کو پہلے کی طرح نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

چوپال میں میرے باپ کے لیے ناپسندیدگی اور بڑھ گئی۔ میرے بھائی کے خلاف باتیں کی جاتیں، میرا باپ اگر بڑا زمیندار نہ ہوتا تو شاید اب تک اسے چوپال سے نکال دیا جاتا مگر اب بھی وہ ایک طرح کے سوشل بائیکاٹ کا شکار تھا حالانکہ وہ اب بھی کانگریس کی بات کرتا تھا اور اس نے الیکشن میں کانگریس کے حامی امیدوار کو ہی ووٹ دیا تھا۔ اس کے باوجود چوپال میں کوئی بھی اس سے خوش نہیں تھا۔

3/جون 1947ء کو تقسیم ہند کا اعلان کر دیا گیا۔ میرا بھائی اس خبر پر خوشی سے پاگل ہو کر گھر آیا تھا۔ میرا باپ ہمیشہ کی طرح ناخوش تھا۔

"اب ہم پاکستان چلے جائیں گے۔ وہاں مغربی پنجاب میں رہیں گے۔ آپ لوگ انتظامات شروع کر دیں۔" اس نے میرے باپ سے کہا۔

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہاں میری زمینیں اور گھر بار ہے میں کوئی احمق ہوں جو انہیں چھوڑ جاؤں۔ پھر یہاں ہمیں تکلیف کیا ہے۔"

میرے باپ نے ہمیشہ والا جواب دیا۔

"ہم وہاں کلیم داخل کروائیں تو زمینیں اور گھر ہمیں وہاں بھی الاٹ ہو جائے گا۔" میرے بھائی نے باپ کو سمجھایا مگر وہ رضامند نہیں ہوا۔

"ٹھیک ہے آپ مت جائیں مگر میں پاکستان میں ہی رہوں گا۔" میرے بھائی نے اعلان کیا میرے باپ نے پھر بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرے۔

تیسرے دن میرے بھائی کو واپس شہر جانا تھا۔ میرے باپ نے اس سے کہا کہ وہ اگلے دن میری ماں اور بڑی بہن کو ساتھ والے گاؤں میں چچا کے گھر چھوڑ آئے۔ میری چچا زاد کی شادی ہونے والی تھی اور میری ماں بڑی بہن کے ساتھ وہاں جاتی پھر اسے رہنے کے لیے چھوڑ کر کسی دن

بھائی کے ساتھ واپس آجاتی۔

وہ تینوں چچا کے گھر کبھی نہیں پہنچ سکے۔ گاؤں کے باہر جانے والے رستے پر میری ماں اور بھائی کو بڑی بے رحمی کے ساتھ ذبح کر دیا گیا۔ میرے بھائی کے جسم کے کئی ٹکڑے کر کے وہاں پھینک گئے ہاں البتہ میری ماں پر رحم کیا گیا، اس کی صرف گردن کاٹی گئی جسے ایک درخت پر لٹکا دیا گیا تھا۔ میری بڑی بہن شکیلہ کا اس دن کچھ پتا نہیں چلا البتہ تین چار دن بعد گاؤں کے قریبی جنگل میں اس کی بے لباس لاش کٹی پھٹی حالت میں ملی تھی۔ اسے صرف جنگلی جانوروں نے نہیں ادھیڑا تھا انسانی جانوروں نے بھی بھنبھوڑا تھا۔

* * *

سڑک پر چلتے ہوئے مجھے ٹھوکر لگی۔ میں نے بے اختیار خود کو سنبھالا اور آنکھوں پر لگائی ہوئی عینک کو ٹھیک کیا۔ اب ہلکی ہلکی ہوا کچھ تیز ہو گئی ہے، بادل پہلے سے زیادہ گھنے ہو گئے ہیں۔ سامنے سڑک پر دو ٹین ایجرز جاگنگ کرتے ہوئے آ رہے ہیں۔ ٹی شرٹس اور شارٹس میں ملبوس۔ میں ان دونوں کو بھی پہچانتا ہوں، وہ روز مجھے تقریباً یہیں ملتے ہیں۔ پچھلی رات کے کسی نہ کسی انڈین پروگرام یا انڈین مووی اسٹار کو ڈسکس کرتے۔ آج بھی ان کا موضوع یہی ہے۔ میں ان کی آوازیں سن رہا ہوں۔ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ۔

”اے آر رحمان یار کیا کمال کرتا ہے یہ بندہ، رات کو وندے ماترم لگا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا دل پر بیٹ پڑ رہی ہے۔ سارا دن پاکستانی چینلز پر پروپیگنڈہ سنتا رہا۔ وہی بکواس ... وہی گانے۔ یہ لوگ لبرل ہونا نہیں چاہتے۔ چاہتے ہی نہیں کہ ہمارے اندر سے یہ Prejudice (تعصب) ختم ہو ہر چیز ہماری اور ان کی کامن ہے حتیٰ کہ آزادی کے دن بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ پھر بھی یہ چاہتے ہیں ہم ہر وقت ہاتھ میں تلوار پکڑے رکھیں۔ میں تو سمجھتا ہوں

“Across the borders we are one”

اس کی بات جاری تھی مگر وہ دونوں میرے پاس سے گزر چکے تھے، میں اب ان کی آواز نہیں سن سکتا مگر اس کا جملہ ”Across the borders we are one“ اب بھی فضا میں بازگشت بن کر پھر رہا ہے۔ سب کچھ کامن ہے، ہر چیز ایک جیسی ہے۔

Prejudice (تعصب) پروپیگنڈہ بکواس میں نے اپنے قدم تیز کر دیے۔

* * *

میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ میرے باپ نے اتنے بڑے حادثے کے بعد اپنا ذہنی توازن کیوں نہیں کھویا مظفر سے زیادہ اسے کسی سے محبت نہیں تھی۔ میں نے خود نہیں دیکھا مگر دیکھنے والے کہتے ہیں میرے باپ نے میرے بھائی کی لاش کے تمام ٹکڑے خود اکٹھے کیے تھے، برستی آنکھوں کے ساتھ کسی چیخ و پکار کے بغیر۔ اس نے میرے بھائی کا پورا جسم اکٹھا کیا، وہ ہر چکر کے بعد جسم کے ٹکڑے دوبارہ گنتا پھر جو ٹکڑے کم ہوتے ان کے نام دہراتا۔ دائیں ٹانگ ناک بایاں کان بائیں ہاتھ پیر کا انگوٹھا دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں
ہاتھ کی دو انگلیاں وہ آدھا گھنٹہ ڈھونڈتا رہا۔ جب وہ مل گئیں تو اسے جیسے قرار آ گیا۔ اب اس کے بیٹے کا جسم نامکمل نہیں رہا تھا۔ وہ جسم کا ہر

ٹکڑا اٹھا کر اس پر لگی ہوئی گرد اور مٹی صاف کر دیتا اگرچہ وہ خون خشک نہیں کر پاتا تھا مگر وہ سارے تنکے اور مٹی کو ضرور صاف کر دیتا۔ اس کے کندھے پر لٹکا ہوا کپڑا اس خون آلود مٹی اور تنکوں سے بھر گیا تھا۔ میرے بھائی کی عمر اس وقت صرف بیس سال تھی، پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ شریف اور ہر ایک کی عزت کرنے والا تھا۔ اسے کبھی کسی سے جھگڑتے نہیں دیکھا تھا۔ مسلم لیگ کے لیے کام کرنے کے علاوہ اس نے زندگی میں کوئی جرم نہیں کیا تھا اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ کم از کم اس زمانے میں، کسی بے رحمی کے ساتھ قتل ہونے کے لیے صرف دو چیزیں کافی تھیں۔ مسلمان ہونا اور مسلم لیگ کا حامی ہونا، اور بدقسمتی سے میرے بھائی میں دونوں خصوصیات تھیں۔

میرے بھائی کے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرنے کے بعد میرے باپ نے درخت سے میری ماں کا سر اتارا تھا۔ پھر وہ دونوں لاشیں گھر لے آیا۔ میں اور میری دونوں بہنیں سکتے میں آ گئے تھے۔ اگرچہ میرے باپ نے ہم تینوں کو وہ لاشیں دیکھنے نہیں دیں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ ہم تینوں کو خوف اور صدمے کے مارے بچھ میں اس وقت چودہ سال کا تھا، میری چھوٹی بہن ساڑھے پندرہ سال کی تھی اور منجھلی بہن سترہ سال کی۔

بھائی کی لاش کو میرے باپ نے خود غسل دیا۔ غسل دینے کے بعد اس نے ایک سفید چادر پر اس کے جسم کے ٹکڑے رکھے اور اس کے اوپر دوسری سفید چادر ڈال کر دونوں چادروں کو چاروں جانب سے سی دیا۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی سوئی ہاتھ میں نہیں لیتے دیکھا، ٹانکے کیسے لگاتے ہیں، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ بہر حال اس دن ان چادروں کو اس نے خود ہی سیا تھا۔ کیسے سیا ہوگا۔ میں نہیں جانتا کیونکہ اس نے یہ کام اکیلے کمرے میں بند ہو کر کیا تھا۔ جب کمرے کا دروازہ کھلا تو ہم نے صرف وہ سفید بوری سی دیکھی جو اب بھی جگہ جگہ سے خون سے تر ہو رہی تھی۔

اپنی اڑسٹھ سالہ زندگی میں، میں نے آج تک کسی کو ویسا کفن پہنے نہیں دیکھا۔ میری دونوں بہنیں زار و قطار رو رہی تھیں مگر میں میں خوف زدہ تھا یہ سب کیوں ہوا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ کس نے کیا تھا؟ ان سے بڑا سوال میرے لیے یہ تھا کہ شکیلہ باجی کہاں ہیں؟

میرے اس سوال کا جواب چوتھے دن مل گیا، جب میرا باپ جنگل سے ان کی لاش لایا تھا۔ ہم نے ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھا شاید وہ بھی دیکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

”تمہیں منع کیا تھا کہ اپنے بیٹے کو ایسے کام مت کرنے دو۔ تم نے بات نہیں مانی، اب ہم تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ تم تو جانتے ہو جوان خون گرم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو بڑا غصہ تھا تمہارے بیٹے پر جوش میں کر بیٹھے یہ سب کچھ اب صحیح پتا بھی نہیں ہے کہ کس کس نے حصہ لیا اس کام میں اس لیے پولیس کو کیا بتاتے۔ تم بس بھول جاؤ یہ سب کچھ ہمیں بڑا دکھ ہے جو کچھ تمہارے گھر والوں کے ساتھ ہوا ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ غلطی تمہارے بیٹے ہی کی ہے جس نے ایک غلط کام کی ابتدا کی۔“

گاؤں کے سرپنچ سردار جوگندر سنگھ نے میرے باپ کی داد رسی ان الفاظ میں کی تھی۔

”غلط کام“ شاید میرے باپ نے پہلی بار وہاں بیٹھ کر غلط کام کی تعریف کے بارے میں سوچا ہوگا اور شاید اس دن ہی پہلی بار گھر آتے ہوئے اس نے راستے میں کھڑے ہندو اور سکھ لڑکوں کو دیکھا ہوگا۔ ان کے قہقہوں پر غور کیا ہوگا اور پھر شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی ہوگی کہ ان میں سے کس نے اس کی بیوی کی گردن کاٹی۔ کتنوں نے اس کے بیٹے کے ٹکڑے کیے اور کس کس نے اس کی بیٹی بہر حال وہ گھر آ گیا تھا،

خاموشی اور بے بسی کے ساتھ...... جھکے ہوئے کندھوں اور خالی آنکھوں کے ساتھ۔۔ خاموش زبان اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ۔۔ پھر اس دن کے بعد وہ دوبارہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا نہ ہی ہم تینوں میں سے کوئی کہیں گیا۔

وہ پنجاب کی تقسیم کا انتظار کر رہا تھا۔ منتظر تھا کہ اسے یہ پتا چل جائے کہ اس کا علاقہ پاکستانی پنجاب میں شامل ہوگا یا ہندوستانی پنجاب میں۔

پھر یہ پتا چل گیا کہ ہمارا علاقہ پاکستان کے ساتھ شامل نہیں ہوگا۔

"ہم لوگ پاکستان جائیں گے" ایک رات میرے باپ نے مجھ سے کہا۔ تب تک ساتھ والے دونوں گاؤں میں مسلمانوں کے گھر لوٹے جا چکے تھے اور ہمارے گاؤں کے مسلمان ہجرت کی تیاریوں میں تھے۔

"تم اور میں۔" میں اپنے باپ کی بات پر حیران رہ گیا۔ "اور صغریٰ اور سلمیٰ وہ نہیں جائیں گی؟" میں نے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔

"نہیں۔" مجھے خوف آنے لگا۔ "آپ انہیں یہاں چھوڑ جائیں گے؟"

"نہیں..."

میں الجھ گیا۔

"میں... میں انہیں مار دوں گا۔"

میں بول نہیں سکا۔ چودہ سال کا ایک بچہ یہ سن کر کیا بول سکتا ہے کہ اس کا باپ اس کی دونوں بڑی بہنوں کو قتل کرنے والا ہے۔

"میں نہیں ماروں گا تو کوئی اور مار دے گا" وہ اب رو رہا تھا۔

میں پوری رات سو نہیں سکا۔ مجھے لگا کہ میں سوؤں گا اور میرا باپ میری بہنوں کو قتل کر دے گا۔ میرے باپ نے اس رات میری بہنوں کو قتل نہیں کیا۔ یہ کام اس نے اگلی رات کیا۔

* * *

مجھے ہلکی ہلکی پھوار اپنے جسم پر گرتی محسوس ہوئی۔ بارش شروع ہو چکی ہے۔ میں جانتا ہوں آہستہ آہستہ برسات کی یہ بارش تیز ہو جائے گی مگر مجھے اس سے کوئی خوف نہیں آ رہا۔ اس سڑک پر چلنے والے سب لوگ ہی بارش سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ سامنے سے اب دو عورتیں آ رہی ہیں، شاید وہ اب واپس گھروں کو جا رہی ہیں۔ میں ان کو بھی پہچانتا ہوں۔

"اس ملک میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اصلاح نے تو کینیڈا امیگریشن کے لئے اپلائی کیا ہوا ہے۔ بس چند ہفتوں تک سارا کام ہو جائے گا پھر ہم سب وہیں جا کر سیٹل ہو جائیں گے۔ پاکستان میں تو اب مجبوری میں ہی رہا جا سکتا ہے۔ میرا سارا میکہ اور سسرال امریکہ اور کینیڈا شفٹ ہو چکا ہے۔ بس اصلاح تھے جو یہاں اٹکے ہوئے تھے۔ ان کی حب الوطنی ختم کرتے کرتے خاصا وقت لگ گیا مجھے" وہ ہنسی۔

"چلو دیر آید درست آید" دوسری عورت نے بھی قہقہہ لگایا۔ وہ دونوں بھی میرے قریب سے گزر گئی ہیں۔

"اس ملک میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس عورت کا جملہ میرے کانوں میں گونج رہا ہے، وہ عورت وہ جملہ کہنے والی واحد عورت نہیں ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ جملہ بہت سے لوگوں سے سن رہا ہوں۔

"کسی بھی ملک میں کچھ نہیں ہوتا۔ ہر ملک زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے اصل چیز اس زمین کے ٹکڑے پر بسنے والے لوگوں میں ہوتی ہے۔ کمی ہمیشہ ان لوگوں میں ہوتی ہے اور یہی خامی اس ملک کا تعارف بن جاتی ہے۔ ایسا سائن بورڈ جسے پھر وہ ملک اٹھائے پھرتا ہے۔"

میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ یہ بات مجھے کس نے کہی تھی اور مجھے یاد آ گیا کہ یہ بات کس نے کہی تھی۔

* * *

میرے باپ نے اگلے دن صحن کے ایک کونے میں اس چھری کی دھار کو تیز کیا جس سے ہر سال بکرے ذبح کیے جاتے تھے۔ وہ کندھے پر پڑے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو صاف کرتا جاتا اور پتھر پر چھری کو رگڑتا جاتا۔ میں ایک دفعہ اسے چھری ہاتھ میں لیے دیکھ کر کمرے میں آ گیا اور پھر باہر نہیں گیا۔ چارپائی پر بیٹھے میں اپنی دونوں بڑی بہنوں کو کمرے میں آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

اس دن میں نے ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے چہروں سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ میں جانتا تھا زندگی میں دوبارہ کبھی میں ان چہروں کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ وہ رات کو سو گئیں تو میرے باپ نے مجھے کمرے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ میں کپکپاتے ہوئے باہر آ گیا، کچھ دیر بعد میرا باپ بھی باہر آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں چھری تھی مگر چھری پر خون نہیں تھا۔ میں خشک لبوں کے ساتھ باپ کو دیکھتا رہا۔ "میں انہیں مار نہیں سکا۔ میں، اپنے ہاتھ سے انہیں مار نہیں سکتا۔ میں گھر کو جلا دیتا ہوں وہ اس کے ساتھ ہی جل جائیں گی۔" میرے باپ نے کانپتی آواز میں کہا۔

اس نے ان کی چارپائیوں کے گرد مٹی کا تیل چھڑک دیا اور پھر آگ لگا کر دروازہ بند کر دیا۔ صحن میں کھڑے ہو کر میں نے اپنی بہنوں کی چیخیں سنی تھیں یا پھر شاید چتا جلتے دیکھی تھی ہم لوگ تب تک وہاں کھڑے رہے جب تک آگ کے شعلے پوری طرح بھڑکنے نہیں لگے پھر میں صحن میں بیٹھ کر بلند آواز میں رونے لگا۔ ان بہنوں نے مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا، میں نے ان کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ اب ان کی چیخیں ان کی چیخیں

"یہ جلدی مر جائیں، جلدی مر جائیں، جلدی مر جائیں۔" میں زمین پر بیٹھا بلند آواز میں دعا کر رہا تھا پھر پھر آہستہ آہستہ آگ نے پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اور چیخیں دم توڑ گئیں۔

تب میرے باپ نے مجھے اور اس گٹھڑی کو لیا جو اس نے پہلے ہی تیار کر کے رکھی تھی اور ہم راتوں رات وہ جگہ چھوڑ گئے ہم دونوں ایک گھوڑے پر سوار تھے جسے میرا باپ دوڑا رہا تھا اور میں اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ فجر کے وقت ہم کسی گاؤں میں داخل ہوئے، جہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے اور ان میں دو چار قاتل بھی تھے۔ ویسے ہی قاتل جیسا میرا باپ تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا وہی جو ہر قافلے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک لمبا سفر طے کر کے ہم جس دن پاکستان میں داخل ہوئے، وہ پندرہ

اگست کا دن تھا اور لاہور کا بارڈر تھا اور تب میرے باپ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی اٹھا کر اس رومال میں رکھی جو وہ ہر وقت کندھے پر لیے رہتا تھا اور جس سے اُس نے میرے بھائی کے جسم سے گرد صاف کی تھی اور پھر اس کی ایک پوٹلی سی بنا کر اس نے اپنی جیب میں رکھ لی۔ اور اور اس کے بعد میرا باپ دھاڑیں مار مار کر زمین سے سر ٹکرا ٹکرا کر روتا رہا۔

میں نے اسے بھائی، ماں اور شکیلہ باجی کے ساتھ ہونے والے حادثے پر بھی اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔ تب وہ صرف آنسو بہاتا رہا تھا۔ مگر اس دن وہ بلند آواز میں چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ وہاں میرے علاوہ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہاں اس کے علاوہ بھی اور بہت سے رونے والے تھے۔ صرف میں تھا جو زمین پر بیٹھ گیلی آنکھ کے ساتھ باپ کی دیوانگی دیکھتا رہا۔ اب اتنے سالوں بعد میں سوچتا ہوں کہ وہ کیوں رویا تھا۔ کیا اسے اپنا خاندان یاد آیا تھا۔ زمینیں اور گھر بار یاد آ رہا تھا یا پھر

میں نے اس کے بعد اپنے باپ کو کبھی روتے نہیں دیکھا۔ بڑی سے بڑی مصیبت یا تکلیف پر بھی نہیں۔

ہم کیمپ میں رہنے لگے۔ ہم نے کلیم جمع کروایا۔ ہمیں زمین اور گھر الاٹ ہو گیا۔ میرے باپ نے مجھے لاہور پڑھنے کے لیے بھجوا دیا۔ تب تک وہ پچاس کا ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ زمین سے ہونے والی آمدنی کو وہ فلاحی کاموں میں خرچ کرتا رہتا۔ اس کے اپنے سارے شوق اور سرگرمیاں ختم ہو گئی تھیں۔ گھوڑے پالنے کا شوق، مرغے لڑانے کا شوق، میلوں میں جانا، کبوتر پالنا، اس نے سب کو چھوڑ دیا۔ جب تک میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا وہ ایک بار پھر علاقے کا ایک بڑا زمیندار بن چکا تھا۔ رزق کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے خوش قسمت رہا تھا مگر اس بار وہ معمولی سے کپڑے کے لاچے کرتے میں وہ کئی کئی دن گزار دیتا۔ کھیت پر مزارعوں کے ساتھ کام کرتا، ان کے ساتھ ہی کھانا کھا لیتا۔

میرے اور اس کے درمیان کبھی پچھلے واقعات کے بارے میں بات نہیں ہوئی۔ جب تک وہ زندہ رہا اس نے کبھی ماں، بہنوں یا بھائیوں کا نام تک نہیں لیا اور نہ ہی میں نے کبھی لیا۔ ہم دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی بہت کم ہوتی تھی۔ میں لاہور سے گاؤں جاتا وہ میرا حال احوال پوچھتا، میں جواب دیتا، وہ کھانے کا کہتا پھر باہر نکل جاتا۔ جس دن مجھے واپس آنا ہوتا، وہ میرے لیے کچھ چیزیں تیار کروا دیتا، کچھ نوٹ تھماتا اور تانگے پر بٹھا دیتا۔ ہر ماہ لاہور آتا، مجھے ہاسٹل میں ملتا پھر وہی چیزیں کپڑے اور روپے دیتا۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموشی سے ایک دوسرے کے سامنے نظریں جھکائے بیٹھے رہتے پھر وہ چلا جاتا۔

ماسٹرز کے بعد میں نے انگلینڈ مزید تعلیم کے لیے جانے کی خواہش کی، وہ مان گیا۔ جانے سے پہلے اس نے میری شادی کرنے کی خواہش کی، میں مان گیا۔

اس نے مجھ سے میری پسند پوچھی۔ میں ایک گھنٹہ سر جھکائے کسی بھی لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا جو مجھے پسند ہوتی۔ تصور میں کسی لڑکی کی شبیہ نہیں آئی میں نے کہا۔ "کسی بھی تعلیم یافتہ لڑکی سے میری شادی کر دیں۔" چوتھے دن سیمہ بانو سے میرا نکاح ہوا، آٹھویں دن میں انگلینڈ آ گیا دو ماہ کے بعد وہ بھی انگلینڈ آ گئی۔

سیمہ گورنمنٹ کالج لاہور کی تعلیم یافتہ تھی۔ میں بعض دفعہ سوچتا ہوں اگر وہ میری زندگی میں نہ آتی تو کیا ہوتا۔ وہ واقعی میری نصف بہتر

ہے۔ اس نے میری زندگی کے بہت سے خلاؤں کو پر کیا، وہ جتنی اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی اتنی ہی اچھی بہو تھی۔ میرے پی ایچ ڈی کے دوران مجھے اپنے باپ کی بیماری کی اطلاع ملی، میں اپنی تعلیم چھوڑ کر واپس نہیں جا سکتا تھا اور میرا باپ میرے پاس آنے پر تیار نہیں تھا۔ درمیانی راستہ سلیمہ نے نکالا۔ وہ میرے دو سالہ بیٹے کو لے کر لندن سے پنجاب کے اس گاؤں میں چلی گئی، جہاں بجلی تھی نہ ہی صاف پانی۔

اگلے دو سال اس نے وہیں میرے باپ کے ساتھ گزارے۔ دو سال بعد میرے باپ کا انتقال ہو گیا تو وہ میرے ساتھ واپس لندن آ گئی کیونکہ میرا ڈاکٹریٹ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میرے باپ نے مرنے سے پہلے گاؤں میں موجود اپنی ساری زمین مزارعوں میں بانٹ دی۔ اس نے ایسا کرنے سے پہلے مجھ سے اور سلیمہ سے اس کی اجازت لی، مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"یہ آپ کا اور ابو کا معاملہ ہے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں ہے" سلیمہ نے میرے اجازت لینے پر کہا۔

آٹھ سال تک انگلینڈ رہنے کے بعد میں واپس پاکستان آ گیا۔ یہاں آ کر مجھے پنجاب یونیورسٹی میں جاب مل گئی۔ جو کچھ میں انگلینڈ چھوڑ آیا تھا اس کے سامنے یہ جاب اور سہولتیں کچھ بھی نہیں تھیں مگر میں پھر بھی خوش اور مطمئن تھا۔ میں اپنے ملک کو وہ سب کچھ لوٹانے آیا تھا جو اس نے مجھے دیا تھا اور یہاں واپس آنے کے بعد پہلی بار یہ جملہ میں نے اپنے ایک کولیگ کی بیوی سے 1963ء میں سنا جب وہ ہمارے گھر کھانے کی ایک دعوت پر آئے۔ میں چپ چاپ اس عورت کا چہرہ دیکھتا رہا لفظ میرے اندر موم کی طرح پگھل گئے تھے۔

"اس ملک میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی ہوئی اس عورت کو دیکھا جو زرق برق کپڑوں میں ملبوس تھی، جس کے ہاتھوں میں بہت سے زیور تھے۔

اس ڈائننگ ٹیبل کو دیکھا جو کھانے کے بہت سے لوازمات سے بھری ہوئی تھی اور پھر اس عورت کی بھری ہوئی پلیٹ کو دیکھا۔ پھر مجھے دو چادروں میں سیے ہوئے اپنے بھائی کی لاش کے ٹکڑے یاد آئے آگ سے جلتے ہوئے گھر میں اپنی دونوں بہنوں کی چیخیں یاد آئیں۔

مٹی کی وہ پوٹلی یاد آئی جو میرے باپ نے مرنے سے پہلے سلیمہ کو اپنے پاس رکھنے کے لیے دی تھی۔ میری بھوک ختم ہو گئی، میں نے چاولوں سے بھرا ہوا چمچ دھیرے سے پلیٹ میں الٹا دیا۔

"کسی بھی ملک میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہر ملک زمین کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اصل چیز اس زمین کے ٹکڑے پر بسنے والے لوگوں کے اندر ہوتی ہے، خالی ہمیشہ ان لوگوں کے اندر ہوتی ہے، اور یہ خالی اس ملک کا تعارف بن جاتی ہے۔ ایسا سائن بورڈ جسے پھر وہ ملک اٹھائے پھرتا ہے۔"

میں خاموش رہا تھا مگر سلیمہ خاموش نہیں رہی۔ بڑے پرسکون اور ٹھنڈے لہجے میں اس نے اس عورت سے کہا۔ اس بار خاموشی اس عورت پر چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کو مشکور نظروں سے دیکھا جو اب میرے کولیگ کو ایک ڈش سرو کر رہی تھی۔

* * *

میرا باپ دو سال بیمار رہا تھا، اس کی وفات پر میں پاکستان آیا تب اسے دفنایا جا چکا تھا۔ میں نے اس کا آخری چہرہ بھی نہیں دیکھا۔ میں رویا بھی نہیں کئی دن میں خاموش رہا۔ سلیمہ نے کوشش کی کہ وہ مجھ سے میرے باپ کے بارے میں بات کرے مگر میں ہر بار موضوع بدل دیتا۔ پھر

شاید وہ جان گئی کہ میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے دوبارہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

لندن واپس آنے کے کئی ماہ بعد تک میں اسی طرح گم صم رہا۔ باپ کے مرنے کے بعد میرا پورا خاندان مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تنہائی مجھے ہر وقت اپنی لپیٹ میں رکھتا تھا۔

ایک رات میں نے تین بجے سلیمہ کو جگا دیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔

"کیا بات ہے؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں...... تم مجھ سے باتیں کرو۔"

"کیا باتیں؟" وہ حیران ہوئی۔

"کوئی بھی بات کچھ بھی "

"اچھا " وہ مجھے پورے دن کی روداد سنانے لگی۔ میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ شاہد کی شرارتوں کے بارے میں بتاتی رہی، میں سنتا رہا۔ ٹی وی پر آنے والے ایک پروگرام کی تفصیلات سناتی رہی پھر وہ تھک کر خاموش ہو گئی۔

"آپ بھی تو کچھ کہیں۔ " اس نے جیسے شکایت کی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا سر جھکائے میں نے اس سے کہا۔

"ابا نے مرنے سے پہلے تم سے کچھ کہا میرے بارے میں؟" وہ ساکت ہو گئی۔ شاید اسے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ باپ کی وفات کے دس ماہ بعد میں اس سے پوچھ رہا تھا کہ کیا میرے باپ نے میرے بارے میں کچھ کہا تھا۔

"ہاں " اس بار میں سن ہو گیا۔ میں ہمت نہیں کر پایا کہ اسے وہ الفاظ دہرانے کے لیے کہوں میں بنا پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا وہ اٹھ کر وارڈ روب کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر وہ وہاں کوئی چیز تلاش کرتی رہی پھر وہ ایک پیکٹ لے کر میری طرف چلی آئی۔ میرے قریب بیڈ پر بیٹھ کر اس نے پیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک پوٹلی نکال لی۔ میرا سانس رک گیا۔ میں اس کپڑے کو ساری عمر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہی کپڑا تھا جسے میں نے اپنے بھائی اور ماں کی لاشیں گھر لاتے وقت اپنے باپ کے کندھے پر خون سے تر ہوا دیکھا اور جس سے میرے باپ نے میرے بھائی کے جسم سے مٹی اور تنکے صاف کیے تھے اور پاکستان واپس آنے کے بعد اسی میں میرے باپ نے ایک مٹھی مٹی ڈال کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ میں نے اس کے بعد وہ کپڑا اپنے باپ کے کندھے پر کبھی نہیں دیکھا، اور آج اتنے سالوں کے بعد وہ پوٹلی میری بیوی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے وہ پوٹلی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اسے پکڑ لیا۔

"انہوں نے کہا تھا، جمال سے کہنا واپس ضرور آئے۔ میں نے اس مٹی کے رزق سے اس کی پرورش کی ہے۔ اس پر فرض ہے کہ وہ یہ رزق میری مٹی کو لوٹا دے۔" میں گم صم اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔

وہ میرے رونے کی رات تھی۔ اس رات میں رویا تھا اسی طرح جس طرح میرا باپ زمین سے لپٹ کر روتا رہا تھا۔ میں جان گیا تھا، وہ مٹی میرے لیے رکھی گئی تھی۔ میرا باپ جو ساری عمر ہندوستان اور کانگریس کے گن گاتا رہا سردار پٹیل، مولانا ابو الکلام آزاد اور گاندھی کی باتیں

منامن کر چومتا رہا۔ وہ مرنے سے پہلے میرے لیے پاکستان کی مٹی چھوڑ کر گیا تھا شاید اپنے بیٹے کے جسم کے ٹکڑے اکٹھے کرتے ہوئے اسے پہلی بار احساس ہوا ہوگا کہ مذہب کی بنیاد پر کھڑا کیا ہوا دو قومی نظریہ دیوانے کی بڑ نہیں، حقیقت تھی۔ شاید میری ماں کی کٹی ہوئی گردن درخت سے اتارتے ہوئے اسے احساس ہوا ہوگا کہ آزادی کیا ہوتی ہے۔ شاید شکیلہ باجی کی لاش ڈھانپتے ہوئے سے پتا چلا ہوگا کہ ہندو کا پالتو کتا بن جانے کا مطلب کیا ہے، اور شاید میری دونوں بہنوں کو گھر میں جلاتے ہوئے اسے پتا چلا ہوگا کہ آزادی، قربانی مانگتی ہے۔ حاصل کرنے کے لیے بھی اور قائم رکھنے کے لیے بھی۔

ڈاکٹریٹ کے بعد میں نے کچھ عرصہ انگلینڈ میں ایک یونیورسٹی میں پڑھایا اور پھر واپس آ گیا۔ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق، کوئی دوسری سوچ میرے ذہن میں نہیں آئی۔ کوئی پاؤنڈز میرے پیروں میں نہیں لپٹے، گھر اور گاڑیاں میرے خوابوں میں نہیں آئیں اور نہ ہی سلیمہ نے مجھ سے وہاں رکنے کے لیے کہا۔

* * *

پھوار بند ہوگئی ہے، میں نے چند گہرے سانس لے کر اس تازہ ہوا کو اپنے اندر اتارا، میرے قدم ایک بار پھر تیز ہو گئے۔ سڑک پر اب بھی لوگ نظر آ رہے ہیں۔ بارش کے آثار نے کسی کو بھی پریشان نہیں کیا، ظاہر ہے یہ سردیوں کی بارش نہیں ہے۔ اب میرے سامنے عظیم الدین ہاشمی چست چال چلتے ہوئے آ رہے ہیں۔ ان کے پیچھے رائفل ہاتھ میں لیے ان کا گارڈ بھی ہے۔ ان کے ہاتھ میں ایک موبائل ہے جس پر وہ بات کر رہے ہیں۔ ان کا بیٹا یونیورسٹی میں میرا اسٹوڈنٹ رہ چکا ہے۔ وہ دور سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہیں اور سر کے اشارے سے سلام کرتے ہوئے فون پر بات جاری رکھتے ہیں۔ میں بھی سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔ وہ فون پر کسی سے کہہ رہے ہیں۔

”لاء اینڈ آرڈر تو تباہ ہو گیا ہے اس ملک میں، اکیلے نکلنے کی تو ہمت ہی نہیں ہوتی۔ پچھلے، و پی ایس او کے منیجنگ ڈائریکٹر شوکت مرزا کا قتل ہو گیا، ڈیڑھ ہفتہ پہلے صدر صاحب کہہ رہے تھے کہ میں اس ملک کے بارے میں کیا کروں میرا بس نہیں چلتا۔ آپ خود سوچیں اگر صدر یہ کہیں کہ میں شوکت مرزا کی بیوی سے افسوس کرتے ہوئے اسے یہ یقین دہانی بھی نہیں کروا سکا کہ قاتل پکڑے جائیں گے یا نہیں، تو میرا اور آپ کا کیا ہوگا۔ ہم اور آپ تو کس کھیت کی مولی ہیں۔“

وہ اب میرے پاس سے گزر رہے ہیں۔ ”اب اس طرح کے کولڈ بلڈڈ مرڈرز کے بعد اس ملک میں رہنے کو کس کا دل کرتا ہے۔“ وہ میرے پاس سے گزر گئے ہیں۔

پاکستان واپس آنے کے بعد میں یونیورسٹی میں ہی پڑھاتا رہا۔ میرے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ انگلینڈ جیسی سہولتیں میرے پاس نہیں تھیں مگر سلیمہ نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ اس نے بڑے سلیقے اور طریقے سے میرے پانچوں بچوں کی پرورش کی۔ بچے بڑے ہو گئے، ان کی تعلیمی ضروریات بڑھنے لگیں تو اس نے خود بھی ایک اسکول میں جاب کر لی۔ میرے پانچوں بچے تعلیمی میدان میں بہت اچھے تھے۔ بڑے دونوں بیٹے بہت جلد ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ ان دونوں کی پیدائش وہاں ہوئی تھی اور ان کے پاس نیشنیلٹی تھی، وہ ہائی اسکول کے بعد ہی وہاں جا کر کام

کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ سب سے بڑے بیٹے نے لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈگری حاصل کی، دوسرے نے بھی وہیں سے تعلیم حاصل کی۔ بڑے بیٹے کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار تھا اس لیے تعلیم کے دوران ہی اسے اقوام متحدہ کی ایک ایجنسی کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا اور بعد میں وہ مستقل طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ خلیق بھی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن ہی میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرنے لگا۔ بڑی بیٹی ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ان دونوں کے پاس چلی گئی۔ وہاں اس نے سپیشلائزیشن کی۔ چھوٹی بیٹی فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک کالج میں پڑھانے لگی۔ سب سے چھوٹا بیٹا نعمان۔ ہاں وہ پاک فوج میں تھا۔ دو سال پہلے کارگل میں شہید ہو گیا۔

◆

میرا سانس کافی تیز ہو گیا ہے۔ اگر ہوا اتنی ٹھنڈی نہ ہوتی تو اب تک پسینے سے بھیگا ہوتا۔

"تیز چلتے ہوئے جب تک پسینہ نہ آئے آپ سمجھیں آپ کو چلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ یہ سمجھیں آپ نے واک کی ہی نہیں۔" میرے کانوں میں کسی کی آواز ابھری۔ آواز نہیں تھی ہدایت تھی، کس کی تھی؟ میں مسکرایا۔

بڑے بیٹے شاہد نے لندن میں اپنی مرضی سے اپنی ایک پاکستانی کلاس فیلو سے شادی کی، فائقہ سلمان اچھی لڑکی ہے ملنسار مہذب، سمجھدار، خوبصورت، خوش مذاق۔ مگر مادہ پرست۔ ان دونوں کے دو بیٹے ہیں۔ آج کل شاہد اور فائقہ چھوٹے بیٹے زبیر کے ساتھ میرے پاس آئے ہیں۔ چند روز رہنے کے لیے۔ شاہد مستقل طور پر پاکستان آنے کے لیے تیار نہیں ہوا، میرے سمجھانے کے باوجود بھی۔

"یہاں میرا کوئی فیوچر نہیں ہے بابا ! میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں۔ یہ ملک ہر لحاظ سے پیچھے ہے۔ کبھی کبھار آنے کے لیے ٹھیک ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ویسے بھی فائقہ اسی شرط پر مجھ سے شادی پر تیار ہوئی ہے کہ ہم ہمیشہ باہر ہی رہیں گے۔ امریکہ ہو چاہے یورپ کا کوئی بھی ملک مگر پاکستان نہیں۔ جو معیار زندگی ہم چاہتے ہیں، وہ یہ ملک ہمیں دے ہی نہیں سکتا۔"

میرے بڑے بیٹے کی کئی سال پہلے کی صاف گوئی وہ پہلا جھٹکا تھا جو مجھے اور سیمہ کو لگا۔ کئی دن ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔ ہمیں بے یقینی تھی کہ ہمارا بیٹا یہ سب کہہ رہا تھا۔ اس وقت ہمارے تین بچے باہر تھے اور دو ہمارے ساتھ تھے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں کو باہر نہیں بھیجیں گے۔ خوش قسمتی سے میرے دونوں چھوٹے بچوں نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔

میری بڑی بیٹی عالیہ کی منگنی میرے ایک کولیگ کے بیٹے سے ہو چکی تھی وہ بھی وہیں انگلینڈ میں سپیشلائزیشن کے لیے جانے والا تھا اور ہمارا خیال تھا ہم ان دونوں کی جلد ہی شادی کر دیں گے۔ دوسرے بیٹے خلیق سے بات کرنے کے بعد سلیمہ نے اس کی منگنی اپنی بہن کی چھوٹی بیٹی سے کر دی جو ایک کالج میں پڑھا رہی تھی۔ شاید یہ ایک حفاظتی قدم تھا۔ ہمارا خیال تھا یہاں کی لڑکی سے شادی کے بعد وہ مستقل طور پر باہر سیٹل ہونے کا نہیں سوچے گا۔ وہ اسے پاکستان لے آئے گی۔ ایسا نہیں ہوا، صالحہ سے شادی کے کچھ عرصے کے بعد خلیق نے بھی یہی کہا کہ وہ پاکستان سیٹل ہونا نہیں چاہتا۔ اس بار سیمہ نے اپنی بہن کے ذریعے اپنی بہو پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی مگر اس کی بہن نے سلیمہ سے کہا۔

"صالحہ پاکستان میں رہنا نہیں چاہتی یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے زبردستی ان لوگوں کو واپس بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ ان

لوگوں نے پاکستان کی خدمت کا ٹھیکہ تو نہیں اٹھا رکھا اور میرا خیال ہے میری بیٹی سمجھدار ہے، وہ بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ اس کے کچھ خواب ہیں۔۔ پاکستان آخر دے کیا سکتا ہے ان دونوں کو   تم دوبارہ اس سلسلے میں مجھ سے بات نہ کرنا   وہ دونوں میاں بیوی اپنے مستقبل کے بارے میں زیادہ بہتر طریقے سے سوچ سکتے ہیں۔"

سلیمہ بہن کے گھر سے بالکل خاموشی سے واپس آ گئی۔ اگلے دو ہفتے وہ بیمار رہی۔ اس کا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ میں جانتا تھا یہ بخار نہیں تھا، یہ بے بسی اور شرمندگی تھی۔ اس کا خیال تھا وہ اولاد کی اچھی تربیت نہیں کر پائی۔

صدیقہ ہماری چھوٹی بیٹی ہے۔ اس کی شادی ہم نے اس کی مرضی سے کی۔ اس کا ایک کلاس فیلو اعظم تھا جو فزکس میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد اٹامک انرجی کمیشن کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ مالی طور پر وہ کسی بہت امیر کبیر خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا مگر اچھا لڑکا تھا اور پھر صدیقہ کو پسند تھا۔ دونوں بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے۔

بڑی بیٹی عابیہ بھی کچھ عرصہ باہر رہی پھر عبداللہ کے ساتھ شادی کے بعد واپس پاکستان آ گئی۔

چھوٹے بیٹے نعمان نے بھی اپنی پسند سے شادی کی۔ اس کی بیوی کرن شروع سے اس کے ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی۔ دونوں خاندان بہت اچھی طرح ایک دوسرے سے واقف تھے۔

ایف ایس سی کے بعد نعمان آرمی میں چلا گیا اور پھر جب وہ اکیڈمی سے پاس آؤٹ ہوا تو ہم نے ان کی شادی کر دی۔ آرمی میں جانا نعمان کی اپنی خواہش تھی۔ باقی بچوں کی طرح ہم نے اسے بھی اپنی مرضی کا پروفیشن چننے کا اختیار دیا، وہاں میں نے اسے آرمی جوائن کرتے ہوئے مٹی کی وہ پوٹلی بھی دی تھی۔

وہ فوج میں میجر کے طور پر کام کر رہا تھا جب کارگل کی جنگ شروع ہوئی اور وہ ان آفیسرز میں شامل تھا جنہوں نے کارگل آپریشن کے لیے خود کو رضاکارانہ پیش کیا تھا۔ وہ ان فوجیوں میں شامل تھا جو کارگل کی جنگ شروع ہونے سے بہت پہلے سردیوں کے موسم میں ان پہاڑوں پر قبضہ کرنے گئے تھے جنہیں برف باری شروع ہونے سے پہلے ہر سال انڈین فوج چھوڑ کر چلی جاتی تھی۔

"ہم کشمیر کو ہائی لائٹ کرنے کے علاوہ اور کچھ کرنا نہیں چاہتے۔ ان چوٹیوں پر ہم قبضہ کر سکتے ہیں۔ مگر ہم جب تک وہاں رہیں گے دنیا اس علاقے کو دیکھتی رہے گی۔ اس کے بارے میں بات کرے گی۔ ان لوگوں نے اس علاقے میں کئی بار بارڈر کراس کیا ہے کہ اب یہ خود کو سورما سمجھنے لگے ہیں۔ جب ان کا دل چاہے گا، یہ منہ اٹھا کر ادھر گشت کرنے نکل پڑیں گے۔ ایک بار ہم ان کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اب اگلی دفعہ یہ کوشش ان کو کتنی مہنگی پڑے گی۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھے دعا دیں کہ میں شہید ہو جاؤں۔"

جانے سے ایک رات پہلے نعمان نے مجھے یہ سب کچھ کہا تھا۔

"آپ امی اور کرن کو کچھ مت بتائیں۔ میں کرن سے صرف یہ کہہ کر جا رہا ہوں کہ ایکسرسائز پر جا رہا ہوں۔ چند ماہ لگ جائیں گے مگر ہو سکتا ہے میں دوبارہ کبھی نہ آ سکوں۔ کرن میرے فون کا انتظار کرے گی، مگر آپ کسی نہ کسی بہانے سے اسے ٹالتے رہیے گا۔ کبھی کبھار یہ کہہ دیں کہ

آپ نے مجھ سے فون پر بات کی تھی یا اگر وہ گھر سے باہر ہو تو آپ کہہ دیں کہ میں نے فون کیا تھا۔"

میں اسے شہادت کی دعا نہیں دے سکا۔ میں اتنا بہادر باپ نہیں تھا مگر میں نے اسے کامیابی کی دعا دی بعد میں مجھے احساس ہوا شہادت ہی اس کی کامیابی تھی۔

اگلے کئی ماہ گھر سے اس کا رابطہ منقطع رہا اور میں اسی طرح کرن کو بہلاتا رہا۔ سردیاں ختم ہونے کے بعد انڈین آرمی نے دوبارہ ان مورچوں کی طرف جانے کی کوشش کی جن کو وہ سردیوں میں خالی کر آئے تھے اور تب انہیں احساس ہوا کہ وہ مورچے خالی نہیں تھے وہاں پر کچھ لوگ موجود تھے۔ ان کے لوازمات ٹھیک تھے، یہ مجاہدین نہیں ہو سکتے تھے۔ ہزاروں فٹ اونچی برف کی منجمد چوٹیوں کو سخت سردیوں میں سر کرنے والے غیر تربیت یافتہ مجاہدین کیسے ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔ ٹی وی چینلز اور اخبارات نے طوفان اٹھا دیا اور پھر ایک دن میری بہو کرن نے مجھ سے پوچھا۔

"ابو! نعمان کارگل میں ہے نا؟" میں بول نہیں سکا۔

اس نے دوبارہ کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔ فوجیوں کی بیویاں سوالات کرنے کی عادی نہیں ہوتیں یا کم از کم اس طرح کے سوالات۔

"اگر ہندوستان 71ء میں مکتی باہنی کے روپ میں اپنی فوج کے ٹرینڈ گوریلے مشرقی پاکستان بھیج سکتا ہے، اگر وہ 80ء کے عشرے میں سری لنکا میں لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام کے لوگوں کے ساتھ لڑنے کے لیے اپنی فوج کا اسلحہ اور فوجی بھیج سکتا ہے تو پھر پاکستان بھی مجاہدین کے روپ میں اپنے فوجیوں کو بھیج سکتا ہے۔ کمینے اور مکار دشمن سے کمینگی اور مکاری کے ساتھ ہی نپٹا جا سکتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ نعمان وہاں لڑ رہا ہے اور جن لوگوں کے لیے لڑ رہا ہے وہ میرے ملک کا ایک حصہ ہیں۔ لندن میں بیٹھ کر پاؤنڈز سے اکاؤنٹ بھرنے والے تمہارے اور تمہارے شوہر جیسے مادہ پرست اس چیز سے واقف ہو ہی نہیں سکتے۔"

کارگل کی جنگ باقاعدہ شروع ہوتے ہی شاہد اور اس کی بیوی فائقہ نے بھی لندن سے ہمیں فون کیا تھا۔ انہیں نعمان کے بارے میں پتا چل چکا تھا۔ فائقہ نے بات کرتے ہوئے پاکستانی حکومت اور آرمی پر تنقید کی کہ وہ جان بوجھ کر اپنے ریگولرز کو ایک غلط کام کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور میں میں اپنا غصہ ضبط نہیں کر سکا۔ وہ میری باتیں سن کر خاموش ہو گئی۔

جون کے مہینے میں کارگل کے پہاڑوں سے نعمان کی شہادت کی خبر مل گئی۔ صرف خبر، لاش نہیں پہاڑ لاشیں واپس نہیں کیا کرتے۔ وہ وہیں کہیں برف میں دفن ہے یا پھر شاید کسی کھائی میں میں نے اور سیمہ نے صبر کیا۔ ہمارے لیے یہ کام آسان تھا، ہمیں عادت تھی مگر کرن اور اس کے بچوں کے صبر نے ہمیں حیران کیا۔ نعمان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے، جانے سے پہلے وہ انہیں ہمارے پاس ہی چھوڑ کر گیا۔

اسی سال جولائی میں پاکستان کے وزیراعظم امریکہ جا کر وہ معاہدہ کر آئے جس نے میرے جیسے بہت سے لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ کیا ہمارے بیٹوں نے جانیں دیں کہ ان جیسے سیاستدان اپنی کرسیاں بچانے کے لیے اس طرح کے سودے کرتے پھریں۔ میں کئی دن یہی سوچ کر

روتا رہا، مگر کیا اس سب کے بعد پاکستان چھوڑ کر چلا جاتا۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید یہی کرتا۔ میں نے یہ نہیں کیا، کرن اپنی دونوں بیٹیوں اور بیٹے کے ساتھ ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ اب ایک اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا حیدر آٹھ سال کا ہے، ایک بیٹی چھ سال کی اور ایک چار سال کی۔ حیدر ہر وقت مجھے ہدایات دیتا رہتا ہے، کبھی کبھار وہ صبح میرے ساتھ واک پر آتا ہے، وراس وقت سے میری چال پر اعتراض رہتا ہے۔

"تیز چلتے ہوئے جب تک پسینہ نہ آئے آپ سمجھیں چلنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوا بلکہ یہ سمجھیں کہ آپ نے واک کی ہی نہیں۔ دادو تیز چلیں میری طرح کوئیک ... اسی لیے تو آپ فٹ نہیں رہتے ۔ دادو کوئیک .."

وہ میرے آگے آگے چلتا بولتا رہتا ہے، میں اس کے ساتھ قدم ملانے کی پوری کوشش کرتا ہوں مگر تھک جاتا ہوں۔ دانستہ ... وہ میرا مستقبل ہے، میرے پاکستان کا مستقبل اپنے مستقبل کو کون ہرانا چاہے گا۔

چند دن پہلے وہ میرے پاس ایک پیکٹ لے کر آیا۔ "آپ کو ایک چیز دکھاؤں دادو؟" اس نے آ کر کہا۔ میں نے اخبار تہہ کر دیا۔

"ہاں دکھاؤ۔" برق رفتاری سے اس نے پیکٹ کھولا، وراس کے اندر موجود چیز میرے سامنے کر دی۔ میرا سانس رک گیا۔ وہ پوٹلی نسلوں کا سفر کتنی آسانی سے طے کر رہی تھی۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اسے ہاتھ میں اٹھایا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملی؟" میں نے اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"پاپا نے دی تھی جب وہ کارگل جا رہے تھے، انہوں نے کہا تھا یہ گفٹ ہے اپنے دادا سے پوچھنا یہ کیا ہے؟ دادو یہ کیا ہے؟"

میں نے حیدر کو گود میں لے لیا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور واپس مڑ گیا۔ اب مجھے واپسی کا فاصلہ طے کرنا تھا اسی سڑک پر۔

آج کل شاہد اور فائقہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ میرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ کل چودہ اگست کو سارا دن ٹی وی آن رہا، رات کو شاہد مجھ سے کہنے لگا۔

"میں سوچتا ہوں ابو! بڑھاپا پاکستان میں ہی گزاروں۔ ساٹھ ستر سال عمر میں یہاں آ جاؤں گا۔ انسان کو دفن اپنی مٹی میں ہی ہونا چاہیے۔ ہے نا ؟"

وہ مجھ سے اپنی "حب الوطنی" کی داد چاہ رہا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور کہا۔

"پاکستان کو تمہاری قبروں اور تابوتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ پاکستان کو تمہاری جوانی اور وہ گرم خون چاہیے جو تمہاری رگوں میں خواب اور آئیڈیلزم بن کر دوڑتا ہے۔ اگر پاکستان کو اپنی جوانی نہیں دے سکتے تو اپنا بڑھاپا بھی مت دو جس ملک میں تم جینا نہیں چاہتے وہاں مرنا کیوں چاہتے ہو باہر کی مٹی کی ٹھنڈک مرنے کے بعد برداشت نہیں ہو گی تب اپنی مٹی کی گرمی چاہیے؟ نہیں شاہد جمال آپ وہیں رہیں جہاں آپ رہ رہے ہیں۔ ہر شخص کے مقدر میں باوطن ہونا نہیں لکھا ہوتا۔ بعض کے مقدر میں جلاوطنی ہوتی ہے، اپنی خوشی سے اختیار کی جانے والی جلاوطنی۔" وہ میری بات پر خاموش ہو گیا تھا۔

شاید اس نے سوچا ہوگا میں پچھلی صدی کا آئیڈیلزم کا شکار ایک بوڑھا شخص، اس جدید ترقی یافتہ دور اور ملک کے نشے سے کیسے واقف ہو سکتا ہوں جہاں وہ رہتا ہے۔ تیس سال گزرنے کے بعد جب وہ میری طرح اس ملک میں رہنے کے لیے آئے گا تو اسے احساس ہوگا، زندگی میں بعض دفعہ جان بوجھ کر آہستہ چلنے میں مزہ آتا ہے۔ بعض دفعہ ریس میں حصہ نہ لے کر بھی آپ اسی کا حصہ رہتے ہیں۔ پھر میری طرح اس سڑک پر واک کرتے ہوئے وہ لوگوں کے چہرے اور چیزیں دیکھے گا مگر اس کے پاس سوچنے کے لیے مٹی کی وہ پوٹلی نہیں ہوگی نہ اس سے وابستہ یادیں۔ اس کے پاس پاؤنڈز اور ڈالرز کے وہ لمبے چوڑے اکاؤنٹ ہوں گے... صرف اکاؤنٹ...!

میں اب سڑک پر تیز رفتاری کے ساتھ واپس جا رہا ہوں، واپسی کا سفر میں ہمیشہ تیزی سے کرتا ہوں۔ واپسی کا سفر ہر ایک ہی تیزی سے کرتا ہے۔ بعض دفعہ یہ سڑک مجھے پاکستان لگتی ہے اور ہر روز صبح ایک گھنٹہ کی یہ واک اپنی زندگی کے اڑسٹھ سال، پچھلے 54 سال میں نے اس ملک میں گزارے ہیں۔ میرے حصے میں یہاں سب کچھ آیا، اس مٹی نے مجھے خواب دیکھنا سکھایا۔ پھر اس کی تعبیر دی۔ میں نے اس مٹی کو ہر بار وہ دیا جو اس نے مجھ سے مانگا۔ روپے کی دفعہ روپیہ، وقت کی دفعہ وقت، اور خون کی دفعہ خون۔ اور مجھے یہ ملک کبھی خالی نہیں لگا۔

مجھے کبھی اس چھوٹے، ترقی پذیر، گندے، ٹوٹی سڑکوں والے ملک کا شہری ہونے پر شرمندگی نہیں ہوئی۔ شاید اس وجہ سے کیونکہ میں نے کبھی اس کے مسائل میں اضافہ نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنے پاس موجود سب سے بہترین شے دی۔ آپ میں سے کوئی بھی اس چیز کو نہیں سمجھ سکتا۔ آج آپ سے آپ کا گھر چھین لیا جائے اور پھر آپ لڑتے جھگڑتے میری طرح خون دے کر اس گھر کو واپس لیں تو پھر آپ کو وہ ٹوٹا پھوٹا، گندا گھر جنت سے کم نہیں لگے گا۔ تب آپ کسی کو اس کی دیوار پر ہاتھ تک نہیں رکھنے دیں گے، کہاں یہ کہ کسی کو اندر آنے دیں۔

میں نے اپنے ڈرائنگ روم میں وہ میڈل رکھا ہوا ہے جو نعمان کی شہادت کے بعد دیا گیا تھا۔ شاید یہ میرے وطن کی طرف سے میری ان خدمات کا اعتراف ہے جو میں نے کیں

ہر سال پندرہ اگست میں اسی طرح اپنے ماضی کے بارے میں سوچتا ہوں، اسی سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کی وہی باتیں سنتے ہوئے۔

"اس ملک میں کچھ نہیں ہے... ہم نے کینیڈا کی امیگریشن کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے۔"

"Across the borders we are one"

مجھے اس سب کے باوجود یہیں رہنا ہے۔ یہیں جینا ہے... یہیں مرنا ہے۔

"کیا آپ میری طرح قربانی دے کر یہاں جینا اور مرنا سیکھ سکتے ہیں۔"

◆

تیری یاد خارِ گلاب ہے

"سنیں؟" وہ گاڑی لاک کر رہا تھا جب ایک آواز نے اچانک اسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ سفید چادر میں ملبوس ایک حواس باختہ سی لڑکی اس کے پاس کھڑی تھی۔

"مجھے ایک فارم لا دیں۔" اس کے مڑتے ہی اس نے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔

کوئی شناسا چہرہ ہوتا تو ودل تو وہ کبھی بھی اس سے مدد مانگنے کی حماقت نہ کرتا، اور اگر کرتا بھی تو وہ بڑی رکھائی سے اسے اپنی مدد آپ کی تلقین کرتا۔ وہ مزاجاً کچھ ایسا ہی بے مروت اور بے لحاظ واقع ہوا تھا۔ ایک تیکھی سی نظر اس نے اس لڑکی کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے؟" بڑے بے تاثر انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

"نہیں میں اکیلی آئی ہوں۔" وہ ہاتھ میں پکڑے رومال سے اپنے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کرتے ہوئے بولی تھی۔

"ایڈمشن فارم چاہیے آپ کو؟"

"ہاں وہی چاہیے۔" وہ چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بادلِ نخواستہ اس نے قدم بڑھا دیے۔

"آئیں میرے ساتھ۔" اس لڑکی نے فوراً اس کی پیروی کی تھی مگر اس کے پیچھے پیچھے چلنے کے بجائے وہ اس کے برابر چلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر چند منٹوں تک اس کوشش میں مصروف رہنے کے بعد بھی جب وہ اس کے تیز قدموں کا مقابلہ نہیں کر پائی تو وہ یک دم رک گئی۔

"پلیز ٹھہر جائیں ناں۔ آپ تو بہت تیز چلتے ہیں۔"

اس کی آواز پر اس کے قدم بے اختیار رک گئے تھے۔ بڑی حیرانی سے اس نے اپنے مخاطب کو دیکھا تھا جو اب اس کے پاس آ گیا تھا۔ ناگواری کی ایک لہر سی اس کے اندر اٹھی تھی مگر اس کے قدموں کی رفتار اب کافی آہستہ ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی اب بغیر کسی مشکل کے اس کے برابر چل رہی تھی۔

"یہ فارم کتنے کا آتا ہے؟" یہ پوچھا جانے والا پہلا سوال تھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے اسے بغیر دیکھے جواب دیا۔

"یہ فارم ملتا کہاں سے ہے؟" ایک اور سوال پوچھا گیا تھا۔

جواب اب بھی اسی بے نیازی سے دیا گیا تھا۔ "آفس سے"

تیسرا سوال بھی بڑے فراٹے سے کیا گیا تھا۔ "آفس کہاں ہے؟"

"ہم وہیں جا رہے ہیں۔" اس نے اب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جواب دیا تھا۔ پھر سوالوں کی ایک بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی۔

"آفس کیا زیادہ دور ہے؟"

"پتا نہیں، میں نے کبھی فاصلہ ناپا نہیں۔"

"کہیں اور سے فارم نہیں ملتا؟"

"ملتا ہوگا۔"

"تو وہاں سے کیوں نہ لے لیں؟"

"اگر آپ کو ایسی جگہ کا علم ہے تو ضرور لے لیں۔" اس بار اس کے لہجے میں خفگی نمایاں تھی مگر سوال پوچھنے والی ذرا متاثر نہیں ہوئی۔ سوالوں کا یہ سلسلہ پھر وہیں سے جوڑ دیا گیا تھا۔

"آفس سے فارم مل جائے گا ناں؟"

"اگر ہوگا تو ضرور مل جائے گا۔"

"اور اگر نہ ملا تو؟"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"اگر فارم نہ ملا تو میں ایڈمیشن کے لیے کیسے اپلائی کروں گی؟" اب لہجے میں تشویش شامل ہو چکی تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ اس کے سوالوں سے عاجز آ چکا تھا۔

"جن لوگوں کو فارم نہیں ملتے، وہ کیا کرتے ہیں؟"

"صبر۔" اس مختصر جواب نے کچھ لمحوں کے لیے اس پر خاموشی طاری کر دی تھی۔

"آپ یہاں پڑھتے ہیں؟" کچھ دیر کے بعد سوالات دوبارہ شروع ہو گئے تھے۔

"ہاں۔"

اگلا سوال حماقت سے بھرپور تھا۔ "آپ کو ایڈمیشن مل گیا تھا؟"

"اگر میں یہاں پڑھتا ہوں تو اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہی ہے کہ مجھے ایڈمیشن مل گیا تھا۔"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے آپ کو ایڈمیشن فارم کے ذریعے ایڈمیشن ملا تھا؟"

"ہاں۔"

اگلا سوال پھر احمقانہ تھا۔ "آپ کو ایڈمیشن فارم مل گیا تھا؟"

اس نے صبر و ضبط کے ریکارڈ توڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔"

"کہاں سے ملا تھا؟"

"آفس سے۔"

"جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں سے؟"

"جی وہیں سے۔"

"مجھے بھی مل جائے گا ناں؟" اس بار سوال التجائیہ تھا۔

"دعا کریں۔"

اس نے کہا تھا۔ بہت جلد اسے احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی احمق نہیں نروس ہے اور جو وہ پوچھنا چاہ رہی ہے، وہ مناسب طریقے سے پوچھ نہیں پا رہی۔ اب وہ شاید دعا میں مصروف ہو چکی تھی کیونکہ باقی راستہ وہ خاموش رہی تھی۔

"وہ آفس ہے اور وہ ونڈو ہے۔ اس لائن میں کھڑی ہو جائیں جس میں پہلے کچھ لڑکیاں کھڑی ہیں۔ وہاں سے آپ کو فارم مل جائے گا۔"

آفس نظر آتے ہی اس نے رکتے ہوئے اس لڑکی کو ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا تھا مگر وہ یک دم بدک گئی تھی۔

"میں کیسے لے آؤں۔ اتنے لوگ ہیں وہاں۔ آپ لا کر دیں۔"

وہ اس کی فرمائش نما مطالبے پر حیران رہ گیا تھا۔ ایک نظر اس نے اپنی رسٹ واچ پر دوڑائی کلاس شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ یہاں رکیں، میں آپ کو فارم لا کر دیتا ہوں۔"

وہ اسے وہیں رکنے کا کہہ کر آفس کی طرف بڑھ گیا اب وہ جلد از جلد اس مفت کی خدمت سے نجات حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ کھڑکی پر لگی ہوئی قطاروں میں کھڑا ہونے کی بجائے وہ آفس کے اندر گیا تھا اور اپنے ایک شناسا کلرک سے فارم لے کر چند منٹوں میں باہر آ گیا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا فارم دیکھ کر بے تحاشا خوش ہو گئی تھی۔

"یہ لیں فارم۔" اس نے بڑی عقیدت سے فارم لیا تھا۔

"یہ کتنے روپے کا ہے؟" اس لڑکی نے پرس کھولتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نیور مائنڈ۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اس کے پیچھے آئی تھی۔

"پلیز بتائیں ناں۔ کتنے کا ہے؟"

"یہ فارم فری ملتا ہے۔" اس نے جھوٹ بولا تھا۔

وہ چند روپے اس سے نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ پھر فارم کو فائل میں رکھنے لگی۔ اس نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا وہ لڑکی پھر اس کے پیچھے آئی تھی۔ اس بار وہ جھنجھلا کر رکا تھا۔

"بس اب میں جا رہا ہوں۔" وہ اس بار پہلی دفعہ اس کے تیوروں سے گڑبڑائی تھی۔

"یہ فارم فل کر کے آفس میں جمع کروائیں۔" اسے اس کی حماقت پر اب افسوس ہونے لگا تھا۔

"ابھی جمع کروا دوں؟" وہ بے تحاشا حیران ہوئی تھی۔

"جی ابھی جمع کروائیں۔ کل آخری تاریخ ہے اور بہت رش ہوگا۔ ڈاکومنٹس ہیں ناں آپ کے پاس۔"

اس نے پہلی بار بڑے تحمل سے اس سے پوچھا تھا اور یہ پوچھنا اسے مہنگا پڑا۔ اس لڑکی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل سے کچھ پیپرز نکال کر اسے تھما دیئے۔

"ہاں ڈاکومنٹس تو میرے پاس ہیں۔"

"لیکن میں انہیں کیا کروں؟"

اس نے ہکا بکا ہو کر اس سے پوچھا تھا۔ اس دفعہ فارم بھی اسے تھما دیا گیا تھا۔

"آپ اسے فل کر دیں میں نے کبھی فارم فل نہیں کیا۔ بابا کرتے ہیں ہمیشہ۔ مجھ سے بہت غلطیاں ہوتی ہیں۔"

پہلی بار اس نے اپنے بنائے ہوئے اصول توڑتے ہوئے کسی کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی اور پہلی دفعہ ہی یہ مدد اس کے گلے میں کانٹے کی طرح اٹک گئی تھی۔ وہ لڑکی بڑی کام چور لگ رہی تھی اس وقت اسے ہونٹ بھینچ کر وہ ڈاکومنٹس اور فارم لے کر برآمدے میں بیٹھ گیا اور بے حد سنجیدگی کے ساتھ اسے فل کرنے لگا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ کسی دوسرے کا فارم اس طرح فل کر رہا تھا اور وہ بھی ایک لڑکی کا۔ باری باری ڈاکومنٹس سے کوائف اتارتے ہوئے وہ ایک ایک ڈاکومنٹ اس کی طرف بڑھاتا گیا۔ بے حد مختصر وقت میں اس نے فارم فل کیا تھا۔ پھر فارم اسے دینے کے بجائے وہ آفس کی طرف خود چلا گیا تھا۔ جو کام اسے بعد میں بھی خود ہی کرنا تھا۔ وہ پہلے ہی کیوں نہ خود کر دیتا۔ آفس سے باہر آتے ہی اس نے اس لڑکی کو منتظر پایا تھا۔

"اب آپ جائیں، بیس کو آکر لسٹ میں اپنا نام دیکھ لیجئے گا۔"

اس بار وہ رکا نہیں۔ بے حد تیز قدموں کے ساتھ وہ اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف آ گیا تھا۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گزرا تھا جب اس روز وہ موحد کے ساتھ کسی کام کے لئے آفس کی طرف گیا تھا۔ وہ آفس سے ابھی کافی دور تھا جب اس نے اسی لڑکی کو آفس سے کچھ فاصلے پر ایک ستون کے پاس کھڑی دیکھا تھا۔ ایک ہی نظر میں وہ اسے پہچان گیا تھا اور اس پہچان کے ساتھ ہی اسے اس دن کی روداد یاد آ گئی تھی۔ وقتاً فوقتاً اس پر نظر دوڑاتے وہ اپنے دوست کے ساتھ باتیں کرتا آفس کی طرف بڑھتا گیا۔ آفس کے اردگرد اس وقت کافی رش تھا ایڈمیشن پانے والے فیس جمع کروانے کے لئے قطاروں میں کھڑے تھے۔ اسی وقت اس لڑکی کی نظر اس پر پڑی تھی اور وہ بہت تیزی سے اس کی طرف آئی تھی۔ اس نے اسے اپنی جانب آتے دیکھ لیا تھا۔

"Oh not again" (وہ اب پھر نہیں) وہ بے اختیار بڑبڑایا تھا۔

"یہ لیں۔ میری فیس جمع کروا دیں۔"

کمال بے تکلفی سے اس نے پاس آتے ہی اس کی طرف فارم اور روپے بڑھا دیئے تھے۔ موحد اور اس کے درمیان بڑی سنجیدگی سے

نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ موحد انکار کرتا اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا جب اس نے کومیل کو بڑی خاموشی سے اس لڑکی سے روپے پکڑتے دیکھا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ کومیل کے ساتھ آگے بڑھ آیا تھا۔

’’تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟‘‘ چند قدم چلنے کے بعد موحد نے اس سے پوچھا تھا۔

’’No‘‘ (نہیں) جواب بالکل مختصر تھا۔

’’محترمہ خاصی احمق ہیں۔‘‘ موحد نے تبصرہ کیا تھا۔

’’اس میں کیا شبہ ہے۔‘‘ اس نے خاصی لاپروائی سے کہا تھا۔

’’بغیر واقفیت کے ہمیں فیس جمع کروانے کا فریضہ سونپ دیا ہے، ور اگر ہم ان روپوں کے ساتھ فرار ہو جائیں یا فیس جمع کروائیں ہی نا تو؟‘‘ موحد نے ایک لمحے کے لئے پیچھے مڑ کر گہری نظروں سے اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

کومیل اس بار خاموش رہا تھا۔ آفس میں فیس جمع کروانے کے بعد جب وہ اس جگہ آئے تھے جہاں اس لڑکی نے روپے انہیں تھمائے تھے تو وہ لڑکی وہاں سے غائب تھی۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھتے رہے مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔

’’So what next‘‘ موحد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

’’اب اس رول نمبر سلپ کو کیا کرنا ہے اور وہ محترمہ تو شاید جا چکی ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ان کا کام ختم ہوا اور میں حیران ہوں کہ اس رول نمبر سلپ کے بغیر یہ کلاس میں اپنا نام اور رول نمبر کیسے رجسٹرڈ کروائیں گی۔ اتنا تو پتا ہونا چاہئے انہیں کہ فیس کی رسید لینی ہے یا رول نمبر سلپ لینی ہے اور یہ محترمہ کرنا چاہ رہی ہیں ایم اے انگلش۔‘‘

موحد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ناگواری سے ایک طویل تبصرہ کیا تھا۔

کومیل اب بھی بغیر کچھ کہے بڑے تحمل سے ادھر ادھر نظر دوڑا رہا تھا۔ آدھ گھنٹہ تک وہ وہیں اس کے انتظار میں کھڑے رہے۔ پھر وہ وہاں سے آ گئے تھے۔

وہ کافی خوشی اور جوش کے عالم میں اندر داخل ہوئی تھی۔ ’’کیوں ثانیہ جمع کروا آئی ہو فیس؟‘‘ خالہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تھا۔

’’ہاں خالہ! جمع کروا آئی ہوں۔‘‘ اس نے اپنی چادر اتارتے ہوئے جواب دیا تھا۔

عابیہ اس کے پاس چلی آئی۔ ’’یونیورسٹی جانا کب سے شروع کریں گی آپی؟‘‘ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

’’تین تاریخ سے۔‘‘ ثانیہ نے مسکراتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں اپنی کزن کو بتایا تھا۔

’’آپ کو ڈر نہیں لگے اتنے لڑکوں کے ساتھ پڑھتے؟‘‘ عابیہ اب اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

’’ڈرنے والی کون سی بات ہے آخر اور لڑکیاں بھی تو پڑھتی ہیں۔‘‘ ثانیہ نے اس سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی تھی۔

’’ہاں، آپ تو ویسے بھی بہت بہادر ہیں اسی لئے تو خالو نے اکیلے لاہور پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔‘‘

اس کی کزن پر اس کی "جواں مردی" کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور اس میں ثانیہ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بات ایسے ہی کرتی تھی جیسے وہ بہت دلیر اور نڈر تھی لیکن یہ گفتگو دوسروں کے لئے کم اور اپنے لئے زیادہ ہوتی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو ایسی باتوں سے بہلایا کرتی تھی۔ ورنہ وہ جس قدر احمق، کمزور اور حواس باختہ ہو جاتی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس میں غلطی اس کی بھی نہیں تھی۔ ساری عمر سرگودھا شہر میں رسوم و رواجوں کی بھاری زنجیروں میں گزارنے کے بعد ایک دم وہ لاہور کیا آ گئی تھی اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ نیویارک پہنچ گئی تھی۔

مراد علی کی پانچ بیٹیاں تھیں اور ثانیہ سب سے بڑی تھی۔ ان کے لئے وہ بیٹی بھی تھی اور بیٹا بھی۔ تعلیم کا انہیں خود بھی بہت شوق رہا تھا مگر باپ کے جلد انتقال کی وجہ سے انہیں بہت جلد اپنی زمینوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا، وہ کوئی بہت بڑے زمیندار نہیں تھے کہ جو سارا انتظام نوکروں کے سر پر چھوڑ کر خود آرام سے تعلیم حاصل کرتے رہتے۔ وہ تو بہت چھوٹے زمیندار تھے جنہیں سارے انتظامات خود ہی سنبھالنے اور کرنے پڑتے تھے۔ اس لئے بھاری دل سے انہوں نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے اور باپ کے مرنے کے بعد سر پر تین بہنوں کا بوجھ بھی آن پڑا تھا۔ سو جب تک وہ ان کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہوئے تب تک وہ کافی عمر کے ہو چکے تھے اور ان کی مالی حالت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی، سو انہوں نے اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے۔

قسمت یہاں بھی ان پر زیادہ مہربان نہیں رہی۔ بیٹے کی خواہش میں یکے بعد دیگرے پانچ بیٹیاں ان کے آنگن میں آ گئیں تو انہوں نے اللہ کی رضا پر سر تسلیم خم کر دیا۔

"کوئی بات نہیں بیٹیاں ہیں تو کیا ہے میں انہیں ہی پڑھاؤں گا۔"

وہ کئی بار اپنی بیوی سے کہتے۔ یہ ایک ایسا خاندان تھا جہاں لڑکیاں سات پردوں میں رہا کرتی تھیں۔ وہاں مراد علی کے عزائم سب کو احمقانہ نظر آئے مگر وہ اپنے ارادے پر ڈٹے رہے۔ پردے میں رکھتے ہوئے انہوں نے بیٹیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے کالج بھیجنا شروع کر دیا تھا اور پھر یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا جب ثانیہ نے گریجویشن کر لی تو مراد علی نے اسے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ دلوانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لاہور میں ثانیہ کی خالہ کا گھر تھا۔ اس لئے انہیں وہاں اس کی رہائش اس کوئی مسئلہ نظر نہیں آیا۔ مگر جن دنوں پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن شروع ہوئے تھے، ان ہی دنوں انہیں کچھ ضروری معاملات کے سلسلے میں راولپنڈی جانا پڑا۔ وہ ثانیہ کو اس کی خالہ کے گھر چھوڑ گئے۔

ثانیہ کی خالہ شاہدرہ میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا، جو سب سے بڑا تھا اور اب باپ کے ساتھ میڈیکل اسٹور سنبھالتا تھا۔ بڑی بیٹی فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی اور چھوٹی میٹرک میں۔ ثانیہ کی آمد سے سب ہی بہت خوش تھے پھر وہ مرعوب بھی تھے کیونکہ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو اس طرح ایم اے کرنے کے لئے دوسرے شہر میں آئی تھی۔ خالہ نے یونیورسٹی کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا مگر ثانیہ نے یوں ظاہر کیا تھا جیسے وہ پہلی بار نہیں بار بار یونیورسٹی آتی جاتی رہی تھی۔ یہ ظاہر کرنا اس کی مجبوری تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کسی جھجک اور گھبراہٹ کو دیکھ کر وہ یونیورسٹی کو کوئی معیوب جگہ سمجھیں یا اسے تعلیم سے متنفر کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ بہرحال اسے اب دو سال کے لئے انہیں کے ساتھ رہنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایڈمیشن کے لئے اپلائی کرنے کے لئے جانے کے لئے اس نے نہ تو اپنی کسی کزن کو ساتھ لیا تھا اور

نہ ہی احمد سے کوئی مدد مانگی تھی جو اسے صبح اپنے موٹر سائیکل پر یونیورسٹی چھوڑ گیا تھا۔ ثانیہ کو احمد سے زیادہ مدد اس لیے بھی نہیں مل سکتی تھی کیونکہ وہ خود بھی پہلی بار ہی یونیورسٹی کی طرف آیا تھا۔ وہ ایف اے کے بعد ہی تعلیم کو خیر باد کہہ چکا تھا۔

سو اس نے سوچا تھا کہ ایک بار یونیورسٹی پہنچنے کے بعد وہ خود ہی آفس ڈھونڈ کر اپنا کام کر لے گی۔ مگر یونیورسٹی کوئی چھوٹا اسکول یا کالج نہیں تھا۔ وہ وہاں داخل ہوتے ہی جگہ جگہ لڑکوں کے گروپ کھڑے دیکھ کر بے تحاشا گھبرا گئی تھی۔ اسے دور دور تک کسی آفس کا نام و نشان نظر نہیں آیا تھا اور وہ آگے جانے کے بجائے ایک جگہ کھڑی ہو گئی تھی۔ تنی ہمت اس میں بہر حال نہیں تھی کہ وہ لڑکوں کے کسی گروپ کے پاس جا کر مدد مانگے اور پھر اچانک اسے کومیل نظر آیا تھا، جب وہ بے بسی کے عالم میں پارکنگ کی طرف آئی تھی۔ اسے شکل سے وہ شریف لگا اور اسے یہ بہت بڑی خوش فہمی رہی تھی کہ وہ بہت اچھی چہرہ شناس ہے۔ سو اسے اس اکیلے لڑکے سے مدد مانگنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوا اور پھر کومیل کے طور طریقے ایسے تھے کہ اسے اس کی شرافت پر اور بھی یقین آتا گیا۔

وہ دوسرے لڑکوں کی طرح اسے دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس نے اس پر صرف ایک دو نظریں ڈالی تھیں۔ وہ بھی تب جب وہ اس سے مدد مانگ رہی تھی۔ اس کے بعد جتنی دیر وہ اس کے ساتھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے بغیر ہی اس کی باتوں کا جواب دیتا رہا۔ ثانیہ کو اس کے قریب رہ کر بہت تحفظ کا احساس ہوتا رہا تھا۔

چند لمحے پہلے تک لڑکوں کی موجودگی اور نظروں سے پیدا ہونے والا خوف اب اس کے لیے تنا جان لیوا نہیں تھا۔ گھر آ کر اس نے یوں ظاہر کیا تھا جیسے اس نے کسی کی مدد کے بغیر ہی آفس ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ یہ بتانا قطعاً افورڈ نہیں کر سکتی تھی کہ اس نے کسی لڑکے سے مدد لی تھی۔ پھر جس دن لسٹیں لگی تھیں، اس دن وہ خود نہیں گئی تھی بلکہ اس نے احمد سے کہا تھا کہ وہ اس کا نام دیکھ آئے، اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنا نام دیکھنے جاتی۔ نام نظر آتا یا نہ آتا، دونوں صورتوں میں اس نے وہیں رونا شروع ہو جانا تھا۔ یہ داخلہ اس کے لیے ایسا ہی نازک اور حساس معاملہ تھا۔

وہ بے تحاشا دعائیں مانگتی رہی تھی اور پھر احمد نے جب گھر آ کر اسے داخلے کے بارے میں بتایا تو وہ فوراً نفل پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔

احمد اس کے لیے یونیورسٹی سے فیس فارم بھی لے آیا تھا۔ اب وہ ایک بار پھر یونیورسٹی میں اکیلی فیس جمع کروانے چل پڑی تھی مگر وہاں اس قدر رش تھا کہ اس کی ساری ہمت ہی ٹوٹ گئی تھی۔ لمبی قطاروں میں کھڑے ہونے کے بجائے وہ ایک طرف کھڑی ہو کر تشویش کے عالم میں اسے مجمعے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ جب رش کچھ کم ہو جائے گا تو وہ بھی کسی قطار میں کھڑی ہو جائے گی مگر یہ بات اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ وقتاً فوقتاً جو لوگ وہاں آ کر قطار میں شامل ہو رہے ہیں وہ قطار کی لمبائی کو مقررہ وقت تک تو کبھی بھی کم نہیں ہونے دیں گے۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسی وقت اس نے کومیل کو دیکھ لیا تھا۔ ایک ہی نظر میں وہ اسے پہچان گئی تھی اور بے تحاشا جوش میں وہ تیر کی طرح اس کی طرف گئی تھی۔

بڑے اطمینان سے اسے فارم اور فیس پکڑانے کے بعد وہ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد آرام سے واپس گھر آ گئی تھی اس نے یہ سوچنے کی قطعاً زحمت نہیں کی کہ اسے رول نمبر سلپ یا فیس کی رسید لینی چاہیے۔ اس نے سوچا تھا کہ جیسے پہلی دفعہ اس نے بس فارم جمع کروایا تھا اور پھر اسے

جانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ آج بھی وہ فارم اور فیس جمع کروا کر ہی کے گا۔ سو اس نے سوچا کہ فیس تو اب جمع ہو ہی جائے گی، اس لئے اسے وقت ضائع کرنے کے بجائے گھر چلے جانا چاہئے اور بڑے اطمینان سے وہ گھر آ گئی تھی۔

اس دن یونیورسٹی میں کلاسز کا آغاز ہوا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے یونیورسٹی گئی تھی مگر اس کا یہ اطمینان اس وقت غائب ہو گیا تھا۔ جب پہلی ہی کلاس میں پروفیسر صاحب نے رجسٹر کھول کر رول نمبر پکارنے کی بجائے کلاس سے درخواست کی تھی کہ وہ باری باری اپنی رول نمبر سلپ کے ساتھ ان کے پاس آئیں اور اپنے رول نمبر اور نام لکھوا دیں۔ اس کی ارد گرد بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے اپنی رول نمبر سلپس نکال لی تھیں۔ وہ چند لمحے حیرت سے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سلپ دیکھتی رہی، اور پھر اس نے پوچھا تھا۔

"آپ نے یہ رول نمبر سلپ کہاں سے لی ہے؟" اس لڑکی نے اس سوال پر کچھ تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ آفس سے ملی ہے فیس جمع کروانے کے بعد۔" کچھ توقف کے بعد اس لڑکی نے کہا تھا۔

"مگر مجھے تو نہیں ملی۔"

"کیوں آپ نے یہ آفس سے کیوں نہیں لی؟"

"اصل میں، میں نے خود فیس جمع نہیں کروائی تھی۔ ایک لڑکے نے کروائی تھی۔" ثانیہ نے وضاحت کی تھی۔

"ہاں تو آپ کی سلپ اس لڑکے کے پاس ہوگی۔ آپ اس سے لے لیں۔" اس لڑکی نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے لاپرواہی سے کہا تھا۔

"مگر مجھے تو نہیں پتا، وہ لڑکا اس وقت کہاں ہوگا۔" وہ منمنائی تھی

اس بار لڑکی نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

"کیوں، آپ اس لڑکے کو جانتی نہیں ہیں؟" ثانیہ نے بمشکل نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"واٹ! تو آپ نے فیس اسے جمع کروانے کے لئے کیسے دے دی؟" وہ لڑکی حیرانی سے بولی تھی ثانیہ نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔

"وہ انگلش ڈیپارٹمنٹ کا ہے؟" اس لڑکی نے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں۔" ثانیہ کے حلق سے اب بمشکل آواز نکل رہی تھی۔

"نام پتا ہے آپ کو اس کا؟"

"وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔" اب اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی دوسری لڑکیاں بھی متوجہ ہو چکی تھیں۔

"آپ کو اس کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں، اور پھر بھی آپ نے اسے فیس جمع کروانے کے لئے دے دی۔ پتا نہیں اس نے فیس جمع کروائی بھی ہے یا نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ اس نے فیس جمع نہیں کروائی ہوگی۔ بہرحال اب آپ کلاس ختم ہونے کے بعد اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں کیونکہ جب تک آپ کے پاس رول نمبر سلپ نہیں ہوگی آپ کا نام کوئی بھی پروفیسر رجسٹر نہیں کرے گا۔ اب تو ویسے بھی فیس جمع کروانے کی آخری

تاریخ بھی گزر چکی ہے اگر اس لڑکے نے فیس جمع نہیں کروائی تو اب تو آپ کا ایڈمیشن بھی نہیں ہوگا۔“

ثانیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس لڑکی کی باتوں پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی نظریں اسے بری طرح چبھ رہی تھیں۔

وہ آنکھوں میں نمی لیے سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اپنا بیگ اٹھائے باہر آ گئی تھی۔ اپنے ذہن میں اس لڑکے کا چہرہ یاد کرتے ہوئے وہ اسے ڈھونڈنے لگی۔ اسے ڈھونڈتے ہوئے ایک بار پارکنگ میں بھی گئی تھی کہ شاید وہیں وہ اسے مل جاوے مگر وہ تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔ ایک گھنٹہ تک ہر جگہ خوار ہونے کے بعد اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف آنے کے بعد اندر کلاس میں جانے کے بجائے وہ لان کے ایک کونے میں آ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے سر کو بازوؤں میں چھپ کر بے آواز رونے لگی تھی۔

جی بھر کر رونے کے بعد جب وہ پرسکون ہوئی تو اس نے بیگ سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں اور چہرہ خشک کرنا شروع کیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کے پاس جا کر یہ مسئلہ بتائے گی مگر وہ جانتی تھی کہ وہ بھی اس معاملہ میں اس کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اس نے واقعی بڑی حماقت کی تھی۔ بوجھل قدموں کے ساتھ وہ سر جھکائے ڈپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں اور اچانک سر اٹھاتے پر اس کے پیر جیسے پتھر کے ہو گئے تھے۔ سامنے برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے وہی کھڑا تھا۔ وہ اپنے کچھ دوستوں سے باتوں میں کافی مصروف لگ رہا تھا۔ ثانیہ کے قدموں تلے جیسے زمین آ گئی تھی وہ تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے پاس گئی تھی۔

”آپ نے مجھے رول نمبر سلپ کیوں نہیں دی؟ آپ کو پتا ہے، اس کے بغیر میرا نام کہیں بھی رجسٹرڈ نہیں ہوگا۔ میں اتنی دیر سے آپ کو ڈھونڈ رہی تھی مگر آپ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ میری رول نمبر سلپ کہاں ہے؟“

وہ بے قراری سے بولتی گئی تھی۔ اس کی آمد سے وہاں سکوت چھا گیا تھا۔

”آپ اس دن رول نمبر سلپ لینے کے لیے رکی کہاں تھیں۔ میں نے کافی دیر تک آپ کا انتظار کیا تھا۔ بہرحال اب میں نے وہ سلپ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ کو دے دی ہے آپ ان سے جا کر لے سکتی ہیں۔“

اس کے خاموش ہوتے ہی کومیل نے کافی بے رخی سے اسے جواب دیا تھا۔

”آپ میرے ساتھ چلیں۔ مجھے نہیں پتا، وہ اس وقت کہاں ہوں گے۔“ وہ اب اس کے گم ہو جانے کا رسک کہاں مول لے سکتی تھی۔

”وہ اس وقت آپ لوگوں کی ہی کلاس لے رہے ہیں۔“ اس بار کومیل کے بجائے وحید نے کہا تھا مگر وہ وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔

”نہیں۔ آپ خود میرے ساتھ چل کر مجھے سلپ دے کر دیں۔ میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔“ اس نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

”ویسے بھی مجھے کیا پتا آپ نے سر کو رول نمبر سلپ دی بھی ہے یا نہیں۔ میں یہاں سے جا کر واپس آؤں اور آپ مجھے نہ ملے تو میں آپ کو کہاں سے ڈھونڈوں گی۔“

اس نے احسان فراموشی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ کومیل کے دوست اس تبصرے پر حیران ہوئے تھے مگر اس کے تو تن بدن میں

آگ لگ گئی تھی۔

"جاؤ یار! خود ہی جا کر انہیں سلپ لا دو۔"

ولید نے کافی ناگواری سے اس سے کہا تھا۔

وہ ہونٹ بھینچتا ہوا وہاں سے چل پڑا تھا۔ پہلی بار اسے اس طرح کی سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ثانیہ بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ کہیں پھر غائب نہ ہو جائے۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" ثانیہ نے ساتھ چلتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

کومیل کا دل چاہا تھا کہ وہ اسے جھڑک کر منہ بند رکھنے کے لئے کہے مگر اس نے کمال تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا نام بتا دیا تھا۔ مگر ثانیہ بے یقینی کی آخری سیڑھی پر براجمان تھی۔ اپنی طرف سے وہ انتہائی ذہانت کا مظاہرہ کر رہی تھی اسی لئے اس نے کہا۔

"مگر مجھے کیا پتا، یہ آپ کا اصلی نام ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے، آپ صحیح نام بتا نہ رہے ہوں۔"

کومیل کے قدم رک گئے تھے۔ سرخ چہرے کے ساتھ اس نے جینز کی پاکٹ سے والٹ نکال کر کھولا تھا اور اپنا I.D کارڈ اس کے سامنے کر دیا تھا۔

"آپ دیکھ سکتی ہیں کہ میرا نام سیّد کومیل حیدر ہی ہے اور اپنے ذہن سے یہ خدشات نکال دیں کہ میں کہیں بھاگنے کی تیاری میں ہوں۔ نہ ہی یہ سوچیں کہ میں نے آپ کی فیس جمع نہیں کروائی۔ آپ نے مجھے کوئی دس لاکھ روپیہ نہیں دیا تھا جو میں لے کر فرار ہو جاتا۔ اس لئے اب آپ اپنا منہ برائے مہربانی بند کر لیں۔"

اس نے اپنا والٹ جیب میں رکھتے ہوئے اسے بری طرح جھڑکا تھا۔ وہ قدرے شرمساری دوبارہ اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔

"مے آئی کم اِن سر!" کومیل نے دروازے میں کھڑے ہو کر سر تسنیم سے اندر آنے کی اجازت لی تھی۔ وہ اجازت ملنے پر اس کے پیچھے پیچھے اپنی کلاس میں داخل ہو گئی۔

"سر! وہ فیس کی رسیدیں اور سلپ ان کی ہی تھی۔" کومیل نے سر تسنیم کے پاس پہنچ کر کہا تھا۔

"میں نے آپ کا رول نمبر لکھ دیا ہے، یہ آپ لے لیں۔"

سر تسنیم نے اس سے یوں کہا تھا جیسے یہ ایک عام سی بات تھی۔

وہ سلپ اور رسیدیں لے کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ کومیل واپس دروازے کی طرف جانے لگا تھا۔ جب سر تسنیم نے اسے بلا لیا تھا۔

کچھ دیر تک ان دونوں کے درمیان سرگوشیوں میں گفتگو ہوتی رہی پھر وہ باہر چلا گیا تھا۔ ثانیہ شرمندگی کے عالم میں اپنی سیٹ پر بیٹھی رہی۔

"یہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟" اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے عجیب سے اشتیاق کا اظہار کیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ انہوں نے میری فیس جمع کروائی تھی۔" اس نے مدھم آواز میں جھکے ہوئے سر کے ساتھ جواب دیا تھا۔ دل پر ابھی بھی

ملال کی وہی کیفیت تھی۔

"ان کا نام کومیل حیدر ہے۔ یہ فائنل ییئر کے سب سے قابل اسٹوڈنٹ ہیں۔"

اس لڑکی نے سرگوشی میں اس کا تعارف کروایا تھا۔ وہ خاموشی سے سر ہلا کر رہ گئی۔ اپنی غلطی اب اسے گناہ کبیرہ لگنے لگی تھی۔ بڑی بے دلی سے اس نے باقی کلاسز لی تھیں۔ ذہن اس کا ابھی بھی اس کے ساتھ ہونے والی اپنی گفتگو پر اٹکا ہوا تھا۔

"کتنی مدد کی تھی اس نے۔ کیا تھا اگر میں اتنی بے اعتباری کا مظاہرہ نہ کرتی۔ وہ مل تو گیا تھا پھر کہاں بھاگ جاتا۔ میں نے خواہ مخواہ میں ہی اسکی بات کر کے اسے ناراض کر دیا۔ وہ بھی مجھے کیا سمجھتا ہوگا۔ سوچتا ہوگا کہ نکی گلے پڑ گئی ہے۔"

سوچوں کا ایک سیلاب تھا جو امڈا چلا آ رہا تھا۔ آخری کلاس لینے کے بعد وہ باہر آ گئی تھی۔ برآمدے میں کافی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ وہ ڈیپارٹمنٹ سے نکلنے والی تھی جب اس نے سیڑھیوں پر کومیل کے گروپ کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اس کے دوست سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ وہ آخری سیڑھی پر پیر رکھے ہوئے ان سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اسی نے سب سے پہلے سے دیکھا تھا۔ بہت اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اس نے۔ لیکن یقیناً اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر آیا تھا جو اس کے دوستوں سے پوشیدہ نہیں رہ پایا۔ انہوں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تھا اور پھر اسی برق رفتاری سے گردنیں واپس مڑ گئی تھیں مگر ان کے چہرے پر ابھرنے والی ناگواری وہ دیکھ چکی تھی۔

"مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" وہ پھر بھی ان کے قریب چلی گئی تھی۔

"جی فرمائیے اب کیا بات کرنی ہے آپ کو؟" کومیل کے تیور خاصے بگڑے ہوئے تھے۔

"مجھے آپ سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔"

"آپ سمجھیں میں اکیلا ہوں اور جو کہنا ہے یہیں کہیں۔" کومیل کسی صورت بھی اب اس کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھا۔

وہ چند لمحے اس کے دوستوں کی طرف دیکھتی رہی جو بڑی بے نیازی سے وہیں براجمان تھے۔

"مجھے آپ سے ایکسکیوز کرنی تھی۔ مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنا چاہیے تھی مگر میں "

کومیل نے اسے بات مکمل کرنے نہیں دی۔ "دیکھیں بی بی! مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے آپ کی اس معذرت سے۔ آپ نے جو کہا، اس سے میری انسلٹ ہوئی ہے۔ میں آپ کی مدد کے لئے آپ کے پاس نہیں گیا تھا۔ آپ آئی تھیں اور یہ آپ کی غلطی تھی کہ آپ رول نمبر سلپ لیے بغیر چلی گئیں اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا اور آپ نے مجھے کوئی اتنا بڑا خزانہ نہیں تھما دیا تھا جو میں لے کر غائب ہو جاتا اور ساری زندگی اس پر عیش کرتا اور آپ کو میں کیا شکل سے فراڈ لگتا ہوں جو آپ ایسے کہہ رہی تھیں کہ میرے ساتھ چلو۔ میں کہاں سے ڈھونڈوں گی اگر آپ غائب ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔"

"آپ کے لئے وہ رقم خزانہ نہیں تھی میرے لئے تھی۔ میں گھبرا گئی تھی کیونکہ میرے پاس بس فیس کے لئے وہی روپے تھے۔ اگر دوبارہ فیس جمع کروانا پڑتی تو میں کہاں سے کرتی۔ اس لئے میں نے اس طرح Behave کیا۔"

بات ختم کرتے کرتے آنسوؤں کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کومیل اور اس کے دوستوں کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے صورت حال کم از کم

ان کے لئے کافی سنگین تھی اردگرد سے گزرنے والے اسٹوڈنٹس اب کافی غور سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے، اور شاید چند لمحوں میں وہ وہاں کھڑے ہونا بھی شروع کر دیتے۔ موحد نے سب سے پہلے ہوش مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ٹھیک ہے جو ہو گیا اب اسے بھول جائیں۔ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہوئی جو آپ یوں رونے لگیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اب بس معاملہ کلیئر ہو گیا ہے۔ آپ پلیز یہ رونا بند کر دیں۔"

ثانیہ نے ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھنا شروع کر دیے پھر یک دم اس نے ہاتھ روک کر کومیل سے پوچھا۔

"آپ نے بھی مجھے معاف کر دیا؟"

"Just forget it" (بھول جائیں اسے) معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔" کومیل نے اپنے حواس بحال کرتے ہوئے بمشکل کہا تھا۔

"تھینک یو۔" اب اس کے گرتے آنسو تھم گئے تھے۔ بائیں ہاتھ سے انہیں خشک کرتے ہوئے وہ وہاں سے چلی گئی۔

وید نے اس کے جاتے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کر اپنا اٹکا ہوا سانس بحال کیا تھا۔

"آج تو رسوا ہوتے ہوتے بچ گئے۔" اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ کیا چیز ہے یار؟" موحد نے الجھے ہوئے لہجے میں کومیل سے پوچھا۔

"بہرحال کومیل حیدر صاحب! آپ آئندہ اس سوشل ورک پر قابو رکھیے گا۔ یہ خواہ مخواہ کی مصیبتیں اکثر گلے ہی نہیں پڑتیں، رسوا بھی کر دیتی ہیں۔" اشعر نے کومیل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اسے پھٹکارا تھا۔ کومیل خاموش رہا تھا۔ اس کی خاموشی نے انہیں کچھ حیران کیا تھا مگر پھر موضوع بدل گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ ان سب کے ذہنوں سے ثانیہ نکل گئی تھی مگر کومیل کے ذہن سے نہیں۔ پہلی بار کوئی لڑکی اس طرح اس کے سامنے روئی تھی۔ گھر جا کر بھی بار بار اس کے ذہن میں وہی آتی رہی۔ بہت عجیب سی فیلنگز محسوس کی تھیں اس نے۔ وہ کوئی بہت حسین و جمیل نہیں تھی مگر پھر بھی خوبصورت تھی۔ سفید رنگت کی مالک تھی، اور ناک نقشہ بھی اچھا تھا لیکن اس کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ بچوں کی طرح شفاف، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جو اس کے باقی چہرے کی طرح کسی سنگھار کے بغیر تھیں مگر بے حد دل فریب تھیں۔ لیکن کومیل اس کی خوبصورتی سے نہیں اس کی سادگی سے متاثر ہوا تھا جو غصہ اسے اس پر آیا تھا۔ وہ یونیورسٹی میں اس کے رونے پر ختم ہو گیا تھا بلکہ اسے شرمندگی ہوتی رہی کہ نہ وہ اس سے اس طرح بات کرتا نہ وہ اس طرح روتی۔

کومیل کا گروپ ڈیپارٹمنٹ کی کریم سمجھا جاتا تھا اس کے گروپ میں اس سمیت چار لوگ تھے اور وہ چاروں شروع سے ہی اکٹھے تھے۔ بیکن ہاؤس سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے گورنمنٹ کالج سے گریجویشن کی تھی اور اب یونیورسٹی میں تھے۔ اشعر، موحد اور کومیل کے خاندان کا تعلق بزنس سے تھا اور وہ ویسے بھی آپس میں جان پہچان رکھتے تھے جبکہ وید کے والد سول سروسز میں تھے۔

شروع سے کو ایجوکیشن میں پڑھنے کے باوجود ان کے گروپ میں کسی لڑکی کی شمولیت نہیں ہوئی تھی۔ کومیل کے علاوہ باقی تینوں کی کچھ لڑکیوں سے اچھی دوستی تھی مگر ان کا گروپ پھر بھی چار لوگوں تک ہی محدود تھا۔ پڑھائی میں چاروں اچھے تھے۔ اس لئے ہمیشہ ایک مقابلہ سا رہتا تھا ان میں۔ اور اسی مقابلے نے گورنمنٹ کالج اور اب یونیورسٹی میں انہیں کافی ریزرو کر دیا تھا۔ صنف نازک کو تو وہ ویسے ہی لفٹ نہیں کرواتے تھے جبکہ

لڑکوں سے بھی ان کی بس سلام دعا ہی ہوتی تھی اور یہ ان کے گروپ کا خاموش معاہدہ تھا کہ وہ کسی دوسرے کی مدد کے لئے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ گر کبھی کسی کو مدد کی ضرورت ہوتی تو باقی تینوں تو پھر مروتا کسی کا کام کر بھی دیتے تھے مگر کومیل اس معاملے میں بالکل بے لحاظ تھا۔

I keep myself to myself and want others to do the same thing.

(میں اپنے معاملات خود تک محدود رکھتا ہوں اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتا ہوں)

کسی اور کو اس اصول پر اعتراض ہو یا نہ ہو بہر حال اس کے دوستوں کو نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کی Moral Values (اخلاقی قدریں) بدلنے کی کوشش نہیں کرتے تھے نہ ان میں دخل اندازی کرتے تھے اور شاید اسی وجہ سے کومیل کی ان کے ساتھ اچھی نبھتی تھی۔ مگر اب پہلی دفعہ اس نے اپنے اصولوں کو توڑتے ہوئے کسی لڑکی کی مدد کی تھی۔ مدد کا نتیجہ تو خیر جو ہو سو ہو مگر وہ لڑکی کومیل کے دل میں نرم گوشہ بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”سنیں، آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟“ اس شناسا آواز پر وہ ایک گہری سانس لے کر پلٹا تھا۔ وہ پھر اس کے سامنے کھڑی تھی مگر اس بار کومیل کو اس پر غصہ آیا نہ الجھن ہوئی۔

”نہیں ثانیہ! میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں۔ کل مجھے غصہ آیا تھا اور کل ہی ختم ہو گیا۔ اس لئے آپ کو اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر دوبارہ بھی کبھی آپ کو میری مدد کی ضرورت ہو تو Just come straight to me (تو آپ سیدھی میرے پاس آئیں) مجھے اچھا لگے گا آپ کی مدد کر کے۔“

زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کو خود مدد کی آفر کی تھی۔ اگر اس کے کلاس فیلوز سن لیتے تو انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ آتا کہ یہ کومیل حیدر ہی ہے۔

ثانیہ کے چہرے پر تشکر آمیز مسکراہٹ لہرائی تھی۔ اس کے سر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ وہاں سے جا چکا تھا اور ثانیہ بے پناہ خوش تھی۔

پہلے دن صرف دو سبجیکٹس کی تعارفی کلاسز ہوئی تھیں۔ باقی تین پیریڈز میں کوئی نہیں آیا تھا۔ دوسرے دن ڈرامہ کی کلاس لینے کے لئے جو پروفیسر صاحب آئے تھے، انہوں نے اپنے ظاہری حلیے سے انہیں کافی چونکایا تھا۔ وہ عمر سے کسی طرح بھی پروفیسروں جیسے تجربہ کار نہیں لگ رہے تھے۔ پوری کلاس پوری طرح چوکنا تھی کیونکہ وہ کسی طرح بھی فائنل ایئرز کے ہاتھوں فول بننا نہیں چاہ رہے تھے۔ گاؤن پہنے ہوئے عینک کے ساتھ وہ حضرت بے حد سنجیدہ لگ رہے تھے لیکن کلاس کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ فائنل ایئر کا کوئی لڑکا ہے پھر ان کے چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی کہ کافی اسٹوڈنٹس کچھ شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ وہ صاحب سیدھا روسٹرم کی طرف گئے اور اپنی فائل اس پر رکھ دی پھر بڑی گھمبیر آواز میں اپنا تعارف کروانا شروع کیا۔

”میرا نام علی اکبر رضوی ہے اور میں آپ لوگوں کو ڈرامہ پڑھاؤں گا۔“

اسٹوڈنٹس نے ان دو جملوں کے بعد ایک دوسرے کے چہروں پر نظر دوڑائی تھی پھر ایک لڑکا کھڑا ہو گیا تھا۔

"لیکن پراسپیکٹس میں تو انگلش ڈیپارٹمنٹ میں ایسے کوئی پروفیسر نہیں ہیں نہ ہی آپ اتنی زیادہ عمر کے لگتے ہیں۔"

وہ لڑکا کافی ذہین لگتا تھا مگر روسٹرم کے پیچھے موجود صاحب کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نمودار ہوئی تھی نہ ہی پریشانی جھلکی تھی بلکہ ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر آ گئی تھی۔

"مجھے یونیورسٹی جوائن کیے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ دراصل میں کلاسیکل پوئٹری میں ڈاکٹریٹ کے لیے انگلینڈ گیا ہوا تھا اسکالرشپ پر۔ صرف ایک ہفتہ پہلے ہی میں نے دوبارہ یونیورسٹی جوائن کی ہے اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں زیادہ عمر کا نہیں لگتا تو میں تو اسے تعریف سمجھوں گا۔ بہرحال میں تقریباً چھتیس سال کا ہوں۔ اسٹوڈنٹ میں اچھا تھا اس لیے تعلیم مکمل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں جانتا ہوں شاید آپ لوگوں کو یہ شبہ ہوگا کہ میں فائنل ائیر سے ہوں اور آپ کو فول بنانے آیا ہوں۔ اس کا حل ایک ہی ہے کہ آپ میں سے کوئی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے پاس جا کر میرے بارے میں پوچھ لے بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ ابھی آپ لوگ میرے بارے میں تصدیق کر لیں۔"

انہوں نے بہت شائستگی سے ان کے شبہات دور کیے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا اور ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے پاس جاتا مگر پھر وہی لڑکا جس نے پہلے اعتراض کیا تھا اٹھ کھڑا ہوا۔

"سر پلیز! آپ مائنڈ مت کیجئے گا لیکن بہتر ہے کہ میں پوچھ آؤں۔"

اس نے اس بار کافی مؤدب انداز میں کہا تھا۔ ڈاکٹر علی رضوی کے چہرے پر موجود مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"بالکل آپ ضرور پوچھ کر آئیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

وہ لڑکا کلاس سے باہر گیا تھا لیکن پوری کلاس کو یقین ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر علی اکبر رضوی کوئی فراڈ نہیں ہیں۔

"میرا خیال ہے جتنی دیر میں واپس آئیں، میں آپ لوگوں کا نام اور رول نمبر رجسٹر کر لیتا ہوں۔"

انہوں نے اطمینان سے رجسٹر کھولتے ہوئے کہا تھا۔ پھر انہوں نے باری باری سب کے رول نمبر رجسٹر کر لیے۔ اسی دوران وہ لڑکا واپس آ گیا تھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"جی اب آپ کو یقین آ گیا کہ ڈرامہ آپ کو میں ہی پڑھاؤں گا اور میں اسسٹنٹ پروفیسر ہی ہوں؟"

اس لڑکے کے کلاس میں داخل ہونے پر ڈاکٹر علی اکبر رضوی نے کہا۔ وہ لڑکا کچھ جھینپتے ہوئے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رول نمبر اور نام رجسٹر کرنے کا کام تیزی سے ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر علی اکبر رضوی نے رجسٹر بند کر دیا اور کہنا شروع کیا۔

"آپ میں سے بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جنہیں ایم اے انگلش کرنا بہت مشکل لگتا ہوگا، خاص طور پر ڈرامہ کے بارے میں آپ نے بہت سے تبصرے سنے ہوں گے کہ یہ مشکل ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ دلچسپ نہیں۔ خاص طور پر شیکسپیئر ہو سکتا ہے کسی نے آپ سے یہ بھی کہا ہو کہ ڈرامہ میں صرف اللہ ہی پاس کروا سکتا ہے۔" وہ بڑے دوستانہ انداز میں اپنے سبجیکٹ کا تعارف کروا رہے تھے۔

"جب میں نے ایم اے میں داخلہ لیا تھا تو مجھے بھی ایسے ہی تبصرے سننے پڑے تھے۔ ڈرامہ میرے لیے ایک ہوّا بن گیا تھا۔ بہرحال

میں نے خود ہی اس کو سمجھنے کی کوشش کی اور پھر ڈرامہ میرے لئے ایک اتنی آسان چیز بن گیا کہ میں نے پی ایچ ڈی اس میں کرنے کے بجائے ایک دوسرے سبجیکٹ میں کی جو مجھے قدرے مشکل لگتا تھا۔“

کلاس بڑی دلچسپی سے ان کی بات سن رہی تھی۔

”میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں ابھی کچھ دن پہلے ہی انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کر کے لوٹا ہوں اور واپس آنے کے بعد میں نے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ سے یہ کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں کسی سبجیکٹ کو اچھے اور منفرد طریقے سے پڑھاؤں تو پھر آپ مجھے ڈرامہ پڑھانے کے لئے دیں کلاسیکل پوئٹری نہیں۔ انہوں نے میری درخواست مان لی اور مجھے ڈرامہ کی کلاس دی۔ لندن میں اسٹڈیز کے دوران میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا تھا کہ کسی سبجیکٹ کو کس طرح آسان بنا کر اسٹوڈنٹس کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور ایسا کیوں ہے کہ ہمارے اسٹوڈنٹس ڈرامہ جیسے سبجیکٹ میں اچھے نمبر نہیں لے پاتے۔ جو بنیادی وجہ میری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ٹیچرز آپ لوگوں کو ٹھیک طرح سے گائیڈ نہیں کرتے اگر پراپر گائیڈنس (رہنمائی) ہو تو میرا دعوی ہے کہ ڈرامہ آپ کے لئے سب سے آسان سبجیکٹ بن جائے گا اور میں آپ کو کچھ مختلف طریقے سے سبجیکٹ پڑھاؤں گا۔ اس روایتی اور گھسے پٹے طریقے سے نہیں جو اب تک چلتا آ رہا ہے۔“

ثانیہ سمیت پوری کلاس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی شخصیت بھی ان کے حلیے کی طرح الگ اور منفرد نظر آ رہی تھی۔

”آپ لوگوں کے پاس وہی گھسے پٹے نوٹس اور کی بکس ہوتی ہیں جو کئی سالوں سے لوگ استعمال کرتے آ رہے ہیں اور جن کا استعمال اب آپ کو چھوڑ دینا چاہئے۔ کم از کم لٹریچر پڑھتے ہوئے آپ کو رٹے سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔ میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا قائل نہیں ہوں آپ کو میرے پڑھانے کے طریقے سے پتا چل جائے گا کہ میں کس قدر Organized ہوں۔ میں آپ کو ہر ٹاپک پر لیکچر دوں گا اور آپ کو کچھ نوٹس بھی دیا کروں گا مگر وہ نوٹس رٹے لگانے کے لئے نہیں ہوں گے بلکہ ان سے آپ کو صرف بنیادی گائیڈنس ملے گی، بعد میں آپ کو خود اسائنمنٹس تیار کرنی ہوں گی۔ چونکہ آج پہلی بار میں نے آپ کی کلاس لی ہے اس لئے میں آپ کو آج ڈرامہ کے بارے میں کچھ تعارفی نوٹس دوں گا کیونکہ زیادہ وقت نہیں ہے اور آپ بہت زیادہ لکھ بھی نہیں سکیں گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ ان نوٹس کی فوٹو کاپی کروا لیں یہ نوٹس میں نے باہر انگلینڈ میں کچھ بہت اچھی کتابوں سے تیار کئے ہیں۔ اس لئے میرے لئے یہ بہت قیمتی ہیں میں آپ سب کو یہ باری باری فوٹو اسٹیٹ کروانے کے لئے نہیں دے سکتا۔ آپ میں سے کوئی ایک لڑکا یہ نوٹس مجھ سے لے لے اور صفحات گن کر سب سے اتنے روپے لے لے اور اکٹھی فوٹو کاپیز کروا کے آج ہی سب میں تقسیم کر دے۔ کل جب میں کلاس میں آؤں تو سب کے پاس یہ نوٹس ہونے چاہئیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان نوٹس کے مین پوائنٹ کیا ہیں۔“

ان کی بات کے اختتام پر اگلی رو میں بیٹھے ہوئے دو لڑکے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان میں سے ایک نے کہا تھا۔

”سر ہم فوٹو اسٹیٹ کروا دیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم سب سے آج ہی روپے جمع کر لو اور ایک صفحے پر ان کے نام بھی لکھ لو اور نوٹس ہر صورت میں آج ہی فوٹو اسٹیٹ کروا کر سب میں تقسیم کر دینا۔ اب ذرا دیکھ لو کہ یہ کتنے صفحات ہیں اور کتنے روپے لگیں گے۔“

انہوں نے نوٹس اس لڑکے کی طرف بڑھا دیئے تھے۔

"سر سو صفحات ہیں یعنی پچاس روپے لگیں گے۔"

اس لڑکے نے صفحات گننے کے بعد کہا تھا۔ کلاس میں موجود لوگوں نے باری باری اپنے بیگز اور والٹ کھولنے شروع کر دیئے تھے۔

"ٹھیک ہے آپ لوگ یہ کام کر لیجیے گا۔ اب کل ملاقات ہوگی۔"

ڈاکٹر علی اکبر رضوی اپنی فائل اٹھا کر باہر نکل گئے تھے۔

"I really like him yaar" (مجھے یہ بہت اچھے لگے ہیں) ثانیہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے دوسری سے کہا تھا۔

"بالکل اگر اس طرح ٹیچر محنت کروائیں اور گائیڈ کریں تو پھر تعلیم کا معیار کیوں بلند نہیں ہوگا۔" دوسری لڑکی نے بیگ سے روپے نکالتے ہوئے کہا تھا۔

ثانیہ نے بھی اپنے بیگ کو ٹٹولنا شروع کیا وہ جانتی تھی کہ بیگ میں صرف پچاس ہی روپے تھے اور اگر وہ یہ روپے دے دیتی تو پھر وہ گھر کیسے جاتی۔ کچھ دیر تک بیگ کے اندر ہاتھ ڈالے پچاس روپے مٹھی میں لیے وہ شش و پنج میں ان دو لڑکوں کو دیکھتی رہی جو ایک صفحے پر لڑکے اور لڑکیوں کے نام لکھنے کے بعد ان سے روپے لے رہے تھے پھر کچھ مردہ دلی سے اس نے پچاس کا نوٹ بیگ سے نکال ہی لیا تھا۔ شاہدرہ تک پیدل جانے کے خیال سے اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس نے بھی لڑکوں کو روپے دیئے اور اپنا نام لکھوا دیا۔

تقریباً پوری ہی کلاس نے روپے جمع کروا دیئے۔ روپے جمع کرنے کے بعد وہ دونوں لڑکے کلاس سے چلے گئے تھے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد سر جاوید کی کلاس شروع ہو گئی تھی۔ ثانیہ ان کے پورے لیکچر کے دوران پریشانی کے عالم میں رہی۔ وہ روز ویگن پر شاہدرہ سے آتی تھی اور ویگن پر شاہدرہ آنے پر بھی آدھ گھنٹے سے زیادہ لگ جاتا تھا اور پھر اس کو رستے کا بھی ٹھیک سے پتا نہیں تھا کیونکہ اس نے کبھی سڑکوں اور موڑوں پر زیادہ غور کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ پورے پیریڈ کے دوران وہ متفکر انداز میں ذہن میں رستے کا خیالی نقشہ بناتی رہی اور ہر نقشہ اسے گھر تک پہنچانے میں ناکام رہا تھا۔

سر جاوید کی کلاس آخری کلاس تھی اور جب بیل ہونے پر سر جاوید کلاس سے نکلے تو آہستہ آہستہ سب لوگ اپنی کتابیں بیگ اور فائلیں اٹھا کر باہر آنا شروع ہو گئے۔ وہ بھی اپنا بیگ اٹھا کر کلاس سے باہر نکل آئی۔

باہر نکلتے ہی سامنے لان میں ایک ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔ پوری فائنل ایئر وہاں جمع تھی اور ڈاکٹر علی رضوی اوپر سے کوک کی بوتلیں کھول کر فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹس کو تھما رہے تھے۔ بوتلز کے کریٹس کے ساتھ ساتھ ان میں لنچ باکسز کا ڈھیر بھی نظر آ رہا تھا۔ قہقہوں اور ہنسی کا ایک طوفان تھا جو وہاں آیا ہوا تھا۔ پریویس کے لڑکے لڑکیاں بے حد سراسیمگی اور کچھ صدمے کے عالم میں برآمدے میں کھڑے تھے۔ وہ چند لڑکیوں کے پاس چلی گئی۔

"یہ فائنل ایئر کوئی پارٹی کر رہی ہے؟" اس نے ان سے پوچھا تھا۔

بے حد ملامت انگیز نظروں سے اسے گھورا گیا تھا۔

"یہ پارٹی نہیں کر رہے۔ ہمیں فول بنایا ہے انہوں نے۔ ہمارے پیسے اڑا رہے ہیں یہ خبیث۔ آپ دیکھ نہیں رہیں۔ اس فراڈیے ڈاکٹر

علی اکبر رضوی کو۔"

اس لڑکی نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا ثانیہ کا دل ڈوب گیا تھا۔ "تو جو روپے انہوں نے نوٹس کے لئے لیے تھے۔ یہ ان سے یہ سب لکھا رہے ہیں۔" اس کی آواز کسی کھائی سے نکلی تھی۔

"اور کیا کر رہے ہیں؟"

ثانیہ شدید صدمے کے عالم میں لان میں موجود اس مجمع اور ہنگامے کو دیکھتی رہ گئی۔ "مگر وہ سر نسیم نے بھی تو کہا تھا کہ ڈاکٹر علی اکبر رضوی....." اس نے پتا نہیں کس آس میں پوچھا تھا۔

"بھئی پتا نہیں آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا۔ وہ لڑکا جو پوچھنے گیا تھا اور وہ جو روپے اکٹھے کر رہے تھے۔ وہ بھی فائنل ائیر کے ہی ہیں۔ وہ دیکھیں سامنے لان کے کونے میں۔ انہوں نے باقاعدہ پلان کر کے سارا کام کیا ہے۔"

اس لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے لان کی طرف اسے متوجہ کیا تھا۔ شہدرہ تک کا فاصلہ اسے دوگنا لگنے لگا تھا۔ پریویس کا کوئی اسٹوڈنٹ ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا رہا تھا اور اتفاقاً نظر ملنے پر کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگتا تھا۔ وہ کوریڈور کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ہونٹ بھینچتے ہوئے آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی لیے سامنے لان کو دیکھنے لگی جہاں قہقہے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ پریویس کے اسٹوڈنٹس نے آہستہ آہستہ وہاں سے جانا شروع کر دیا تھا۔ مگر وہ وہیں دیوار کے ساتھ لگی رہی۔

پھر پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا آیا تھا۔ وہ یک دم لان کی طرف آ گئی اور فائنل ائیر کی ایک لڑکی سے پوچھا۔

"ایکسکیوزمی۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں اس وقت کومیل حیدر کہاں ہیں؟" وہ لڑکی کوک کا سپ لیتے ہوئے رک گئی۔

"لائبریری میں دیکھیں، وہ وہیں ہوگا۔" اس لڑکی نے کہا تھا۔

وہ تیزی سے لائبریری کی طرف آ گئی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک کونے میں کومیل کو دیکھ لیا تھا، اس کے دوست آج بھی اس کے ساتھ ہی تھے۔ وہ کچھ نوٹس بنانے میں مصروف تھے۔ وہ بڑی تیزی سے اس کے پاس آ گئی تھی۔

"ایکسکیوزمی کومیل! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" وہ اس کی آواز پر چونک اٹھا تھا۔ ولید اور موحد نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"آپ بیٹھیں۔" کومیل نے اسے کرسی آفر کی تھی۔

"نہیں، مجھے بیٹھنا نہیں۔ آپ پلیز میرے ساتھ چلیں۔" اس نے تیزی سے کہا تھا۔

"کہاں جانا ہے؟" کومیل نے حیرانی سے سوال کیا تھا۔

"میں آپ کو بتا دوں گی۔ آپ پلیز آئیں تو سہی۔"

وہ التجائیہ انداز میں بولی تھی۔ کومیل نے موحد اور ولید کی طرف دیکھا۔ جن کی نظریں ان دونوں پر مرکوز تھیں پھر بادل نخواستہ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔" اس نے کچھ جھینپتے ہوئے ان سے کہا تھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بڑے بے تاثر انداز میں

دوبارہ کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آئیں۔" اس نے ثانیہ سے کہا تھا۔ وہ اس کے آگے چلنے لگی۔ لائبریری سے باہر آتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا تھا۔

"آپ کی کلاس نے ہمارے ساتھ فراڈ کیا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ اسے تفصیل بتانے لگی تھی۔

"پلیز آپ ان سے میرے روپے لے دیں۔ مجھے یہاں سے شاہدرہ جانا ہے اور میرے پاس بس دس روپے تھے۔ میں پیدل کیسے جاؤں گی۔ مجھے تو راستہ بھی صحیح پتہ نہیں۔ پلیز اگر سارے نہیں تو ان سے بیس روپے ہی لے دیں۔"

اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی سے کومیل کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ "پریشانی والی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کو جتنے روپے چاہئیں، آپ مجھ سے لے لیں۔"

اس نے اپنا والٹ نکال لیا تھا۔ وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔

"نہیں۔ مجھے آپ سے روپے نہیں چاہئیں۔ میں اس لئے نہیں آئی تھی آپ مجھے ان سے روپے لے کر دیں۔"

وہ والٹ کھولتے کھولتے رک گیا تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔

"او کے پھر آپ یہیں ٹھہریں۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" ثانیہ کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ وہ وہاں سے چلا گیا تھا تقریباً دس منٹ بعد وہ واپس آیا تھا۔

"یہ لیں اور آئندہ کچھ سوچ کر کسی کو روپے دیا کریں۔"

اس نے پچاس کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ ثانیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھر آئی تھی۔

"اس نے اتنی جلدی واپس کر دیئے۔" اس نے کومیل کے ہاتھ سے روپے لیتے ہوئے بڑے جوش کے عالم میں کہا تھا۔

"ہاں مگر اب کسی اور کو مت کہنا یہ سب کیونکہ وہ سب کے روپے تو نہیں لوٹائے گا۔"

کومیل جاتے جاتے اسے تاکید کرنے لگا تھا۔

"نہیں میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔" وہ سر ہلاتے ہوئے چلا گیا تھا۔ وہ بھی تیز تیز قدموں سے پوائنٹ کی طرف آ گئی۔

کومیل نے اسے روپے اپنے پاس سے ہی دیئے تھے کیونکہ وہ پچاس روپے واپس لینے کے لئے اسد کے پاس تو نہیں جا سکتا تھا۔ اب اسے خیال آیا تھا کہ اسے پہلے ہی ثانیہ کو اس پلان کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا جو فائنل ایئر نے بنایا تھا۔ اگرچہ وہ اس پلان میں شامل نہیں تھا لیکن اس کو اس پورے پلان کا اچھی طرح پتا تھا۔

اس دن وہ صبح ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا ہی رہا تھا کہ وہ شناسا آواز اسے ایک بار پھر سنائی دی تھی۔

"ایکسکیوز می کومیل! کیا آپ میرا ایک کام کر سکتے ہیں؟" وہ پیچھے مڑا اور کچھ جتانے والے انداز میں اس نے کہا۔ "السلام علیکم!"

وہ کچھ جھینپ گئی تھی۔ "مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔" وہ منمنائی۔

"السلام علیکم!" کومیل نے ایک بار پھر اسی انداز میں سلام دہرایا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے اس بار کچھ شرمندگی سے جواب دیا تھا۔

"ہو جائے گا کام۔ کیا کام ہے؟" اس بار کومیل نے پوچھا تھا۔

"مجھے ہاسٹل میں کمرہ نہیں مل رہا۔"

"کمرہ کیوں چاہیے آپ کو۔ آپ تو کسی کے پاس رہتی ہیں ناں؟"

جی رہتی ہوں لیکن شاہدرہ سے روز آنے جانے میں بہت وقت لگ جاتا ہے۔ پھر بعض دفعہ ویگن ہی نہیں ملتی۔ بہت دیر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ پھر خالہ کا گھر بھی چھوٹا ہے تو اب مجھے اچھا نہیں لگ رہا وہاں رہتے ہوئے۔ میں نے بابا سے بھی بات کی ہے، وہ بھی کہتے ہیں کہ ہاسٹل ہی صحیح رہے گا مگر ہاسٹل میں سفارش کے بغیر کسی کو جگہ نہیں مل رہی۔" وہ بے تکلفی سے اسے بتاتی گئی تھی۔

"کمرہ مل جائے گا آپ کل ہاسٹل چلی جائیے گا۔" کومیل نے یہ کہہ کر قدم آگے بڑھائے تھے مگر وہ تیزی سے سامنے آ گئی تھی۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ کمرہ مل جائے گا؟" اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔ "آپ کمرہ کیسے لے کر دیں گے؟"

اس نے سوال کیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرایا۔ پہلے دن کی روداد اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی تھی۔

"جب میں نے کہا ہے کہ لے دوں گا تو بس مان لو کہ لے دوں گا۔ کیوں اور کیسے اس کو چھوڑیں۔"

وہ یہ کہہ کر چلا گیا تھا۔ ثانیہ کو امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے کمرہ دلوانے کی ہامی بھر لے گا۔ اس نے تو بس ایک موہوم سی امید پر ہر طرف سے مایوس ہو کر اس سے بات کی تھی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اس معاملے میں اس کی مدد کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگلے دن وہ ہاسٹل گئی تھی اور واقعی اسے ہاسٹل میں جگہ مل گئی تھی۔ اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔

"کومیل! مجھے تو واقعی ہاسٹل میں جگہ مل گئی۔" دوسرے دن وہ موحد کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں میں بیٹھا ہوا تھا جب وہ اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی۔ کومیل نے کن انکھیوں سے موحد کو دیکھا جو بڑی سرد مہری سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاسٹل میں کمرہ دینا کوئی بہت مشکل کام بھی نہیں ہے۔" اس نے موحد سے نظریں چراتے ہوئے ثانیہ سے کہا۔

"میرے لیے تو بہت مشکل تھا۔ میری تو کوئی بات ہی نہیں سنتا تھا وہاں۔" وہ بے حد تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"چلیں خیر۔ آپ کا کام تو ہو گیا۔"

"ہاں اور میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ آپ "

کومیل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اٹس آل رائٹ۔ شکریہ کی ضرورت نہیں۔" وہ مسکراہٹ چہرے پر لیے وہاں سے چلی گئی تھی۔

"میرا خیال ہے اب کلاس میں چلنا چاہیے بیل ہونے والی ہے۔" کومیل نے گھڑی دیکھتے ہوئے موحد سے کہا تھا۔

"تم نے اسے ہاسٹل میں کمرہ لے کر دیا ہے؟" موحد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بڑے تیکھے انداز میں سوال کیا تھا۔

"ہاں۔"

"کیوں؟" موحد کا لہجہ اس بار بھی کھردرا تھا۔

"کیوں کیا یار وہ پریشان تھی۔ اسے ہاسٹل میں جگہ نہیں مل پا رہی تھی۔ تمہیں پتا ہے، وہاں سفارش کے بغیر جگہ نہیں ملتی ورنہ میں نے کروا دی۔ ظاہر ہے، وہ بے چاری سرگودھا سے آئی ہے۔ یہاں کون ہے جو اس کی مدد کرے۔"

کومیل نے کافی لاپرواہی سے وضاحت کی تھی۔ اس کا خیال تھا موحد دوبارہ سوال نہیں کرے گا مگر موحد نے کچھ دیر تک بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد کہا تھا۔

Komail aren't you getting too philanthropic now a days?

(کومیل! تم آج کل کچھ زیادہ ہی ہمدرد نہیں ہوتے جا رہے ہو؟)

وہ موحد کے سوال پر ساکت ہو گیا تھا۔

"What made your think that?"

(اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟)

اس نے کچھ تیز آواز میں اسے کہا تھا۔

"Aren't you getting too far to help her? I mean its not your style."

(تم اس کی کچھ زیادہ ہی مدد نہیں کر رہے ہو، میرا مطلب ہے کہ یہ تمہارا اسٹائل نہیں ہے۔)

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا اور نہ تمہیں میری بات کہنے کا کوئی حق ہے۔" وہ کھردرے لہجے میں کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"دیکھو کومیل" موحد نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کومیل نے بڑی درشتی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ "میں کچھ دیکھنا نہیں چاہتا۔

You just keep your mouth shut.

(تمہیں اپنی زبان بند رکھنا چاہیے)"

موحد حیرانی سے اسے جاتے دیکھتا رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اتنی معمولی سی بات پر یوں غصے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ کافی دیر تک ہونٹ بھینچے وہیں کھڑا رہا پھر وہ بھی کلاس میں چلا گیا۔

دونوں کے درمیان کون سا رابطہ تھا۔ یہ شاید وہ اور ثانیہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ بس یہ تھا کہ ثانیہ کو جب بھی کسی معاملے میں کوئی مشکل پیش آتی وہ کسی روبوٹ کی طرح اس کے پاس چلی آتی اور کومیل حیدر جو کبھی کسی کی مدد نہیں کرتا تھا وہ کسی معمول کی طرح وہی کرتا جو وہ چاہتی۔

موحد نے اس واقعہ کے بعد دوبارہ کومیل سے ثانیہ کے سلسلے میں بات نہیں کی تھی۔ مگر اسے اب بھی یہ "فلاح عامہ" کا کام بے حد ناپسند تھا اور نہ صرف موحد بلکہ اشعر اور رومید کو بھی حیرت ہوتی تھی کہ کومیل کیوں اس طرح اس لڑکی کی مدد کر رہا ہے اور سب سے زیادہ حیرت انہیں تب ہوئی تھی

جب ایک دن ثانیہ نے اس کے سامنے کومیل سے پریویس کے اس کے تیار کردہ نوٹس مانگے تھے اور کومیل نے نہ صرف نوٹس دینے کی فوراً ہامی بھری تھی بلکہ دوسرے دن ہی وہ اپنی پوری فائل فوٹو اسٹیٹ کروا کے لیے آیا تھا۔

"تم دیکھ لینا کومیل! کچھ دنوں بعد تمہارے یہ نوٹس پارٹ ون کے ہر دوسرے اسٹوڈنٹ کے پاس ہوں گے کیونکہ جن محترمہ کو تم یہ نوٹس دیئے جا رہے ہو، وہ صرف بے وقوف نہیں بلکہ عقل سے بالکل پیدل ہیں۔"

موحد نے اسے سمجھانے کی پہلی اور آخری کوشش کی تھی مگر اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔

"نہیں۔ میں اسے سمجھا دوں گا وہ کسی اور کو نہیں دے گی۔"

کومیل نے اس کی نصیحت کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا تھا۔ موحد کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی تھی۔ چند دنوں کے اندر ہی تقریباً پوری کلاس کے پاس وہ نوٹس تھے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کومیل حیدر کے نوٹس یوں سرِ عام آئے تھے۔

"مبارک ہو بھئی، بڑے مقبول ہو رہے ہیں تمہارے نوٹس، پارٹ ون کے اسٹوڈنٹس میں۔"

وہ اس دن موحد کے طنز پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ موڈ اس کا پہلے ہی سے خراب تھا۔ کیونکہ اس نے خود بھی اس دن ایک دو لڑکوں کے ہاتھ میں اپنے نوٹس کی فوٹو کاپیز دیکھی تھیں۔

"تم سے میں نے کہا تھا کہ یہ نوٹس کسی اور کو مت دینا اور تم نے پورے ڈپارٹمنٹ میں انہیں ردی کی طرح پھیلا دیا ہے۔"

اس دن وہ ثانیہ کو دیکھتے ہی اس پر برس پڑا تھا۔

"میں نے سب لوگوں کو نہیں دیئے۔ میں نے صرف اپنی روم میٹ کو دیئے تھے۔ باقی لوگوں تک نوٹس کیسے پہنچے مجھے معلوم نہیں۔" وہ خود خاصی شرمندہ تھی۔

"روم میٹ کو بھی کیوں دیئے تھے۔ میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ کسی کو بھی مت دینا۔" اس کا غصہ اور بڑھ گیا تھا۔

"اس نے خود مجھ سے مانگے تھے پھر میں انکار کیسے کرتی۔" ثانیہ نے بے بسی سے کہا تھا۔

"ایک بات تو طے ہے کہ میں نے پہلی اور آخری دفعہ تمہیں نوٹس دیئے ہیں، اب دوبارہ تم مجھ سے اس سلسلے میں کسی قسم کی مدد کی امید مت رکھنا۔" اسے ثانیہ کی شکل اور جھکا ہوا سر دیکھ کر مزید غصہ آ رہا تھا۔

"میں وعدہ کرتی ہوں، میں آئندہ کبھی کسی کو بھی نہیں دوں گی۔" اس نے ملتجیانہ انداز میں کہا تھا۔

"آئندہ میں نوٹس دوں گا، تب ہی کسی کو دو گی نا۔" وہ رکھائی سے کہہ کر چلا گیا تھا۔ لیکن کومیل کا یہ فیصلہ ریت کی لکیر کی طرح ثابت ہوا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد ثانیہ کو پھر کچھ نوٹس کی ضرورت آن پڑی تھی اور حسبِ عادت پھر اسی کے پاس آئی تھی اور کومیل اپنے حتمی فیصلے کے باوجود پھر سے نوٹس دینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس بار ثانیہ نے کچھ احتیاط کی تھی، وہ ان نوٹس کو چھپا کر ہی رکھتی تھی۔

"کومیل میرے بابا آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آئیں، میں آپ کو ان سے ملواؤں۔"

اس دن وہ پھر اپنے دوستوں کے کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہوا تھا جب وہ بہت پُرجوش سی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آئی تھی۔ کومیل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ صورتِ حال اس کے لئے کافی آکورڈ تھی۔ لیکن پھر وہ دوستوں کی تیکھی اور چبھتی ہوئی نظروں کی پروا کئے بغیر اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔

"لو بھئی، اب ابا جی بھی پہنچ گئے ہیں۔ بس ان ہی کی انٹری رہ گئی تھی۔" اشعر نے اس کے جاتے ہی کہا تھا۔

"کومیل ایسا تو نہیں تھا یار! اسے ہو کیا گیا ہے۔ تمہیں یاد ہے، وہ کس طرح شروع سے لڑکیوں سے بدکتا رہا ہے، اور اب تم ذرا اس کا حال دیکھو۔ ثانیہ کو دیکھتے ہی کیسے اس کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔" ولید کو صحیح معنوں میں اس کی فکر ہونے لگی تھی۔

"بس یار! اب صورتِ حال قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے ہمیں اسے سمجھانا چاہئے، بات کرنی چاہئے اس سے، وہ جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک نہیں کر رہا۔"

اشعر نے ان دونوں سے کہا تھا۔

"تمہیں اگر انسلٹ کروانے کا شوق ہے تو ضرور اس سے بات کرو مگر مجھے ایسا کوئی شوق نہیں۔ وہ کوئی ببل کا بچہ نہیں ہے کہ جو کچھ کر رہا ہے، اس کے نتیجے سے واقف ہی نہ ہو لیکن اگر وہ پھر بھی یوں بے پروا ہے تو ٹھیک ہے ہمیں اس کے ذاتی معاملات سے کیا۔"

سعود نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ اشعر اور ولید نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموش ہو گئے۔

"بابا! یہ کومیل ہیں۔" وہ اسے بڑے جوش کے عالم میں ایک ادھیڑ عمر شخص کے پاس لے کر آئی تھی۔ کومیل نے جھینپتے ہوئے اس آدمی سے ہاتھ ملایا۔

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ ثانی مجھے بتایا تھا کہ آپ اس کی بہت مدد کرتے رہتے ہیں۔" اس شخص نے انکساری سے کہا۔

کومیل کچھ اور جھینپ گیا۔

"نہیں۔ میں نے ایسی بھی کوئی خاص مدد نہیں کی۔ یہ تو بہت معمولی سے کام تھے، کوئی بھی کر دیتا۔"

"پھر بھی بیٹا! میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ نے "

کومیل نے ثانیہ کے باپ کی بات کاٹ دی۔ "پلیز آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگ رہا آپ کا یہ سب کہنا۔"

کومیل نے یہ بات کہہ کر موضوع بدل دیا کچھ دیر وہ ان سے باتیں کرتا رہا، اور پھر اجازت لے کر واپس کیفے ٹیریا آ گیا۔

اس دن وہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھی کچھ نوٹس دیکھنے میں مصروف تھی جب ہیلو کی آواز پر اس نے سر اٹھایا تھا۔ لائٹ بلو جینز میں ملبوس ایک لڑکی چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ لئے اس کے پاس کھڑی تھی۔

"میرا نام روابہ ہے۔ میں فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ہاسٹل میں رہتی ہوں۔"

اس لڑکی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ ثانیہ نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔

"میرا نام ثانیہ ہے میں پریوس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں بھی ہاسٹل میں رہتی ہوں۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے اپنا تعارف کروایا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔ میں نے کئی بار ہاسٹل میں تمہیں دیکھا ہے۔"

رودابہ یہ کہتے ہوئے بے تکلفی سے اس کے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔ ثانیہ کچھ نروس سی ہو گئی۔ اس کی نظریں رودابہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ سفید شرٹ اور بلو جینز میں ملبوس اسٹیپس میں کٹے ہوئے کھلے بالوں کے ساتھ وہ ایک قیامت لگ رہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ رودابہ کا چہرہ ثانیہ کے لئے نیا تھا وہ پورے ڈپارٹمنٹ میں اپنی خوبصورتی اور دولت کی وجہ سے مشہور تھی اور اس وقت جہاں ثانیہ نروس ہو رہی تھی، وہیں اس کو عجیب قسم کے تفاخر کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ رودابہ کچھ دیر تک اس سے اس کے بارے میں پوچھتی رہی اور ساتھ ساتھ اپنے بارے میں بتاتی رہی پھر یک دم اس نے پوچھا۔

"ثانیہ! کومیل سے تمہاری کوئی رشتہ داری ہے؟"

ثانیہ نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ "نہیں تو۔"

"تو پھر کیا دوستی ہے؟" رودابہ نے فوراً ہی دوسرا سوال کیا تھا۔

"پتا نہیں۔ اسے دوستی کہتے ہیں یا نہیں۔ بس یہ ہے کہ مجھے کبھی کوئی مشکل پیش آتی ہے تو میں کومیل سے کہہ دیتی ہوں اور وہ میرا کام کر دیتے ہیں۔" ثانیہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

رودابہ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "یار! دوستی اور کس کو کہتے ہیں۔ ویسے ایک بات ہے۔ اس نے کبھی کسی کا کام کیا نہیں۔ اس معاملے میں بلکہ ہر معاملے میں وہ خاصا بے مروت ہے۔" رودابہ نے کچھ عجیب سے انداز میں کہا تھا۔

"نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں تو جب بھی ان کے پاس جاتی ہوں وہ میرا کام فوراً کر دیتے ہیں۔ اگر آپ بھی جائیں تو آپ کا بھی کر دیں گے۔ وہ تو بہت نائس ہیں۔" ثانیہ نے فوراً اس کی صفائی پیش کی۔

"اچھا چلو، کبھی آزمائیں گے تمہاری بات کو۔"

اس کے چہرے پر نظر جمائے رودابہ نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا کچھ دیر اس کے پاس رکنے کے بعد وہ چلی گئی تھی وہ رودابہ کے ساتھ اس کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ رودابہ اس کے بعد بھی اس کے ساتھ ملتی رہی تھی اور ان کی بے تکلفی بڑھتی گئی تھی کہ رودابہ نے اسے ہاسٹل میں اپنے کمرے میں شفٹ ہونے کی پیش کش کی جو ثانیہ نے اعزاز سمجھ کر قبول کر لی۔

رودابہ کا گھر لاہور ہی میں تھا اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کے والد مرچنٹ نیوی سے وابستہ تھے اور اس وجہ سے زیادہ تر ملک سے باہر ہی ہوتے تھے، امی سوشل ورک میں اتنی مصروف رہتی تھیں کہ بہت کم گھر پر ہوتی تھیں۔ رودابہ نے اسی تنہائی سے گھبرا کر ہوسٹل میں کمرہ لے لیا تھا اور ثانیہ کو اس کی تنہائی کا جان کر اس سے اور بھی ہمدردی ہو گئی تھی۔

رودابہ سے اس کی بڑھتی ہوئی دوستی کومیل سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

"ثانیہ! تم آج کل رودابہ کے ساتھ اتنا کیوں رہنے لگی ہو؟" اس دن لائبریری کی طرف جاتے ہوئے کومیل نے اسے روک کر پوچھ لیا تھا۔

"میری اور رودابہ کی دوستی ہو گئی ہے اور میں ہاسٹل میں بھی اس کے کمرے میں شفٹ ہو گئی ہوں۔" ثانیہ نے فخریہ انداز میں بتایا تھا لیکن کومیل کا ردعمل کوئی زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

"کیوں؟"

"رودابہ نے خود مجھے اپنے کمرے میں شفٹ ہونے کے لئے کہا ہے۔"

وہ کچھ الجھے ہوئے انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"دیکھو ثانیہ! تمہارا اور رودابہ کا کوئی میچ نہیں ہے۔ تم دونوں کے درمیان کچھ بھی کامن نہیں ہے، رودابہ جیسی لڑکیاں بغیر کسی مقصد کے ایسے ہی دوستی نہیں کرتی ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اس سے دور رہو۔"

چند لمحوں بعد کومیل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن ثانیہ کو اس کی بات بری لگی۔

"وہ میری بیسٹ فرینڈ ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔" اس نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ اس کا مشورہ قبول نہیں کرے گی۔

کومیل کچھ دیر خفگی سے اسے دیکھتا رہا اور پھر اسی موڈ میں وہاں سے چلا گیا۔ ثانیہ کو اس کی ناراضگی یا خفگی کی قطعاً پروا نہیں تھی بلکہ وہ خود بھی اس سے کھنچ گئی۔ اب جب بھی کومیل سے اس کا سامنا ہوتا، وہ پہلے کی طرح اس سے سلام دعا کرنے کے بجائے نظریں جھکائے اس کے پاس سے گزر جاتی۔ کچھ تک کومیل بھی اسے نظر انداز کرتا رہا لیکن پھر وہ رہ نہیں سکا۔

"تم ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟" ایک ہفتے کے بعد اس دن گزرتے گزرتے کومیل نے اس سے پوچھ لیا تھا۔

ثانیہ نے کچھ ندامت محسوس کی۔ "نہیں۔ میں ناراض تو نہیں ہوں۔" اس کی ناراضگی فوراً ختم ہو گئی۔

کومیل نے ایک گہرا سانس لیا۔ "بہرحال میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں آئندہ تمہیں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ مجھے مشورہ نہ دیں۔ بس رودابہ کے بارے میں کچھ نہ کہیں وہ میری بیسٹ فرینڈ بن چکی ہے۔" ثانیہ نے کچھ بے چین ہو کر کہا تھا۔ اسے بے اختیار اس کی نوازشات یاد آ گئی تھیں۔

"میں دعا کروں گا کہ تمہاری بہترین دوست تمہاری بدترین دوست ثابت نہ ہو۔ خیر اسٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟"

کومیل نے موضوع بدل دیا، اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اب رودابہ کے بارے میں اس سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ مگر اس کا یہ فیصلہ پانی پر لکیر ثابت ہوا۔ تیسرے دن ہی اس نے ثانیہ کو رودابہ کے ساتھ کلاس چھوڑ کر یونیورسٹی سے جاتے دیکھ لیا تھا اور پھر ایسا ایک دن نہیں ہوا تھا۔ ثانیہ، رودابہ اور اس کی دوسری فرینڈز کے ساتھ اکثر کلاسز مس کرنے لگی تھی۔ کچھ دن تو وہ بڑے تحمل سے یہ سب برداشت کرتا رہا لیکن پھر یہ سب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔

اس دن اس نے ثانیہ کو رودابہ کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اترتے دیکھا تو اس نے ثانیہ کو روک لیا۔

"ثانیہ! تمہاری ڈرامہ کی کلاس ہونے والی ہے تم کہاں جا رہی ہو؟"

اس نے بغیر کسی لحاظ کے اس سے کہہ دیا تھا۔ ثانیہ کچھ گڑبڑا گئی۔

"وہ میں... میں... میں کام سے جا رہی ہوں۔" اس نے بہانہ تراشا تھا۔

"کیا کام ہے؟" کومیل نے سرد لہجے میں کہا تھا۔ ثانیہ کا باقی ماندہ رنگ بھی فق ہو گیا۔ اس نے بے بسی سے رودابہ کو دیکھا جو عجیب سے انداز میں کومیل پر نظریں مرکوز کیے کھڑی تھی۔

"تمہیں جو کام بھی ہے۔ وہ واپس جانے کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرح کلاس چھوڑ کر جانا اور پھر بار بار ایسا کرنا کوئی مناسب بات نہیں ہے۔ ویسے بھی تم کوئی اتنی ذہین ہو بھی نہیں کہ کلاس اٹینڈ کیے بغیر بھی پڑھ سکو اس لئے واپس کلاس میں جاؤ۔"

ثانیہ نے سر جھکائے ہوئے بغیر کسی مداخلت کے اس کی بات سنی تھی۔

"مجھے ایک ضروری کام ہے، اس لئے مجھے اس طرح جانا پڑ رہا ہے۔" اس بار رودابہ بول اٹھی تھی۔

"تو آپ جائیں۔ میں نے آپ کو تو نہیں روکا۔" کومیل نے کمال درجے کی بے نیازی سے کہا تھا۔

"ثانیہ میرے ساتھ جا رہی ہے۔" رودابہ کے چہرے کا رنگ کچھ بدل گیا تھا۔

"نہیں۔ ثانیہ آپ کے ساتھ نہیں جا رہی۔ وہ کلاس میں جائے گی۔ ثانیہ! تم کلاس میں جاؤ۔"

کومیل نے ثانیہ سے کچھ سختی سے کہا تھا۔

وہ کچھ خجالت آمیز نظروں سے رودابہ کو دیکھنے لگی جو اس کو گھور رہی تھی۔ اسی وقت بیل ہونے لگی تھی۔ کومیل نے کچھ کہے بغیر ہاتھ کے اشارے سے ثانیہ کو واپس جانے کو کہا تھا اور وہ بے چارگی سے رودابہ سے نظریں چراتے ہوئے واپس برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ کومیل بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا۔ روداب وہیں کھڑی سرخ چہرے کے ساتھ اس کی پشت کو گھورتی رہی۔

کومیل نے اسے صرف وہیں نہیں روکا تھا بلکہ بعد میں بھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی تھی۔ ثانیہ نے اس سے جھوٹ بولنے کی کوشش کی مگر اس کے پاس پوری معلومات تھیں کہ وہ پچھلے ہفتے میں کس کس دن کون سی کلاسز چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ثانیہ اس سے کچھ خائف ہو گئی۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ وہ اسے جس بات سے منع کر رہا ہے وہ واقعی غلط ہے اور اس طرح اس کی اسٹڈیز کا بھی حرج ہو رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ آئندہ کلاس چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ اس دن ہاسٹل واپسی پر اسے توقع تھی کہ رودابہ کا موڈ خراب ہوگا اور وہ اس سے ناراض ہوگی مگر خلاف توقع وہ خوشگوار موڈ میں تھی اور اس نے اس بات کا ذکر نہیں کیا ثانیہ نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

"ثانیہ! کل شام مجھے کنسرٹ پر جانا ہے۔ تم چلو گی؟" چند دن گزر جانے کے بعد ایک دن رودابہ نے اس سے کہا تھا۔

ثانیہ بے تابی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "ہاں ضرور چلوں گی لیکن وارڈن شام کو باہر جانے کی اجازت دیں گی؟"

"وہ میرا مسئلہ ہے۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ ساتھ چلو گی یا نہیں؟" رودابہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے لاپروائی سے کہا تھا۔

"ہاں بھئی، جاؤں گی۔ ضرور جاؤں گی۔ اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔"

اس نے پرجوش انداز میں کہا تھا۔ روداب نے دوسرے دن واقعی بڑی آسانی سے وارڈن سے اجازت لے لی تھی۔

"تم اس قدر خوبصورت ہو ثانیہ! کہ اگر اچھی طرح میک اپ کیے رکھو تو پتا نہیں کتنوں کے دل گھائل کرو گی۔"

وہ کپڑے بدل کر آئی تو روداب اس کا میک اپ کرنے لگی۔

اس نے میک اپ کرنے کے بعد ثانیہ کو آئینے کے سامنے کر دیا۔ پہلی نظر میں ثانیہ خود کو پہچان ہی نہیں سکی۔

"روداب! میں تو واقعی بہت اچھی لگ رہی ہوں۔" وہ خود کو سراہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

"اچھی نہیں، کہو، میں پری لگ رہی ہوں پری۔" روداب نے اسے پیار سے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

ثانیہ کچھ جھینپ گئی۔ اس نے تیار ہونے کے بعد حسب معمول اوڑھنے کے لیے چادر اٹھائی مگر روداب چیل کی طرح اس پر جھپٹی۔

"خدا کا خوف کرو ثانیہ! یہ برقع نما چادر پہن کر تم کنسرٹ دیکھنے جاؤ گی۔ تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی تماشا بناؤ گی۔ میں نے جینز پہنی ہوئی ہے اور تم یہ دس گز لمبا تھان لپیٹ رہی ہو۔" روداب نے چادر اس سے چھین کر اپنی الماری میں ٹھونس دی۔

"تو پھر میں کیا اوڑھوں؟" وہ کچھ جھینپ گئی تھی۔

"دوپٹہ کافی ہے گلے میں۔ اب ان لمبی لمبی چادروں سے جان چھڑ لو۔ اب تم لاہور میں ہو۔ کسی گاؤں میں نہیں اور نہ ہی تم کہیں قل سننے جا رہی ہو۔"

روداب نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا اور پھر ثانیہ نے ویسا ہی کیا تھا جیسا روداب چاہتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ یوں دوپٹہ سینے پر پھیلائے اتنا ڈارک میک اپ کر کے کہیں گئی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ہر شخص اسی پر نظریں گاڑے بیٹھا ہو۔

کنسرٹ گیارہ بجے ختم ہوا تھا اور وہ روداب کے ساتھ اوپن ایئر تھیٹر سے باہر نکلی تھی تب ہی روداب کو کوئی نظر آیا۔

"ثانیہ! تم ایک منٹ یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" وہ اسے وہیں کھڑا کر کے غائب ہو گئی۔

ثانیہ پریشان ہو گئی تھی۔ لوگ بڑی تعداد میں اوپن ایئر تھیٹر سے نکل رہے تھے اور لڑکے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے سیٹیاں بجا کر گھٹیا قسم کے ریمارکس دے رہے تھے اور روداب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔

"ثانیہ! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" بہت حیرت سے کسی نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ وہ اس شناسا آواز پر بے اختیار مڑی تھی۔ وہ کومیل تھا۔ اسے لگا، کسی نے اسے ڈوبتے ڈوبتے بچا لیا ہو۔

"میں روداب کے ساتھ آئی تھی۔ وہ پتا نہیں کہاں چلی گئی ہے؟" اس نے کہا تھا۔

"تمہیں اجازت کیسے دے دی ہے وارڈن نے اتنی دیر باہر رہنے کی۔"

ثانیہ کو اس کے چہرے کے تاثرات بے حد عجیب لگ رہے تھے۔ وہ کچھ بول نہیں سکی۔

''تمہاری چادر کہاں ہے؟'' وہ اس سوال پر زمین میں گڑ گئی تھی۔

''اور اتنا ڈارک میک اپ کیوں کیا ہے تم نے؟ تمہیں پتا ہے یہاں کس طرح کے لڑکے آئے ہوئے ہیں۔''

''ثانیہ کی آنکھیں دھندلا گئیں وہ وہاں سے چل پڑا تھا۔ ثانیہ وہیں کھڑی رہی۔ کومیل نے چند قدم چلنے کے بعد مڑ کر دیکھا اور پھر واپس آیا۔

''اب تم یہاں سا فریز کیوں ہوگئی ہو چلو میرے ساتھ۔'' اس کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

''رودابہ کا انتظار ''

کومیل نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اس کا نام بھی مت لو میرے سامنے۔ میرے ساتھ چلو۔'' وہ یہ کہہ کر پھر چل پڑا تھا۔ ثانیہ نے پیروی کی۔ وہ سیدھا کار پارکنگ میں آیا تھا لیکن گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے وہ گاڑی کے پاس کھڑا ہوگیا۔

''تم دوپٹہ لو سر پر۔'' اس نے ترشی سے اس سے کہا تھا۔ اس نے دوپٹہ سر پر اوڑھ لیا تھا۔

''میں موحد کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ اپنی بہن اور بھابھی کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ میں تمہیں ان کے ساتھ بھجواؤں گا کیونکہ یہ تمہارے لئے مناسب نہیں ہوگا کہ تمہیں اکیلا ہاسٹل چھوڑنے جاؤں۔'' اس نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''لیکن ثانیہ! آئندہ اس طرح کبھی بھی کنسرٹ دیکھنے مت آنا۔ تمہیں میوزک کا شوق ہے تو کیسٹ پلیئر پر سنو۔ اتنا کافی ہے تمہارے لئے۔'' اس بار اس کا لہجہ پہلے جتنا سخت نہیں تھا۔

''میرے پاس کیسٹ پلیئر نہیں ہے اور پھر کنسرٹ پر جانے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ بھی تو یہاں آئے۔'' ثانیہ نے کچھ ہمت کر کے اس سے کہنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی تھی۔

''تم میرے یہاں آنے کی بات نہ کرو۔ میں جہاں چاہے جا سکتا ہوں۔ میں مرد ہوں، لیکن تم اس طرح رات کو باہر نکلنے کی حماقت دوبارہ مت کرنا۔'' اس کا لہجہ ایک بار پھر ترش ہو گیا تھا۔

''مگر رودابہ بھی تو جاتی ہے۔'' وہ پھر منمنائی تھی۔

''رودابہ جائے بھاڑ میں۔ تم روداب ہو، نہ روداب بننے کی کوشش کرو۔ وہ اس طرح پھرنا افورڈ کر سکتی ہے۔ تم نہیں کر سکتیں۔ ذرا تصور کرو، میری جگہ اگر تمہارے فادر تمہیں یہاں دیکھتے تو ثانیہ! تم یہاں پڑھنے کے لئے آئی ہو صرف وہی کام کرو۔ اس طرح پھرنا تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔''

وہ سختی سے بات کرتے کرتے اچانک نرم ہو گیا تھا۔ وہ کچھ شرمندگی سے اس کی باتیں سنتی رہی، چند منٹوں بعد موحد آ گیا تھا۔ اس نے کچھ حیرانی سے ثانیہ کو دیکھا تھا۔ مگر کومیل نے عام سے انداز میں سے ثانیہ کو ہاسٹل ڈراپ کرنے کے لئے کہا تھا۔

''بھابھی! آپ پلیز ثانیہ کو ہاسٹل کے اندر چھوڑ کر آئیے گا۔ ہو سکتا ہے، وارڈن کچھ ناراض ہو کیونکہ کافی دیر ہو گئی ہے۔''

اس نے موحد کی بھابھی سے درخواست کی تھی جو انہوں نے بصد خوشی مان لی تھی۔

وارڈن واقعی ناراض تھی کیونکہ وہ روداب کے ساتھ گئی تھی اور روداب اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے واپس آ چکی تھی۔ سوہد کی بھابھی نے وارڈن سے بہانا بنا دیا تھا کہ انہوں نے زبردستی اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا اور اسی وجہ سے اسے واپس آنے میں دیر ہو گئی۔

”کمال ہے یار، تم کہاں گم ہو گئی تھیں۔ تمہیں پتا ہی نہیں، میں پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتی رہی ہوں۔“

ثانیہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی روداب نے بلند آواز سے کہا۔ وہ بستر پر بڑے آرام سے نیم دراز تھی۔

ثانیہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا مگر کچھ بولی نہیں بلکہ اپنے کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں چینج کرنے کے لیے چلی گئی۔ مگر اس کی ناراضگی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی تھی۔ روداب نے ایسے عذر پیش کیے تھے کہ اس کی خفگی دور ہو گئی تھی۔ اسے ویسے بھی لمبی چوڑی ناراضگیاں پالنے کی عادت نہیں تھی۔ یہ کام اسے بہت مشکل لگتا تھا اور پھر روداب سے تو اس کو ویسے بھی بہت محبت تھی۔

اگلے دن وہ پھر صبح روداب کے ساتھ ہی یونیورسٹی گئی تھی۔ خلاف توقع دوسرے پیریڈ کے بعد جب وہ روداب کے ساتھ بیٹھنے کے لئے لان میں آئی تھی تو وہاں روداب کے ساتھ کومیل بھی موجود تھا اور ان دونوں کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔ کومیل کا چہرہ سرخ تھا اور روداب کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر کومیل خاموش ہو گیا اور اس کے قریب آنے سے پہلے ہی چلا گیا۔

وہ کچھ تشویش سے روداب کے پاس آئی تھی اتنا اندازہ تو اسے ہو ہی گیا تھا کہ موضوع گفتگو یقیناً وہ ہی ہو گی مگر اس کے قریب آنے پر روداب کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے وہ ثانیہ کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ ثانیہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔

”کیا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے کومیل سے؟“ اس نے روداب کے قریب بیٹھتے ہوئے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیسا جھگڑا؟ ایسے فالتو کاموں کے لئے میرے پاس وقت نہیں۔ وہ تو ویسے ہی بس خیر چھوڑو، کوئی اور بات کرو۔“ اس نے کچھ عجیب سے انداز میں بات کا موضوع بدل دیا تھا۔ دو بجے وہ روداب کے ساتھ ہی ہاسٹل میں واپس آئی تھی اور وہاں ایک سرپرائز اس کا منتظر تھا۔

”یہ جی صبح کوئی دس بجے کے قریب ایک صاحب دے گئے تھے آپ کے لئے۔ کومیل حیدر نام تھا اس کا۔“

اس کے اور روداب کے ہاسٹل آنے کے دس پندرہ منٹ بعد ہاسٹل کی ملازموں میں سے ایک بڑا سا اسٹیریو اٹھائے ثانیہ کے کمرے میں آئی تھی۔

ثانیہ ہکا بکا رہ گئی۔ اس نے کچھ بے یقینی سے روداب کو دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ بے حد سپاٹ تھا لیکن وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”میرے لئے دے کے گئے ہیں؟“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ملازمہ کے پاس آ گئی۔

”ہاں جی۔ آپ کے لئے ہی دے کر گئے ہیں۔ چٹ پر آپ کا پورا نام لکھ کر دیا تھا انہوں نے وارڈن کو۔“ ملازمہ نے اسٹیریو فرش پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے روداب؟ اس نے اسٹیریو کس لئے بھیجا ہے اس کو کہا کس نے ہے؟“ ثانیہ نے ملازمہ کے باہر جاتے ہی روداب سے کہا۔

"کچھ نہیں ہو رہا، بس اس نے تمہارے لئے گفٹ بھیجا ہے۔ کیوں بھیجا ہے یہ کل اس سے یونیورسٹی میں پوچھ لینا۔"

رودابہ کے لہجے میں کچھ خاص بات تھی جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے رودابہ اسٹیریو کے بارے میں بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اس شام رودابہ واقعی چپ چپ رہی۔ ثانیہ خود بھی خاصی نادم تھی۔ اس لئے اس نے رودابہ کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اگلے دن یونیورسٹی جاتے ہی اس نے کومیل کو پکڑ لیا تھا۔

"آپ نے میرے لئے ہاسٹل میں اسٹیریو کیوں بھجوایا ہے؟" وہ واقعی ناراض تھی۔

"صرف اس لئے تاکہ تم رودابہ کے ساتھ کنسرٹس اٹینڈ نہ کرو۔" بڑی لاپروائی سے کہا گیا تھا۔

"مجھے اسٹیریو کی ضرورت نہیں ہے آپ اسے واپس لے جائیں۔"

"واپس تو خیر میں اس کو قطعاً نہیں لوں گا تم اسے ایک تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔"

"لیکن مجھے اسٹیریو کی ضرورت ہی نہیں ہے اگر مجھے میوزک سننا ہوا تو میں رودابہ کے اسٹیریو پر سن لوں گی۔"

"دیکھو میں نے تمہیں، وہ اسٹیریو اس لئے دیا ہے کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میں نیا اسٹیریو لے رہا ہوں اور پھر پرانا والا میرے لئے بے کار ہو جاتا۔ اس لئے میں نے وہ تمہیں دے دیا۔ تمہیں نہ دیتا تو بھی کوئی اور دوست لے جاتا، اور تم تو میری۔" وہ بڑی روانی سے کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔

"وہ پرانا اسٹیریو نہیں ہے، نیا اسٹیریو ہے اور رودابہ کہہ رہی تھی کہ وہ خاصا مہنگا ہے۔" وہ اس کی بات پر غور کیے بغیر بولی تھی۔

"میں ہر سال اسٹیریو بدل لیتا ہوں۔ اس لئے میرا پرانا اسٹیریو بھی نیا ہی لگتا ہے اور وہ اتنا قیمتی نہیں ہے جتنا تم سوچ رہی ہو۔ رودابہ کو چھوڑو اسے عادت ہے ہر چیز کی قیمت بڑھانے کی۔" وہ اب بھی بڑی بے نیازی سے بات کر رہا تھا۔

"لیکن میں پھر بھی۔۔"

کومیل نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بس اب اسٹیریو کے بارے میں کچھ مت کہنا۔ تم یہ کیا کرو کہ مجھے قسطوں میں اس کے روپے لوٹا دینا یا جب دو سال بعد ہاسٹل سے جاؤ تو مجھے واپس دے جانا لیکن ابھی اسے اپنے پاس ہی رکھو۔" کومیل اس کی مزید کوئی بات سنے بغیر چلا گیا تھا۔

"مجھے بتاؤ رودابہ! میں کیا کروں۔ وہ تو اسٹیریو واپس لینے پر تیار نہیں۔"

ہاسٹل واپسی پر وہ ایک بار پھر رودابہ کو کومیل کے ساتھ ہونے والی گفتگو بتا رہی تھی۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں یہ تمہارا اور اس کا مسئلہ ہے؟" رودابہ نے کچھ سرد مہری سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن تم میری دوست ہو۔ مجھے مشورہ تو دے سکتی ہو۔" وہ اس کے انداز پر کچھ حیران ہوئی تھی۔

"ہاں مشورہ دے سکتی ہوں مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ خیر تم یہ اسٹیریو رکھ لو اگر وہ اتنے ہی اصرار سے دے رہا ہے تو ٹھیک ہے پھر لینے میں کیا

حرج ہے۔"

"لیکن روداب! یہ سب ٹھیک نہیں اور پھر میں۔۔۔"

روداب نے اس کی بات کاٹی تھی۔ "دیکھو میں نے تمہیں مشورہ دیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں، تم اس پر عمل کر سکتی ہو یا نہیں، یہ تمہیں طے کرنا ہے۔ مجھے جو مناسب لگا میں نے تم سے کہہ دیا کیونکہ بقول اس کے اس نے تمہیں یہ اسٹیریو گفٹ کے طور پر دیا ہے اور گفٹ واپس کرنا کوئی اچھی نہیں۔ آگے تمہاری مرضی۔"

روداب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی مگر ثانیہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ کافی دیر تک اس مسئلے پر سوچتے رہنے کے بعد اس نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اسٹیریو رکھ لے گی مگر یہ فیصلہ اسے کچھ زیادہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

"موحد! آپ کو پتا ہے، کومیل یونیورسٹی کیوں نہیں آ رہے ہیں؟"

وہ چند دنوں سے یونیورسٹی نہیں آ رہا تھا اور ثانیہ کو کچھ تشویش ہوئی تھی تو اس نے موحد سے پوچھ لیا وہ کیفے ٹیریا میں بیٹھا ہوا تھا۔

"اس کے کزن کی شادی ہے۔ وہ اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ کیا پھر کوئی کام آن پڑا ہے یا کسی قسم کی مدد چاہیے؟" ثانیہ کو اس کی بات سے توہین کا احساس ہوا تھا۔

"آپ کو ایسا کیوں لگا کہ مجھے کوئی کام ہے یا مدد کی ضرورت ہے۔ کیا اس کے بغیر میں اس کے بارے میں نہیں پوچھ سکتی؟" اس نے کچھ خفگی سے موحد سے پوچھا تھا۔

"بالکل پوچھ سکتی ہیں لیکن پوچھتی نہیں، اس سے ملنے آپ جب بھی آتی ہیں کسی کام سے ہی آتی ہیں۔ بہرحال وہ تو ابھی چند دن اور اسلام آباد میں ہی رکے گا۔ آپ کو کوئی کام ہے تو مجھ سے کہیں، میں بھی کچھ صاحب حیثیت ہوں۔ اس قدر معمولی بندہ نہیں ہوں جتنا آپ نے کومیل کے مقابلے میں مجھے اور میرے دوستوں کو سمجھ لیا ہے۔"

اس نے ایک شریر مسکراہٹ کے ساتھ ثانیہ سے کہا تھا۔ اشعر اور وحید کے چہرے پر بھی مسکراہٹ لہرا گئی ثانیہ کو بے حد ذلت کا احساس ہوا۔ وہ مکمل خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلی آئی۔

مگر وہ موحد کی بات کو بھولی نہیں تھی۔ تین دن بعد کومیل واپس یونیورسٹی آ گیا تھا اور اس کی واپسی والے دن ہی ثانیہ نے روتے ہوئے اسے پورا واقعہ سنا دیا تھا۔ شاید وہ رو نہ پڑتی تو وہ اتنا مشتعل نہ ہوتا جتنا اس کے آنسوؤں سے ہو گیا تھا۔ اسے تسلی اور دلاسہ دینے کے بعد وہ سیدھا اپنے گروپ کے پاس ہی گیا تھا۔

"تم نے ثانیہ سے کیا کہا تھا؟" اس نے جاتے ہی موحد سے پوچھا تھا۔

موحد قدرے حیران ہوا۔ "ثانیہ سے؟" اسے فوری طور پر یاد نہیں آیا۔

"ہاں چند دن پہلے جب میں یہاں نہیں تھا تب؟" کومیل نے اسی سرد لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔ موحد کو یک دم ثانیہ کے ساتھ ہونے

والی وہ گفتگو یاد آ گئی۔ اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"کمال ہے یار! کیا اسپیڈ ہے اس کی۔ اس نے تمہیں آتے ہی بتا دیا۔"

اس نے بڑا محظوظ ہوتے ہوئے کہا تھا لیکن اس کے قہقہے نے کومیل کو اور مشتعل کیا تھا۔

"میں نے تمہیں ہنسنے کو نہیں کہا۔ یہ پوچھا ہے کہ تم نے اس سے کیا کہا ہے؟"

"اس نے تمہیں کیا بتایا ہے؟" موحد ابھی بھی اس کے غصے کو انجوائے کر رہا تھا۔

"تم ہوتے کون ہو اس سے اس طرح کی بیہودہ باتیں کرنے والے؟"

یک دم کومیل اپنے لہجے پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ اور اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔ موحد کی مسکراہٹ کو بریک لگ گئے اور اس نے کچھ حیرانی سے ولید اور اشعر کو دیکھا جو خود بھی کومیل کے اس جملے پر حیرت زدہ نظر آ رہے تھے۔

"بے ہودہ باتیں؟ میں نے اس سے کوئی بے ہودہ بات نہیں کی تھی۔"

"تمہیں کیا تکلیف ہے کہ وہ میرے پاس کس لئے آتی ہے؟ تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"کومیل! میں نے اسے صرف مذاق میں ایک بات کہہ دی تھی اور تم ..." موحد نے کچھ سنبھل کر صورت حال کی وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تم نے اس سے مذاق میں بھی بات کیوں کی تھی؟ اس سے تمہارا رشتہ کیا ہے جو تم مذاق میں ایسی گھٹیا باتیں کرنے لگے۔" کومیل کا پارہ اور ہائی ہو گیا تھا۔

موحد کچھ لاجواب سا ہو گیا۔

"کومیل تم خوامخواہ اتنے سیریس ہو رہے ہو۔ جو کچھ ہوا ہمارے سامنے ہوا اور موحد نے واقعی مذاق کیا تھا۔" اشعر نے صلح صفائی کا آغاز کیا تھا۔

"مجھے تم سے کوئی وضاحت نہیں چاہئے۔ میں جس سے بات کر رہا ہوں، مجھے اسی سے جواب چاہئے۔" کومیل نے اشعر کو جھڑک دیا۔

"میرے خیال میں یہاں بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ تم سب میرے گھر چلو۔ وہاں چل کر یہ مسئلہ طے کر لیتے ہیں۔"

ولید کو اچانک احساس ہوا تھا کہ ان کی بلند آوازیں پاس سے گزرنے والوں کو متوجہ کر رہی ہیں۔ کومیل نے اس کی بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ مگر اس کے دل میں موحد کے خلاف جو ابال آ گیا تھا وہ ولید کے گھر پہنچ کر بھی دور نہیں ہوا تھا۔ اشعر اور ولید نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اور موحد نے بار بار اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کی کوششوں میں ناکامی کے بعد اس سے معذرت بھی کر لی لیکن اس کا غصہ ختم نہیں ہوا تھا۔ موحد کے معذرت کرنے پر اس نے کہا تھا۔

"میں تمہاری ایکسکیوز صرف اسی وقت قبول کروں گا جب تم ثانیہ سے بھی ایکسکیوز کرو۔" موحد اس کی بات پر بھڑک اٹھا تھا۔

"ثانیہ سے کس لئے ایکسکیوز کروں جب میں نے اسے کچھ کہا ہی نہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میرے سامنے یہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔" کومیل نے تلخی سے کہا تھا۔

"تم نے یک معمولی سی بات کو اتنا بڑا ایشو بنا دیا ہے۔ تمہارے نزدیک وہ لڑکی مجھ سے زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ تمہیں اس کی بات پر اعتبار ہے، میری بات پر نہیں؟"

موحد کو بھی اب اس پر غصہ آنے لگا تھا۔

"میں یہاں تمہاری بکواس سننے نہیں آیا ہوں۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے ثانیہ سے ایکسکیوز کیا تو آج تمہاری اور میری دوستی کا آخری دن ہوگا۔ میں اس کے بعد تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔" اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"میں کسی بھی قیمت پر ثانیہ سے ایکسکیوز نہیں کروں گا، چاہے تم یہ دوستی ختم کرو یا کچھ اور کرو لیکن میں اس سے ایکسکیوز نہیں کروں گا۔"

موحد پر بھی اب ضد سوار ہو گئی تھی۔ کومیل نے مزید کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلا آیا تھا اور وہ واقعی اپنے قول کا پکا ثابت ہوا تھا۔ اس نے موحد کے ساتھ پچھلی پندرہ سالہ دوستی کو بے حد آسانی سے ختم کر دیا تھا ولید اور اشعر کی کوششیں اور منتیں بھی بے اثر ثابت ہوئیں تھی۔

یونیورسٹی میں بھی جلد ہی سب کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ کومیل نے موحد کے ساتھ دوستی ختم کر دی ہے۔ اب موحد، اشعر اور ولید کے ساتھ ہوتا اور کومیل اکیلا ہی رہتا۔

اور پھر جلد ہی ڈپارٹمنٹ میں یہ خبر پھیل گئی کہ ان دونوں کی دوستی ثانیہ کی وجہ سے ختم ہوئی ہے۔ ثانیہ ان چہ میگوئیوں سے کافی پریشان ہوئی تھی کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بات سب کو کیسے پتا چلی ہے کہ کومیل اور موحد کے درمیان جھگڑا ہوا ہے اور وہ بھی اس کی وجہ سے۔

اسے موحد پر شک تھا کہ شاید وہی یہ ساری خبریں دینے والا ہے اور نہ صرف اسے بلکہ کومیل کو بھی موحد پر شک تھا اور اس شک نے اس کی ناراضگی کو اور بڑھا دیا تھا۔

وہ اب پہلے کی طرح ثانیہ سے بات نہ کرتا بلکہ کچھ کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ اگر کبھی ثانیہ سے اس کی ملاقات ہوتی بھی تو پہلے کی طرح تفصیلی طور پر بات کرنے کے بجائے وہ صرف سرسری انداز میں اس کا حال چال پوچھ کر چلا جاتا۔

موبائل کی بیپ سنائی دی تھی، اس نے گہری نیند میں فون کا ریسیور اٹھایا۔ دو تین بار ہیلو کہنے کے بعد اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ اسے فون پر نہیں بلکہ موبائل پر کسی نے کال کیا ہے۔ بیپ ابھی بھی سنائی دے رہی تھی اس نے ریسیور رکھ کر موبائل اٹھا لیا۔ آنکھیں بند کیے ہوئے اس نے بٹن پریس کیا تھا اور ہیلو کہا تھا۔

"ہیلو کومیل!" دو لفظ کہنے کے بعد اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔ وہ ثانیہ تھی۔ اس کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا تھا ساری نیند بھک سے اڑ گئی تھی۔

"ہیلو ثانیہ! ہیلو کیا ہوا ہے؟ تم کیوں رو رہی ہو؟" اس نے بے تابی سے پوچھنا شروع کیا تھا مگر وہ روئے جا رہی تھی۔ اس کی بے چینی میں اور اضافہ ہو گیا وہ موبائل ہاتھ میں لیے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے سائیڈ ٹیبل سے رسٹ واچ اٹھائی تھی ریڈیم ڈائل بتا رہا تھا کہ رات کا ایک

بج چکا ہے اس کے اضطراب میں یک بیک اور اضافہ ہو گیا۔

"ثانیہ! دیکھو، اس طرح مت روؤ۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے پلیز مجھے بتاؤ تم کیوں رو رہی ہو۔" اس نے بچوں کی طرح سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"کومیل! کومیل! مجھے ہاسٹل کا چوکیدار اندر نہیں جانے دے رہا۔"

ثانیہ نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا تھا اور کومیل کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔

"تم کہاں سے بول رہی ہو اور وہ کیوں اندر جانے نہیں دے رہا؟ تم باہر کس لئے آئی تھیں؟" اس نے پے در پے سوال کیے تھے۔

"میں رودابہ کے ساتھ کنسرٹ پر گئی تھی۔" اس نے سسکیوں میں اسے بتایا تھا۔

"تمہیں منع کیا تھا میں نے۔" وہ یک دم دھاڑا تھا۔ ثانیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کومیل کو اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"اب رودابہ کہاں ہے؟" اس نے خود پر کنٹرول کرتے ہوئے قدرے نرم لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

"وہ مجھے یہاں چھوڑ کر اپنے گھر چلی گئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ وارڈن سے اجازت لے کر مجھے ساتھ لے کر جا رہی ہے مگر چوکیدار کہہ رہا تھا کہ وارڈن نے میرے باہر جانے کے بارے میں رودابہ سے کوئی بات نہیں کی۔ رودابہ نے ان سے صرف اپنے گھر رہنے کی اجازت لی تھی کیونکہ ویک اینڈ تھا۔ اب میں کیا کروں؟" وہ ایک بار پھر رونے لگی۔

"رودابہ کے گھر کا فون نمبر یا ایڈریس معلوم ہے؟"

"نہیں۔"

"تم اس وقت کہاں سے بات کر رہی ہو؟"

"ہاسٹل سے کچھ فاصلے پر ایک میڈیکل اسٹور ہے وہاں سے، کومیل! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اب میں کیا کروں گی۔"

"ثانیہ! بات سنو، اپنا رونا بند کرو۔ دیکھو، میں دس پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔ تم پریشان نہ ہونا اور نہ ہی اب اس شاپ سے کہیں اور جانا یہیں رہنا اور اس شاپ کیپر سے میری بات کراؤ۔"

اس نے ثانیہ کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔ ثانیہ نے ریسیور شاپ کیپر کو تھما دیا۔ کومیل کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا اور اسے ثانیہ کی حفاظت کے بارے میں تاکید کرتا رہا دکان کا نام پوچھنے کے بعد اس نے فون دوبارہ ثانیہ کو دینے کو کہا تھا۔

"دیکھو تم آرام سے اسی دکان پر بیٹھ جاؤ گھبرانے والی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا میں بس تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔"

اس نے ثانیہ کو تسلی دے کر موبائل بند کر دیا تھا پھر اس نے اپنے ایک دوست کو فون کیا تھا جس کے والد منسٹری میں تھے۔

"کوئی بات نہیں۔ میں ڈیڈی کو جگا کر بات کرتا ہوں۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

اس کے دوست نے اس کا مسئلہ سن کر کہا تھا موبائل بند کر کے اس نے بیڈ سے اٹھ کر جلدی سے نائٹ شرٹ پہنی تھی اور کار کی چابی اور

موبائل اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر آنے کے بعد وہ سیدھا اپنے بڑے بھائی کے کمرے کی طرف گیا اور اس نے اپنی بھابھی اور بھائی کو جگایا تھا اور سارا قصہ سنا کر بھابھی کو ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ بھابھی اور بھائی کی نظروں میں لہراتا ہوا شک بھی اس وقت اسے ناگوار نہیں لگ رہا تھا۔

چند لمحوں کی رد و کد کے بعد اس کی بھابھی اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی تھیں مگر وہ زیادہ خوش نظر نہیں آ رہی تھیں۔ مگر اسے اس وقت کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ تیز رفتاری سے گاڑی دوڑاتا ہوا وہ ٹھیک دس منٹ بعد اس میڈیکل اسٹور کے سامنے تھا۔ گاڑی سے نکل کر اس نے چند لمحوں کی جدوجہد کے بعد وہ دوکان تلاش کر لی تھی جہاں وہ موجود تھی۔ اسے دیکھ کر اس کے بہتے آنسوؤں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کومیل کو اس پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا لیکن وہ خود پر ضبط کر رہا تھا۔

"اب میں کیا کروں گی کومیل! اب کیا ہوگا؟" اسے دیکھتے ہی اس نے کہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ میں اپنی بھابھی کو لے کر آیا ہوں۔ تم ان کے ساتھ ہاسٹل چلی جانا اب تک وارڈن کو میرے دوست کے فادر فون کر چکے ہوں گے وہ تمہیں اب اندر آنے سے نہیں روکے گی لیکن تمہیں اب میں نے رودابہ کے ساتھ دیکھا تو میں تمہیں اور اسے دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔ وارڈن سے کہہ کر اپنا کمرہ چینج کر لینا کل تک۔"

اس کے ساتھ گاڑی کی طرف آتے ہوئے وہ اسے ہدایات دیتا آیا۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی بھابھی سے اس کا تعارف کروایا تھا اور پھر گاڑی میں بٹھا کر ہاسٹل کی طرف لے آیا تھا۔ اس کی بھابھی ثانیہ کو لے کر اندر چلی گئی تھیں۔ لیکن انہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

چوکیدار نے بڑے آرام سے گیٹ کھول دیا تھا۔ وارڈن نے ثانیہ سے معذرت کی تھی وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھیں۔ ثانیہ کو وہاں چھوڑ کر کومیل کی بھابھی واپس چلی گئی تھیں۔ ہاسٹل کے اندر پہنچ کر ثانیہ کی جان میں جان آئی تھی اس وقت اسے رودابہ سے بے تحاشا نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ کومیل نے کس کس طرح اسے رودابہ سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے ہر بار اس کی وارننگ سنی ان سنی کر دی تھی۔

"رودابہ تم نے میرے ساتھ فراڈ کیا۔ مجھے دھوکا دیا۔ آخر تم یہ حقیقت مان کیوں نہیں لیتیں؟"

رودابہ دو دن بعد ہوسٹل واپس آئی تھی۔ ثانیہ تب تک واپس اپنے پرانے کمرے میں جا چکی تھی۔ وہ صبح آئی تھی۔ تب ثانیہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی لیکن یونیورسٹی میں اس نے ثانیہ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ثانیہ کے چہرے کے تاثرات نے اسے چونکا دیا تھا، وہ اس کی بات سننے پر تیار نہیں تھی پھر واپس ہاسٹل آنے کے بعد ثانیہ خود اس کے کمرے میں گئی تھی اور اس نے اسے اس کے دھوکے کے بارے میں بتایا تھا لیکن رودابہ بہت عجیب سے انداز میں کہہ رہی تھی کہ وہ وارڈن سے بات کرنا بھول گئی تھی۔

ثانیہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا گلا دبا دیتی۔ اس وقت اس رودابہ کا خوبصورت چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔

"روداب! میں بے وقوف نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھ سکتی ہوں بلکہ سب کچھ سمجھ چکی ہوں۔ تم مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو، مجھے رسوا کرنا چاہتی ہو۔ یہ تو میں جان چکی ہوں۔ ہاں بس یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم ایسا کیوں کرنا چاہ رہی ہو؟ میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔

تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا پھر تم کیوں میرے ساتھ اس طرح کر رہی ہو؟ اسٹیریو والی بات بھی تم ہی نے پوری کلاس کو بتا دی تھی اور میں حیران تھی کہ تمہارے، میرے اور کومیل کے علاوہ یہ بات کسی کے علم میں نہیں ہے پھر ڈپارٹمنٹ کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چل گیا اور میرا خیال ہے کہ موحد اور کومیل کے درمیان ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بھی تم ہی خبریں دیتی رہی ہو۔ آخر تم یہ سب کر کے کیا حاصل کرنا چاہتی ہو؟ میری رسوائی سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"کومیل کے ساتھ اگر میں نے تمہیں بدنام کیا تو تمہیں کیا نقصان ہوا۔ تمہیں تو فائدہ ہی ہوا نا پھر تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

ثانیہ نے حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا تھا جس پر بے حد عجیب سے تاثرات تھے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ مجھے کیا فائدہ ہوا؟" اس نے پوچھا تھا۔

"بس بس۔ اب زیادہ معصوم نہ بنو۔ تم جانتی ہو تمہیں کیا فائدہ ہوا۔ اب میرے منہ سے کیا سننا چاہتی ہو؟"

روداب کا لہجہ زہریلا تھا۔ اس کے لئے یہ انداز بالکل نیا تھا۔ وہ کھوئی سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"نہیں تم بتاؤ۔ کیا فائدہ ہوا، اب اپنی بات تو مکمل کرو۔"

"کومیل نے کل تمہاری وجہ سے اپنی منگنی توڑ دی ہے؟"

وہ روداب کے جملے پر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ وہ قطعاً بے خبر تھی کہ کومیل کی منگنی ہو چکی ہے، اور اب یہ اطلاع بھی اس کے لئے بالکل نئی تھی کہ اس نے منگنی توڑ دی ہے۔

"میری وجہ سے؟ تم نے کہا میری وجہ سے؟" اس نے کھوکھلی آواز میں اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں تمہاری وجہ سے ثانیہ مراد! تمہاری وجہ سے سب۔ بہت جلد وہ تمہیں پروپوز کرے گا۔ آئے گا اور کہے گا مس ثانیہ مراد! کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟ کیا آپ میری خزاں جیسی زندگی میں بہار بن کر آنا پسند کریں گی؟" روداب نے تمسخر آمیز انداز میں کہا تھا۔

ثانیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ "روداب! ایسی باتیں مت کرو۔ اس طرح مت کرو۔" اس نے بے بسی سے کہا تھا۔

"بلکہ ہو سکتا ہے وہ بہت پہلے ہی تمہیں پروپوز کر چکا ہو اور آج کل تم دونوں شادی کی پلاننگ کر رہے ہو۔ ہو سکتا ہے نا؟" روداب نے اپنی بات جاری رکھی وہ چلا اٹھی۔

"تم غلط سوچ رہی ہو۔ ہم دونوں کے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔؟"

"تو پھر آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ دونوں کے درمیان کیا تعلق ہے؟ کیا رشتہ ہے؟" اسے روداب کی آنکھوں سے خوف آنے لگا تھا۔

"کوئی رشتہ نہیں ہے۔" اسے اپنی آواز کسی کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی وہ تمہیں برانڈ نیو اسٹیریو گفٹ کر دیتا ہے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی وہ تمہیں اس ہاسٹل میں کمرہ لے کر دیتا ہے۔ وہ جو کسی کو اپنی کتاب کو ہاتھ تک لگانے نہیں دیتا۔ تمہیں اپنے پورے نوٹس خود ہی فوٹو اسٹیٹ کروا کر دے دیتا ہے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی

تمہاری وجہ سے وہ اپنے بچپن کے دوستوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی رشتہ نہیں ہے پھر بھی وہ تمہاری وجہ سے مجھ سے جھگڑتا ہے۔ اس پوری یونیورسٹی میں وہ اگر کسی لڑکی سے بات کرتا ہے تو وہ تم ہو گر کسی کی بات سنتا ہے تو وہ تم ہو۔ اگر کسی کا کام کرتا ہے تو وہ تم ہو۔ کوئی رشتہ نہیں ہے، اور وہ تمہارے لئے اپنی منگنی توڑ دیتا ہے۔ تم جانتی ہو ثانیہ مراد! جب وہ تمہیں دیکھتا ہے تو اس کی آنکھیں کس طرح چمک اٹھتی ہیں تم نہیں جانتیں مگر میں جانتی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے اور یہ چمک مجھے اندھا کر دیتی ہے۔ میں پچھلے چھ سال سے اس ایک شخص کے پیچھے کس طرح خوار ہو رہی ہوں یہ کوئی نہیں جانتا۔ آج تمہیں بتا رہی ہوں۔"

"روداب!" سب کچھ جیسے کسی بھنور میں آ گیا تھا۔ وہ روداب کا چہرہ دیکھ رہی تھی جس پر آنسوؤں کی نمی نظر آ رہی تھی۔ اس نے پہلی بار اسے روتے ہوئے دیکھا تھا۔

"کون سا ایسا مرد ہے جس کی توجہ میں حاصل کرنا چاہوں اور نہ کر پاؤں، جس سے میں بات کروں اور وہ چپ رہے، جسے میں دیکھوں اور وہ نظر پھیر لے، جس کے رستے میں میں کھڑی رہوں اور وہ پھر بھی گزر جائے، اور وہ وہ کومیل حیدر یہی کرتا ہے۔ اسے میں نظر ہی نہیں آتی۔ مجھے اس کے قرب کی خواہش نہیں ہے۔ میں اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے اس کی محبت بھی نہیں چاہئے۔ میں تو صرف وہ نظر چاہتی ہوں جس سے وہ تمہیں دیکھتا ہے۔ صرف ایک بار۔ اس کے لہجے میں وہ نرمی چاہتی ہوں جو تم سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ اس کی آواز میں ہوتی ہے۔"

وہ بلک رہی تھی۔ ثانیہ کسی پتھر کے بت کی طرح دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"صرف ایک بار۔ وہ میری فرمائش پر بھی کوئی چیز اس طرح دے دے جس طرح وہ تمہیں دیتا ہے، صرف ایک دفعہ میری بات اس طرح سن لے جس طرح وہ تمہیں ہمیشہ سنتا ہے، صرف ایک بار مجھے اس طرح کسی بات پر روکے جس طرح وہ تمہیں روکتا ہے۔ ثانیہ! وہ اگر مجھے خنجر دے اور کہے کہ اس سے اپنی گردن کاٹ لو تو میں ایک لمحے کی دیر نہ کروں۔"

وہ اب فرش پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھامے زار و قطار رو رہی تھی۔ ثانیہ خالی الذہنی کے عالم میں بلیک جینز اور وائٹ سوئٹر میں ملبوس بیسویں صدی کی اس "سوہنی" کو دیکھ رہی تھی!

"میری خوبصورتی، میرے باپ کی ساری دولت، میری ساری محبت، سارا عشق مجھے ایک شخص صرف ایک شخص کومیل حیدر نہیں دلوا سکتے۔ میں نے تم سے دوستی صرف یہ دیکھنے کے لئے کی تھی کہ آخر تم میں وہ کون سی چیز ہے جو مجھ میں نہیں، جو کومیل کو تمہاری طرف راغب کر رہی ہے مگر تم میں تو مجھے کچھ بھی نہیں آیا۔ تم عام تھیں۔ تم تو بہت ہی عام تھیں۔ میں نے سوچا تمہیں اپنے جیسا کر دوں تو شاید اس کی توجہ تم پر سے ہٹ جائے۔ شاید تم اس کے دل سے اتر جاؤ مگر کوئی فائدہ نہیں، تمہیں پتا ہے، اس کی منگنی میری کزن سے ہوئی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا مگر تمہاری وجہ سے اس نے ماریہ کو چھوڑ دیا۔ مجھے خوش ہونا چاہئے کہ اس نے ماریہ کو چھوڑ دیا مگر میں خوش نہیں ہوں کیونکہ مجھے لگتا ہے اسے ماریہ سے محبت نہیں تھی۔ وہ صرف پسندیدگی تھی۔ عشق تو اسے تم سے ہے اور میں چاہتی ہوں ثانیہ! تم اسے نہ ملو تاکہ اسے پتا چلے کہ جو محبت کرتے ہیں اور پھر خالی ہاتھ رہتے ہیں۔ ان کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ وہ کس طرح تڑپتے ہیں۔ مجھے تم سے نفرت نہیں ہے مگر پھر بھی ثانیہ! پھر بھی میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں مار دوں۔ میں کچھ

ایسا کر دوں کہ وہ تم سے نفرت کرنے لگے جیسے وہ مجھ سے کرتا ہے پھر چاہے وہ ماریہ سے شادی کرے چاہے کسی اور سے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ بس ...... بس تم سے شادی نہ کرے۔"

"رودابہ! مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ مجھے اس سے شادی بھی نہیں کرنی ہے۔ مجھے کچھ پتا نہیں وہ میرے لئے اپنے دل میں کیا سوچتا ہے مگر میں اس کے لئے کچھ نہیں سوچتی ہوں میری منگنی ہو چکی ہے۔ میں نے تو کبھی کومیل حیدر "

وہ اپنی بات مکمل کئے بغیر منہ پر ہاتھ رکھ کر کمرے سے نکل گئی۔ "ہر مرد باہر سے کتنا ہی کلچرڈ، مہذب نظر کیوں نہ آئے اندر سے بے حد بھیانک اور مکروہ ہوتا ہے۔ اتنا بھیانک اور مکروہ کہ اس پر تھوکنے کو دل چاہتا ہے۔" چند دن پہلے ہی تو اس نے کہیں پڑھا تھا اور تب اس نے صفحہ پلٹ دیا تھا یہ کہہ کر۔

"او یو فنی میل شاونزم۔" اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ بھی رودابہ کی طرح بلند آواز سے روئے۔ اسے ہمیشہ یہ گمان رہتا تھا کہ وہ لوگوں کو بڑی آسانی سے پرکھ سکتی ہے اور یہ واقعی گمان ثابت ہوا تھا وہ سید کومیل حیدر کو نہیں جان پائی تھی۔

"آخر میں نے کیوں نہیں سوچا کہ وہ مجھے اتنی ایکسٹرا آرڈنری (غیر معمولی) توجہ کیوں دے رہا ہے۔ کیوں اس طرح چیزیں تھما دیتا ہے۔ کیوں اتنی پرواہ کرتا ہے جب رودابہ یہ سب سوچ سکتی تھی تو میں نے کیوں نہیں سوچا کسی رشتہ کے بغیر وہ اس طرح کیوں کرتا رہا۔ میں نے تب بھی نہیں سوچا۔ جب میرے اور اس کے حوالے سے چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ میں اتنی بے وقوف تو کبھی بھی نہیں تھی پھر آخر کیوں میں؟"

اس کا دماغ گذشتہ مہینوں کی فلم چلا رہا تھا۔ دھندلے آئینے صاف ہوتے جا رہے تھے۔

"تم میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ چلے جاؤ، میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔"

دوسرے دن اس نے فون کر کے کومیل کو ہاسٹل بلوایا تھا، اسے ویٹنگ روم میں بٹھا کر وہ اپنے کمرے میں آئی تھی، اور وہ ساری چیزیں اٹھا کر لے کر آئی تھی جو وہ وقتاً فوقتاً اسے دیتا رہا تھا۔ اس نے وہ ساری چیزیں لا کر ویٹنگ روم میں اس کے سامنے پھینک دی تھیں۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"ثانیہ! کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"میری آنکھیں کھل گئیں ہیں۔ تمہاری اصلیت میرے سامنے آ گئی ہے اور تم نہیں جانتے، اس وقت تم مجھے کتنے برے لگ رہے ہو۔ اب تم بس یہاں سے چلے جاؤ۔ میں دوبارہ کبھی تم سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟ تم کو ہوا کیا ہے؟"

"میرا دماغ خراب تھا، اب ٹھیک ہو گیا ہے۔ تم نہیں جانتے۔ مجھے تمہاری وجہ سے دنیا کتنی بری لگنے لگی ہے۔"

"ثانیہ! تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں "

ثانیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"غلط فہمی تو مجھے ہو گئی تھی۔ اب تو ہر غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔ تم میرے ساتھ فلرٹ کرنا چاہتے تھے تم نے مجھے "

"ثانیہ! تم پاگل ہو۔" وہ چلا اٹھا تھا۔ "تم سے کس نے یہ بکواس کی ہے؟ روابہ نے؟ ہے نا روابہ؟"

"نہیں ماریہ نے۔ جانتے ہو نا اسے؟ تمہاری منگیتر تھی وہ اور تم نے اس سے اپنی منگنی میری وجہ سے توڑ دی۔ تم "

کومیل بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ "ماریہ تمہارے پاس آئی تھی؟"

"ہاں۔" اس نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ کومیل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن وہ بڑی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"میں تمہیں کیا سمجھتی رہی اور تم کیا ہو اور تم نے مجھے کیا سمجھا۔ کس طرح مجھے "

"ثانیہ! تم چپ ہو جاؤ جو تم سوچ رہی ہو۔ وہ غلط ہے۔ میں تم سے فلرٹ کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں... "

ثانیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "ٹھیک ہے میں غلط ہوں تو پھر تم بتاؤ۔ میرے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے؟ کس لیے یہ ساری عنایات، ساری نوازشات مجھ پر کرتے ہو۔ کیوں تم نے مجھے ؟"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی۔ کومیل نے چند لمحے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن پھر وہ کچھ کہے بغیر تیزی سے وزیٹنگ روم سے نکل گیا۔

* * *

ایئر ہوسٹس اسے اس کی سیٹ پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس نے اپنا سفری بیگ اوپر رکھ دیا تھا اور پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مدیحہ ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو چکی تھی۔

"ممی! ہم پاپا کے پاس کب جائیں گے؟"

گھر سے یہاں تک بیسویں بار مدیحہ نے وہی سوال دہرایا تھا۔

"بیٹا بہت جلد۔" اس نے بیسویں بار وہی جواب دیا تھا۔

اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے سیٹ بیلٹ باندھنا شروع کر دی۔ اپنی سیفٹی بیلٹ باندھنے کے بعد اس نے مدیحہ کی بیلٹ باندھی تھی۔ جہاز میں مسافر ادھر سے ادھر اپنی اپنی سیٹس کی تلاش اور سامان رکھنے میں مصروف تھے۔ وہ بوریت سے ادھر سے ادھر آتے جاتے اسٹیورڈز اور ایئر ہوسٹسز کو دیکھتی رہی۔ جہاز کی اکثر سیٹیں خالی تھیں اس کے ساتھ والی تیسری سیٹ بھی ابھی تک خالی تھی کچھ دیر بعد ایئر ہوسٹس اسپیکرز کے ذریعے سب کو سیفٹی بیلٹس باندھنے کے لیے ہدایت دینے لگی، چند منٹوں بعد جہاز ٹیک آف کر گیا تھا۔

وہ اس وقت مدیحہ کی سیفٹی بیلٹ کھول رہی تھی جب آہٹ پر اس نے سر اٹھایا تھا۔ سرخ و سفید رنگت کی ایک بے حد تیکھے نقوش کی بہت سمارٹ سی عورت اس کے پاس کھڑی تھی اس کا چہرہ مسکراہٹ سے عاری تھا۔

"ہیلو ثانیہ مراد! کیسی ہو؟" بہت نرم لہجے میں اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس عورت نے کہا تھا۔

ثانیہ کچھ حیران ہوئی تھی۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے اس کا چہرہ پہچاننے کی کوشش کی چہرہ شناسا نہیں تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مجھے نہیں پہچانتیں۔ ہم اس سے پہلے کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔"

وہ عورت اس کی پریشانی بھانپ گئی تھی۔ ثانیہ مزید حیران ہوئی۔

"میں ایئر ہوسٹس سے پوچھ چکی ہوں۔ یہ سیٹ خالی ہے۔ اس نے مجھے یہاں بیٹھنے کی اجازت دے دی ہے۔ پھر بھی میں تم سے پوچھ لیتی ہوں۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔"

ثانیہ اس کی بات پر مزید حیران ہوئی تھی۔ "جی بالکل ضرور بیٹھیں۔"

"تھینک یو۔ یہ تمہاری بیٹی ہے؟" اس عورت نے مدیحہ کے گال کو چھوا تھا۔

"ہاں۔" ثانیہ اب بے چین ہو رہی تھی۔

"آپ کون ہیں اور مجھے کیسے جانتی ہیں؟" اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

وہ عورت جواب میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ یوں جیسے اس نے پہلی بار اسے دیکھا ہو پھر اس نے کچھ تھکے ہوئے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

"تمہیں نہیں جانوں گی تو کسے جانوں گی۔ تمہاری وجہ سے میں نے آٹھ سال پہلے سب کچھ کھو دیا تھا۔ تمہیں کیسے بھلا سکتی ہوں۔"

وہ آنکھیں بند کیے بڑبڑائی تھی۔ ثانیہ الجھ گئی تھی۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"میرا نام ماریہ جہانگیر ہے۔ ڈاکٹر ماریہ جہانگیر۔ مگر تم مجھے نہیں جانتیں میں نے تمہیں بتایا ہے ناں، میں تم سے کبھی نہیں ملی۔" اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دی تھیں اور اس کی طرف دیکھے بغیر بولنا شروع کر دیا تھا۔

"پھر آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟"

"تمہاری تصویر دیکھی تھی ایک بار کسی کے پاس۔ تب سے آج تک میرے دماغ پر تمہارا چہرہ نقش ہے۔ تم آج بھی ویسی ہو جیسی آٹھ سال پہلے تھیں۔ بدلی نہیں اگر بدل جاتیں تب بھی میں تمہیں پہچان ضرور لیتی۔ تمہیں ایئرپورٹ پر سامان کی چیکنگ کرواتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں اس وقت تمہارے پاس ہی تھی۔ میری سیٹ ایگزیکٹو کلاس میں تھی۔ مگر میں ایئر ہوسٹس سے کہہ کر اکانومی کلاس میں آ گئی ہوں کیونکہ تم سے باتیں کرنی ہیں مجھے بہت کچھ کہنا ہے مجھے۔"

ثانیہ کو اس کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ اب اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر چکی تھی۔

"کومیل کو جانتی ہو؟ سید کومیل حیدر کو؟"

ثانیہ کو لگا تھا اس کے نزدیک کہیں کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ وہ رکے ہوئے سانس کے ساتھ اس عورت کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اسے اب یاد آ گیا تھا ماریہ کون تھی۔ آٹھ سال کے بعد یک بار پھر جیسے کسی نے اس کے چھپے زخم ہرے کر دیے تھے۔

اس دن کومیل کے جانے کے بعد وہ ہاسٹل سے واپس سرگودھا چلی گئی تھی اور پھر دوبارہ یونیورسٹی نہیں آئی۔ اس نے تعلیم چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔ ہر بار اپنے والد کے سوالوں پر اس کا صرف ایک ہی جواب ہوتا۔ "میرا اب پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ میں آپ سے الگ نہیں رہ سکتی۔"

مراد علی سر پیٹ کر رہ گئے تھے۔ اس نے ان کے سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ بے حد ناراض اور افسردہ تھے لیکن بہرحال انہوں نے اسے مزید مجبور نہیں کیا تھا۔

ثانیہ کی منگنی بی اے کے دوران ہی اس کی پھوپھو کے بیٹے اسد سے ہو چکی تھی جو کویت میں دفاع میں کام کرتا تھا۔ تعلیم چھوڑنے کے چھ ماہ کے اندر اندر اس کی شادی ہو گئی تھی اور وہ پاکستان سے جانے کے بعد بے حد خوش تھی۔ وہ خوف جو چھ ماہ تک سے اپنی گرفت میں لیے ہو تھا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔ اب کوئی رودابہ، کسی کومیل کو اس کے سامنے نہیں آنا تھا۔ لوگوں پر سے اس کا اعتبار یک دم جیسے ختم ہو گیا تھا۔ وہ اگر یونیورسٹی نہ چھوڑتی تو شاید پاگل ہو جاتی۔ ہر مرد کا چہرہ اسے کومیل کا چہرہ لگتا۔ ہر لڑکی اسے رودابہ لگتی۔ ہر شخص اسے خود پر ہنستا ہوا لگتا۔

پھر سب کچھ نارمل ہو گیا تھا وہ اسد کے ساتھ بہت پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ ہر سال وہ پاکستان آتی اور اس بار بھی وہ اپنی بیٹی کے ساتھ پندرہ دن پاکستان میں گزارنے کے بعد واپس جا رہی تھی جب ماریہ جہانگیر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

"جانتی ہو نا کومیل کو؟" وہ دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

ثانیہ کا دل چاہا وہ جہاز کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دے۔ ندامت کا احساس کچھ ایسا ہی وزنی تھا۔

''میں کومیل حیدر کی منگیتر تھی کسی زمانے میں۔'' ماریہ کی آنکھوں میں کچھ جل کر بجھا تھا۔

ثانیہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ ''بلکہ...... بلکہ محبت کرتے تھے ہم دونوں ایک دوسرے سے۔''

وہ اب بات کرتے ہوئے آہستگی سے اپنے ہاتھ کو بند کر کے کھول رہی تھی۔

''آج تمہیں دیکھا تو دل چاہا، ایک بار پھر سے سب کچھ دوہرانے کو۔ اس کے بارے میں بات کرنے کو۔''

وہ ایک بار سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا چکی تھی۔

''پتا نہیں ہم دونوں میں سے کس نے ایک دوسرے سے زیادہ محبت کی۔ میں نے اس سے یا اس نے مجھ سے۔ شاید میں نے۔ ہمیشہ عورت ہی زیادہ محبت کرتی ہے۔ ہے نا ثانیہ؟''

وہ ایک بار پھر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی رائے لے رہی تھی۔ ثانیہ گونگی ہو چکی تھی۔ اسے حلق سے آواز نہیں نکلی۔

''ہاں۔ میرا خیال ہے۔ میں نے ہی زیادہ محبت کی تھی بلکہ اب بھی کرتی ہوں۔ نہیں محبت نہیں شاید اسے عشق کہنا چاہیے۔ ہم دونوں کو لگتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے وجود کے بغیر ادھورے ہیں۔ اس نے مجھے پہلی بار کسی پارٹی میں دیکھا تھا۔ پھر وہ ایک دوست کے توسط سے مجھ سے ملا۔ میں تب میڈیکل کے تھرڈ ایئر میں تھی۔ بس پتا نہیں کیا ہوا۔ لیکن اس میں کوئی ایسی بات تھی۔ جس نے مجھے مسحور کر دیا۔ پھر ہم اکثر ملتے رہے اور ایک دن اس نے مجھے پرپوز کر دیا۔''

ثانیہ آنکھیں جھپکے بغیر ماریہ جہانگیر کا چہرہ دیکھتی رہی جو اس طرح اپنی داستان سنا رہی تھی جیسے وہ اس کی عزیز ترین دوست ہو۔

''ہماری منگنی ہو گئی، تب اس نے ایم اے میں ایڈمیشن لیا تھا۔ ہم دونوں کی کمال کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ بہت سی باتیں ہم کہے بغیر ہی سمجھ لیتے تھے یوں جیسے ٹیلی پیتھی ہو گئی ہو۔ مجھے لگتا تھا کہ کومیل حیدر کے سوا دنیا میں میرے لئے اور کچھ ہے ہی نہیں اور اگر کہیں یہ نہ ملا تو مجھے تو دنیا ہی نہیں ملے گی مگر مجھے کوئی خدشہ نہیں تھا۔ آخر وہ مجھے کیوں نہ ملتا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ دونوں فیملیز کی رضامندی سے یہ رشتہ ہوا تھا۔ ہم دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ پھر میں ایسے خدشات کیوں پالتی۔ تب ہم اپنی شادی کو پلان کر رہے تھے جب یک دم ہمارے درمیان ثانیہ مراد علی آ گئی...... تم آ گئیں۔''

پتا نہیں ثانیہ کو ماریہ جہانگیر کا چہرہ اس لمحے اس قدر تاریک کیوں لگا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دے اور خوب روئے۔

''نہیں ثانیہ! تم پریشان مت ہو۔ میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہی۔ تمہاری غلطی نہیں ہے۔ بعض دفعہ ہمیں لگتا ہے کسی شخص سے ہماری بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے مگر ایسا نہیں ہوتا۔ ہم کو غلط فہمی ہوتی ہے عورت کسی مرد کو بھلا کیسے سمجھ سکتی ہے وہ بھی کومیل حیدر جیسے مرد کو۔ میں نے بھی سارا عرصہ اس خوش فہمی میں گزارا تھا کہ میں کومیل حیدر کو سمجھنے لگی ہوں مگر ایسی نہیں تھا اور مجھے اس خوش فہمی نے ڈبو دیا۔ مجھے تمہارے بارے میں رودابہ نے بتایا تھا پھر کومیل کے بھائی اور بھابھی نے بتایا۔ جب ایک رات رودابہ تمہیں جان بوجھ کر وارڈن کی اجازت کے بغیر ساتھ لے گئی تھی۔ مجھے پہلے اس ساری کہانی پر یقین نہیں آیا۔ مجھے کومیل پر بے حد اعتماد تھا۔ مگر پھر پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا میں جانتی تھی۔ کومیل تم سے قطع تعلق کرنے خاص طور پر موبد

کتاب گھر کی پیشکش http://kitaabghar.com

والے واقعہ کے بعد۔ وہ موحد سے بے پناہ محبت کرتا تھا پھر بھی ایک معمولی سی بات پر اس نے تمہاری وجہ سے موحد کو چھوڑ دیا اور تب میں بے پناہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ مجھے تم سے بے پناہ خوف اور نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ پھر وہ روداپ والا واقعہ پیش آیا اور میں نے کومیل سے بات کرنے کی سوچ لی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ تمہیں چھوڑ دے یا مجھے۔

اور اس نے...... اس نے مجھے چھوڑ دیا۔"

ایک بار پھر ماریہ کے چہرے پر کچھ جل کر بجھ گیا تھا۔

"تب میرا دل چاہا تھا میں تمہیں اور کومیل دونوں کو شوٹ کر دوں۔ میں نے دھوکا کھایا۔ مجھے ایسا لگا تھا، وہ بھی اس شخص کے ہاتھوں جس پر میں نے سب سے زیادہ اعتبار کیا تھا۔ تب مجھے لگا تھا جیسے دنیا ہی ختم ہو گئی تھی شاید سب کچھ ٹھیک ہو جاتا شاید ہم دونوں کا غصہ ختم ہو جانے کے بعد، کچھ دنوں کے بعد دوبارہ ہم میں صلح ہو جاتی مگر پھر تم نے وہ جھوٹ بول دیا یاد ہے ثانیہ! تم نے اس سے کہا تھا کہ میں نے تمہارے پاس آ کر کہا ہے کہ کومیل تم سے فلرٹ کر رہا ہے؟"

وہ یاد نہ بھی دلاتی، تب بھی ثانیہ کو سب کچھ یاد تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا۔

"کومیل اس کے بعد صرف ایک بار میرے پاس آیا تھا۔ میرے جھوٹ پر مجھے ملامت کرنے۔ اسے میری کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ تمہارے پاس لے کر جائے اور پھر تم سے پوچھے کہ کیا میں تمہارے پاس آئی تھی؟ کیا میں نے ایسی بات کہی تھی۔ مگر تب تک تم کچھ کہے کچھ بتائے بغیر ہاسٹل اور یونیورسٹی چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ میں نے تمہارے آنے کا بہت انتظار کیا۔ کیونکہ صرف تمہاری گواہی اس کے دل پر جمی بدگمانی کی دھند کو ختم کر سکتی تھی۔ مگر تم نہیں آئیں۔ پتا نہیں ثانیہ! تمہاری بات میں کیا اثر تھا کہ کومیل کو پھر میری بات پر یقین نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی پھر وہ یہی کہتا رہا کہ جو کچھ ثانیہ نے کہا ہے وہ ٹھیک ہے، جو تم کہہ رہی ہو وہ جھوٹ ہے۔ میں نے بہت کوشش کی تھی سب کچھ ٹھیک کرنے کی مگر پتا نہیں اس کے دل میں میرے خلاف کون سی بدگمانی آ گئی تھی اور پھر میں نے سوچ لیا کہ اب اس شخص سے مجھے کوئی واسطہ نہیں رکھنا۔ مجھے لگتا تھا اسے محبت مجھ سے نہیں تم سے ہوئی ہے۔ میں پتا نہیں کیا تھی۔ راستے کی گرد یا پھر راستے کا پتھر۔ اس نے مجھے ٹھوکر ماری اور میں اس کے راستے سے ہٹ گئی۔"

ماریہ خاموش ہو گئی تھی۔ ایک بار پھر آنکھیں بند کر کے وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا چکی تھی۔

ثانیہ کا ملال بڑھتا جا رہا تھا۔

"ماریہ! آپ یقین کریں میرے اور کومیل کے درمیان کچھ نہیں تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ وہ میرے لئے کیا سوچنے لگا تھا مگر میں نے کبھی بھی اس کے لئے دل میں کوئی غلط جذبات نہیں رکھے۔ پھر بھی میں آپ سے ایکسکیوز کرتی ہوں۔ یہ سب میری غلطی تھی جس کی سزا آپ کو......"

ماریہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور بہت نرمی سے اس نے اپنا ہاتھ ثانیہ کے کندھے پر رکھ دیا۔

"نہیں مجھے تمہاری غلطی کی سزا نہیں ملی۔ تمہارا کہیں بھی کوئی قصور نہیں تھا اور میرے دل میں اب تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے تو

بس اپنی بدگمانیوں کی سزا ملی ہے۔ بہت دعوے تھے مجھے کومیل حیدر کو سمجھنے کے۔ بس اس خوش فہمی نے مجھے مار دیا۔"

"ماریہ! میں آپ دونوں کے درمیان اپنی وجہ سے پیدا ہونے والی یہ غلط فہمی دور کر سکتی ہوں۔ میں کومیل سے ملوں گی اور سب کچھ کلیئر کر دوں گی پھر آپ دونوں شادی کر سکتے ہیں، پھر تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے؟"

ثانیہ کو ایک دم پتا نہیں کیا سوجھا تھا۔ وہ کچھ بے چین ہو کر بولی تھی ماریہ ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر تھکی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

"اب یہ نہیں ہو سکتا ثانیہ! کومیل کی شادی کو سات سال ہو چکے ہیں اور وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بہت خوش ہے اور میں...... میں بھی شادی کر چکی ہوں۔ میرا بھی ایک بیٹا ہے۔"

"ماریہ! کیا آپ خوش نہیں ہیں۔" ثانیہ نے بے اختیار اس سے پوچھا تھا۔

"شاید خوش ہوتی اگر اس بار کومیل سے نہ ملی ہوتی۔ ثانیہ! میں آخری بار پاکستان آئی ہوں۔ اب مجھے دوبارہ پاکستان نہیں آنا۔ میں دوبارہ کبھی تمہارا اور کومیل حیدر کا سامنا کرنا نہیں چاہتی۔"

ثانیہ نے سر جھکا لیا تھا۔

ماریہ کی خود کلامی جاری تھی۔ "آٹھ سال پہلے منگنی توڑتے وقت میں نے بار بار اس سے پوچھا تھا۔ کومیل! مجھے بتاؤ۔ تمہارا ثانیہ سے رشتہ کیا ہے؟ کس حوالے سے تم اس پر اتنی توجہ دے رہے ہو؟ وہ ہر بار چپ رہتا تھا۔ ہر بار بھڑک اٹھتا تھا اور اس کی یہ خاموشی، یہ غصہ، یہ اضطراب میرے شک کو یقین میں بدلتا گیا تھا کہ وہ تم سے محبت کرنے لگا ہے۔ مگر وہ تب اس کا اعتراف نہیں کرتا تھا اور آٹھ سال کے بعد پچھلے ہفتے اس نے اعتراف کر لیا ہے۔ میں نے اس سے کہا تھا کومیل حیدر! اب تو بتا دو کہ ثانیہ سے کیا رشتہ تھا؟ اب تو کہہ دو۔ تم اس سے محبت کرتے تھے اور اس نے کہا تھا۔

"ہاں ماریہ! میں اس سے محبت کرتا تھا اور محبت کرتا ہوں لیکن صرف...... صرف ایک چھوٹی بہن کی حیثیت سے۔"

ثانیہ کو لگا تھا، کسی نے اسے پہاڑ کی چوٹی سے کسی کھائی میں دھکیل دیا ہو۔

"بہن کی حیثیت سے؟ مجھے اس کی بات سن کر یوں لگا تھا جیسے کسی نے میرے سینے میں ایک خنجر گاڑ دیا ہو۔ میں نے اس سے کہا تھا۔

"اگر تم اسے صرف بہن سمجھتے تھے تو تم نے یہ کہا کیوں نہیں۔ جب میں اتنی بار تم سے پوچھتی رہی تھی تو تم نے کہا کیوں نہیں کہ تم اسے بہن سمجھتے ہو اور پتا ہے وہ ایک بار پھر میری بات پر بھڑک گیا۔ اس نے کہا تھا۔ "میں کیوں کہتا کہ میں اسے بہن سمجھتا ہوں۔ میں کیوں کہتا؟ رشتے کوئی ٹیگ نہیں ہوتے جنہیں بندہ گلے میں ڈال کر پھرتا رہے۔ یہ بہن ہے۔ وہ بیوی ہے۔ یہ بیٹی ہے یا وہ ماں ہے۔ کیا کہے بغیر میں کسی کو بہن نہیں سمجھ سکتا۔ کیا کہنا ضروری ہے۔ تمہیں تو مجھے سمجھنا چاہیے تھا تم بھی دوسروں کی طرح مجھ سے وضاحتیں مانگنے لگی تھیں۔ ثانیہ کون ہے؟ اس سے کیا رشتہ ہے؟ تمہاری زبان پر بھی یہی سوال آنے لگے تھے۔ تم تو دعویٰ کرتی تھیں کہ تم مجھے سب سے زیادہ سمجھتی ہو پھر تم...... میں نے اگر کسی سے محبت کا اعتراف کیا تھا تو وہ بھی تم تھیں اور میں تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی تمہیں پہلی بار دیکھتے ہوئے میں نے تمہارے لیے محسوس کی تھی لیکن تم نے مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ میں، میں کومیل حیدر کسی اور سے محبت کر سکتا تھا؟ کیا میں ایسا آدمی تھا جو ہر دوسری لڑکی کو اپنی محبت کا یقین دلاتا

پھر۔ اتنا شک کیوں کیا تھا تم نے؟ اتنی بے اعتباری کیوں تھی تمہیں مجھ پر؟

وہ مجھ سے سوال کر رہا تھا ثانیہ! اور میرا دل چاہ رہا تھا میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روؤں اور کہوں یہ بے اعتباری عورت کی سرشت، اس کی فطرت میں ہے۔ مجھے اس کو گنوانا تھا۔ اس لئے میں نے اس پر شک کیا تھا۔ تم نے مجھ سے پوچھا ہے نا ثانیہ! کیا میں خوش نہیں ہوں پہلے خوش تھی۔ یہ سوچ کر کہ میں نے اس شخص کو چھوڑا ہے جو کسی اور کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے اور میں اس شخص کی بیوی ہوں جو صرف مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن اب، اب میں صبر کیسے کروں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ میں نے اپنی ایک معمولی حماقت کے ہاتھوں اس شخص کو گنوایا ہے جو آج بھی صرف مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مجھے اب ساری عمر جہانگیر کے چہرے میں کومیل کو تلاش کرنا ہے۔ میں خوش کیسے رہوں گی۔“

وہ بیگ سے ٹشو نکال کر گالوں پر بہتے آنسوؤں کو خشک کرنے لگی تھی اور ثانیہ خالی الذہنی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھتی جا رہی تھی۔

کومیل حیدر، روداب نواز، ماریہ جہانگیر، ثانیہ مراد علی نام جیسے اس کے ذہن میں رقص کرتے جا رہے تھے۔

اس نے آٹھ سال پہلے روداب نواز کو کومیل حیدر کے التفات کے لئے سر پہ ہاتھ رکھے روتے دیکھا تھا۔ اس نے آج ماریہ جہانگیر کو ایک بار پھر اسی شخص کے لئے بلکتے دیکھا تھا اور ایک وہ تھی جو مرد کو نہیں سمجھتی تھی اور اسے گمان ہوا تھا کہ صرف کومیل حیدر ایک مرد ہے جسے وہ اچھی طرح جان اور پہچان چکی ہے اور آج......

آج اس کا بھی دل چاہ رہا تھا، وہ روداب نواز کی طرح سر پہ ہاتھ رکھ کر رو دے، مرد سمجھ میں کہاں آتا ہے۔ مرد سمجھ میں ہی نہیں آتا، چاہے وہ روداب نواز جیسی ہوشیار اور زیرک لڑکی ہو یا ماریہ جہانگیر جیسی پرخلوص اور پاگل کوالیفائیڈ لڑکی یا پھر ثانیہ مراد علی جیسی سادہ اور سیدھی لڑکی ہر ایک کو گمان ہوتا ہے چند لمحے کا گمان اور پھر پوری زندگی ایک گمان بن کر رہ جاتی ہے۔

اور اب یہ ماریہ جہانگیر کس کس کو اس طرح رو رو کر اپنی داستان سناتی پھرے گی اور میں...... میں کس کس سے یہ کہوں گی کہ میں لوگوں کو اور خاص طور پر مرد کو بہت اچھی طرح سمجھ جاتی ہوں اور جب بھی یہ کہوں گی تو مجھے کومیل حیدر یاد آئے گا اور پھر مجھے سب کچھ یاد آ جائے گا۔ اپنی حماقت جس نے کتنی زندگیوں کو عذاب میں ڈال رکھا ہے یا اپنی سمجھداری جواب مجھے کبھی چین لینے نہیں دے گی۔ کتنا اچھا ہوتا میری زندگی میں کبھی کوئی کومیل حیدر نہ آیا ہوتا۔ یا میں کبھی مدد کے لئے اس کے پاس نہ جاتی۔ یا وہ بالکل ویسے ہی انکار کر دیتا جیسے وہ سب کو کرتا تھا۔ یا وہ...... وہ مجھے ایک بار بتا دیتا کہ وہ مجھے کیا سمجھتا ہے یا--- یا ماریہ جہانگیر! تم مجھ سے کبھی نہیں ملتیں۔“

وہ سوچ رہی تھی اور اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ ماریہ کی سسکیاں اب بھی اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھیں اور ثانیہ...... ثانیہ ایک بار پھر کومیل حیدر سے ملنا چاہتی تھی۔

* * *

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com